قید یاغستان

قیدِ یاغستان

از قلم

محمد اکرم

میونسپل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ لاہور چھاؤنی

طبع ثانی

قیمت:- ۱۲ر

دام میں صیاد کے آیا ہوں دانے کے لئے
مَیں سراپا بن گیا عبرت زمانے کے لئے

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی - طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

فہرست مضامین

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں بہ اہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر مسٹر محمد اکرم آنریری مجسٹریٹ لاہور نے شائع کی

دیباچہ

گذشتہ سال جب ڈلہوزی میں مسٹر محمد اکرم صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ اُن کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آچکا ہے جس کے باعث اُسے ایک افسانے کا درجہ حاصل ہے۔

اگر مَیں ان سے مِل نہ چکا ہوتا اور مجھے اس واقعے کو محض اس کتاب میں پڑھنے کا موقع ملتا تو مَیں یقیناً یہی سمجھتا کہ یہ محض ایک افسانہ ہے ایک ایسا افسانہ جسے لکھنے والے کے کمال نے صحیح واقعے کی صورت دیدی ہے۔ لیکن اُن سے ملنے اور خود اُن کی زبانی اس واقعے کا عجیب و غریب حال سُننے سے اور بالخصوص اس حالت کے دیکھنے سے جو واقعے کو سُناتے وقت اُن پر طاری ہو جاتی ہے یہ سوال دل میں اٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ کہ آیا یہ واقعہ اصلی ہے یا بناوٹی؟

یہ واقعہ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء میں پیش آیا۔

کس طرح اکرم صاحب بائیس ۲۲ سال کی عمر میں سرحدی فراریوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ کس طرح انہوں نے عذاب کے پینتالیس دن کاٹے جب ہر رات اُن کے لئے ہلاکت کی رات اور ہر دن قیامت کا دن معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے کیا کیا کچھ دیکھا وہ کس طرح بچ کے موت کے منہ سے نکلے اس کا بیان خود انہیں کے قلم سے پڑھیئے۔

مجھے تو پچھلے سال اس واقعہ کا مختصر حال سُنا کر جب انہوں نے چند بکھرے ہوئے ورق پڑھنے کو دیئے۔ اور کہا کہ اُن پر ادبی نقطۂ نظر سے ایک نگاہ ڈالوں تو مَیں اس دلچسپ کہانی میں اس قدر محو ہوا کہ اس مقصد کو قطعاً بھول گیا۔

زندگی کی اصلیت اور اصلیت کا زور میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ افسانوں سے ایک حد تک مَیں ہمیشہ گریز کرتا ہوں۔ ان کا پڑھنا میرے لئے ایک مطالعہ ہوتا ہے۔ تفریح کا کام نہیں ہوتا لیکن اصلیت سے گریز ناممکن ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ پچھلے سال جب مَیں دو دوستوں کو اس کتاب کا آخری حصہ پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ تو ہم تینوں اس کہانی میں اس طرح محو تھے گویا یہ ۲۶ سال پہلے کا واقعہ آج اور اب ہماری آنکھوں کے سامنے گذر رہا ہے۔

اکرم صاحب نے مجھ سے کہا کہ مَیں ادیب نہیں ہوں لیکن مَیں ان سے پوچھتا ہوں کہ ادیب کون ہوتے ہیں۔ اور ادب سوائے اس کے اور کیا شئے ہے کہ اس کے ذریعے سے زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آجائے؟

ایسے واقعات آج کل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ آج صبح ہی مَیں اخبار میں دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص مسٹر نوبت رائے کو ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو فراری لوگ اٹھا کر لے گئے۔ اور وہ بڑی مشکل سے دو مہینے کی صعوبتوں کے بعد وہاں سے بھاگ کر واپس آئے۔

واقعات تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن انہیں محسوس کرنے والا

جو دوسروں کو بھی محسوس کرا سکے ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ زیر نظر داستان کی یہی خوبی ہے کہ وہ صحیح ہے اور ایسے طور پر بیان کی گئی ہے کہ واقعے کی سب جزئیات بجنسہٖ ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی ہیں۔

انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ یہ موجودہ کہانی اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ غایت درجہ دلچسپ ہے عجیب و غریب ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اسے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس میں ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو بعض وقت غیر متوقع ہوتی ہیں۔ لیکن جو بالکل فطری ہیں۔

محاکات میں اکرم صاحب نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ ایک پہاڑ در پہاڑ علاقے کی تصویر انہوں نے خوب کھینچی ہے۔ اور جس طرح وہ جاتے اور بالخصوص واپس آتے بھاگتے وقت چٹانوں اور چوٹیوں اور غاروں میں سے ہوتے ہوئے آتے اس کا ایک طول طویل بیان جو اس وجہ سے بھی کہ وہ ذرا تھکا دینے والا ہے۔ پڑھنے والے کے دل میں اس تکلیف اور تھکن اور اداسی کا خوب نقشہ کھینچتا ہے جو مصنف پر طاری تھی۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان خوفناک پہاڑوں کے درمیان رات کے نو بجے عالم خاموشی میں جبکہ دنیا و مافیہا آرام و استراحت کی تیاریوں میں مشغول ہے۔ ہمارا نو آدمیوں کا گروہ ایک مسطح چٹان پر بیٹھا ہوا زمانہ کے انقلاب کا ایک عبرتناک منظر پیش کر رہا ہے۔ ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا اگرچہ

رجم بالغیب ہے لیکن چنداں مشکل نہیں۔ چھ حاکم اور تین محکوم۔ چھ آقا اور تین غلام۔ چھ پاسبان اور تین قیدی۔ چھ بھیڑیئے اور تین بکریاں۔ چھ ایسے ہیں جن کے دل آئندہ کی خوشگوار امیدوں کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں۔ اور چہروں پر مسرت برس رہی ہے۔ تین ایسے ہیں جن کے سامنے ایک غیر متعین مدت کے لئے مصیبتوں اور تکلیفوں کے دروازے کھلے نظر آ رہے ہیں۔ اور اپنے آقاؤں کی ضرب المثل بربریت کے تصور سے انکے چہرے کملا رہے ہیں۔ غرض قسمت کی نیرنگیوں کا ایک طوفان اپنے سینے میں لئے ہوئے یہ چھوٹا سا گروہ چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے۔ (صفحہ ۳۵)

سونے کی انگشتری کا واقعہ ایک اچھا خاصہ ڈرامہ ہے۔ دیکھیئے صفحہ ۵۸ منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ:۔

عورتیں ہیں تو ہماری گرفتاری پر مبارکباد دے رہی ہیں اور قہقہے لگا رہی ہیں۔ مرد ہیں تو خون کی پیاسی نگاہوں سے ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ دسیم گل کی تقریر سے اس قدر لاقیدی پائی جاتی ہے گویا وہ اپنی کسی بھیڑ بکری کا ذکر کر رہا ہے۔ ہم دو غریب الوطن بے یار و غمخوار اُن کے رحم اور قہر پر منحصر بیٹھے ہیں۔ ہماری آہیں اندر ہی اٹھتی ہیں۔ اور اندر ہی سرد ہو جاتی ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اپنا وطن یاد آیا۔ اپنے والدِ بزرگوار اور اپنی پیاری ماں کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ (صفحہ ۶۵)

زمانہ قید کی بعض کہانیوں سے ان لوگوں کی ذہنیت اور تمدن کا پتہ چلتا ہے:۔

ایک روز میں نے ذکر کیا۔ کہ میری عمر تیئیس سال کی ہے۔ تو ایک آدمی بڑا حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ کہ تم اپنی عمر کا کیسے حساب رکھتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ ہماری پیدائش کا روز لکھا ہوا ہوتا ہے۔ تو وہ تعجب سے پوچھنے لگا۔ کہ تم ہر روز لکھ لیتے ہو۔ کہ آج ایک روز گذر گیا۔ آج دو روز گذر گئے۔

ایک روز لالہ سندر لال سے میں نے ذکر کیا۔ کہ دھوبی کے پاس میرے کپڑے تھے وہ بھی ضائع گئے۔ تو ایک نے بڑی حیرانی کے ساتھ دریافت کیا۔ کہ بابو تمہارے ان کپڑوں کے علاوہ اور بھی پہننے کے کپڑے ہیں؟

تاریخوں اور دنوں کا حساب انہیں بالکل معلوم نہ تھا۔ کئی اشخاص کو دنوں کے نام تک نہ آتے تھے۔ جمعہ کا دن دریافت کرنے کی مجھے بڑی تکلیف ہوتی۔ کیونکہ میں خود شمار بھول جاتا۔ اور ان کو تو جمعہ سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔

ہمارے دو چھاتے بھی ان کو غنیمت میں ملے تھے۔ ایک تو خوتنے کے اور دوسرا مَغلم کے حصہ میں آیا تھا۔ مَغلم اکثر دھوپ میں تانے پڑا رہتا۔ صرف اس خیال سے کہ میرے پاس چھاتا ہے۔ اور بارش میں تو خاصکر خوتنے اور مَغلم چھاتہ لے کر باہر چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ اور بڑے فخر کی نگاہ سے دوسروں کی طرف دیکھتے رہتے۔ (صفحہ ۹۹)

ذیل کی عبارت میں اندازِ بیان کی نزاکت قابلِ دید ہے:-

وقت کی نزاکت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی لفظ زبان سے نہ
نکل سکتا تھا۔ میں نے التجاؤں میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے مدے کو دیکھا
اور پھر وہی نگاہ لالہ صاحب کی طرف پھرائی۔ نگاہوں کا جواب نگاہیں
دے رہی تھیں۔ (صفحہ ۱۴۴)

اس کے بعد جس طرح قیدیوں کو سزائیں اور عذاب دئے گئے۔
اسے پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ "آہ سات بار کے داغ
سے انسانی خون نے لوہے کو ٹھنڈا کر دیا لیکن انسانی غصّے کی آگ کو ٹھنڈا
نہ کر سکا"۔ ان دردانگیز واقعات کے ساتھ ہی مصنّف نے ایسی باتیں بھی
بیان کر دی ہیں۔ جو دل بہلاؤ اور تفریح کا سامان بن جاتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۶۵
پر لالہ سندر لال اور پرس رام کی مصنوعی جنگ ایک مزیدار کامیڈی ہے۔
یا یہ دیکھئے "لالہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ ان کی چیزیں چوری چوری
کھا لیا کرتے........" الیٰ آخرہ (صفحہ ۱۵۶)

اپنے تجربے کی بنا پر فلسفیانہ نکتے بھی بیان کر گئے ہیں:۔

"ایسی مشکلات انسان کو بکثرت پیش آتی ہیں جن کا حل اس کی اپنی
طاقت سے باہر ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے کلّی نا امیدی اس کے
دل میں پیدا نہیں ہوتی" الیٰ آخرہ (صفحہ ۲۰۰)

مشاہدے کی طاقت ملاحظہ ہو:۔

ساری ساری رات جاگ کر کتوں کا مجھے اچھا تجربہ ہو گیا تھا۔ وہ
جو بھونکنے پر آتے تو گھنٹہ گھنٹہ بھونکتے رہتے۔ اور جو چُپ ہو جاتے تو

آدھ آدھ گھنٹہ پتہ ہی نہ تھا کہ یہاں کوئی کتا بھی ہے۔ چنانچہ میں نے بھاگتے
وقت اس امر کا لحاظ رکھ لیا تھا۔ کہ کتے بھونک کر کب چپ ہوئے۔"
(صفحہ ۲۷۷)

بھوک کی شدت کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:۔
"آخر میں کنارے کے ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔ تھیلے سے زاد راہ یعنی
گوبر نکالا تھوڑا سا لے کر پانی میں بھگویا تو غیرہ وغیرہ
اس کے ساتھ دھوپ کی یہ حالت تھی کہ:۔
"سارا دن دھوپ کی تپش میں چلنے کے بعد اس برفاب کی خنکی اور
لطافت بھی ایک عجب کشش اور جذب اپنے اندر رکھتی تھی۔ اور ایسے
لطیف اور ٹھنڈے پانی میں غرق ہو کر جان دینا بھی اک عیش معلوم ہوتا
تھا۔" (صفحہ ۳۲۷)
غربت کا زمانہ ختم ہونے پر لکھتے ہیں:۔
"اس وقت سورج غروب ہو کر میرے مصیبت کے آخری دن کو ختم
کرنے والا تھا۔" (صفحہ ۳۲۹)
"گاؤں کے نیچے دریائے ترنم لہریں لیتا بہ رہا تھا۔ ارد گرد سبز سبز
کناروں اور چھوٹی چھوٹی فصلوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مخملی فرش
پر سیماب لوٹ رہا ہے۔" (صفحہ ۳۳۱)
زبان سادہ اور طرز بیان موزوں و موثر ہے۔ اشعار کو بھی خوب چسپاں
کیا ہے۔

کردار نگاری میں اکرم صاحب کی قابلیت لائقِ تحسین ہے۔
شروع میں "پانچ آدم خور انسانوں" کا بیان ہے۔ مدآ میر۔ خوتنے۔ ملتے متعلم اور گل قدم (صفحہ ۲۶) ہر ایک کا جدا جدا نقشہ ہے۔
یہ اپنی رائیفلوں کے زور پر ہمارے مصنف اور ان کے ہمراہی کو لئے جا رہے تھے۔ یہاں خوب لکھا ہے کہ

اللہ اکبر میں اپنا چہرہ تو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کا نقشہ کھینچوں لالہ صاحب کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چہرہ اترا ہوا تھا۔ سانس بدن میں نہیں سماتا تھا۔ لب باوجود بار بار پانی پینے کے چمڑے کی طرح خشک ہو رہے تھے۔ اور ٹھنڈی سانسوں کا تار بندھا ہوا تھا۔ آہ میں بیچارے کوچبان کو بھول گیا۔ خدا جانے اس کے دل پر کیا گذرتی ہو گی۔ وہ قوم کا خٹک پٹھان تھا۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ اضطراب کا نہیں نکلا۔ (صفحہ ۳۱)

ملتے کا کیریکٹر زبردست ہے۔ انگشتری والے واقعے کے لئے وہ نگینے کا کام دیتا ہے۔ (صفحہ ۵۸)
اور نیک نامے کی سیرت میں ہمیں ایک نیک دل عورت کا وہ دل تڑپتا محسوس ہوتا ہے جو نوعِ انسان کی ہزاروں بُرائیوں کے دوزخ میں گویا زندگی کو ایک جنت بنا سکتا ہے۔
ملتے اور مدآ میر کی "عکسی" تصویریں خود بنانے میں اکرم صاحب نے کمال کر دیا ہے۔ دیکھیئے اور داد دیجئے۔

کتاب کے اخیر میں جو تصویر کا دوسرا رُخ دکھا کر ان سرحدی وحشیوں کی فطرت کا تجزیہ کیا ہے۔ گویا ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے ان پر ایک نظر ڈالی ہے وہ بھی نفسیاتی خیال سے کردار نگاری کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔

"سرحدِ آزاد کا پٹھان اپنے وطن کی آزادی کو جان و مال سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے اس کے سخت ترین دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔" (صفحہ ۳۸۶)

"انگریزوں کو وہ باعزت دشمن سمجھتا ہے"۔

"آزاد پٹھان اپنے علاقہ میں قوتِ لایموت حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ اور فطرتاً بہادر ہونے کی وجہ سے وہ کسی ایسی پُر خطر مہم کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں اس کی بہادری کی آزمائش بھی ہو اور اسے خزانہ بھی مل جائے ......" اس طرح وہ ڈاکے کو اک کارِ شنیع سمجھ کر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف عمل پیرا نہیں ہوتا بلکہ اسے کارِ ثواب جان کر کرتا ہے اس لئے عام ڈاکوؤں اور چوروں کی ذہنیت سے اس کی قلبی کیفیت بالکل مختلف واقع ہوئی ہے۔ (صفحہ ۳۹۲)

اخیر میں لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں کہ :-

اپنی طرف سے تو مَیں نے اپنے قاتلوں سے بھی پورا انصاف کیا ہے۔

واقعی پڑھنے والے کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجودیکہ سرورق پر مصنف کو ایک میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ بیان کیا گیا ہے۔ وہ غلط بیانی اور

خوشامد[1] کے ہر دلعزیز گناہوں کا کہیں مرتکب نہیں ہوا!

"قیدِ یاغستان" ایک نہایت دلچسپ و دل آویز آپ بیتی ہے۔ اور مصنف نے باوجودیکہ وہ ایک باقاعدہ ادیب نہیں ہیں اس تصنیف میں ادبی قابلیت کے حیرت انگیز نمونے پیش کئے ہیں۔ جسے زندگی کے شیدائی اور اُردو ادب کے شائقین حقیقی قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

المنتظر

لاہور ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء

بشیر احمد

(بی۔ اے۔ آکسن۔ بیرسٹر ایٹ لاء)

"ایڈیٹر ہمایوں"

[1] اس فقرے کے شروع میں "باوجودیکہ" کا زور ملاحظہ ہو۔
مصنف

عرضِ حال

پبلک کے سامنے مَیں کوئی ادبی تحفہ نہیں پیش کر رہا بلکہ ایسے حقیقی واقعات کا مرقع سامنے رکھ رہا ہوں۔ جنہوں نے عین عنفوانِ شباب میں زندگی اور اس کی حقیقت کے متعلق میرے نظریہ میں یکلخت ایک تبدیلی پیدا کر دی۔ اور مابعد کی زندگی میں غیر شعوری طور پر وہ میرے تمام افعال و اعمال پر اثر انداز رہے۔

پورے ستائیس سال کا عرصہ ہوا جب یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ لیکن فطرت نے اس کی تمام تفصیلات میرے دل و دماغ کے کسی محفوظ پردے پر کچھ اس طرح نقش کر دیں کہ امتدادِ زمانہ ان کو مدہم تک نہیں کر سکا۔

چہ ساز بود کہ بنواخت مطربِ عشق

کہ رفت عمر و ہنوز م دماغ پر ز صداست

ربع صدی کے بعد بھی جب کسی بیرونی واقعہ کی مماثلت کے سبب اس سانحہ کی کوئی تفصیل "تخیل کی آنکھوں کے سامنے تصور کے پردہ پر بجلی تیزی کے ساتھ نمودار ہو جاتی ہے۔ تو بسا اوقات واقعہ کی فلم اس تفصیل کے مقام سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور جسمانی آنکھیں کھلی ہوتے ہوئے بھی دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔ اور تخیل کی آنکھوں سے اس فلم کے تماشا میں محو دنیا و مافیہا سے بے خبر بُت بنا بیٹھا رہتا ہوں۔ اس انہماک سے چونک کر بیدار ہونے کے بعد طبیعت پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جس کے تاثرات کو احاطۂ تحریر میں لانے کے لئے انسانی زبان نے کوئی الفاظ ایجاد نہیں کئے۔

مَیں نے اپنے واپسی کے سفر کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن سچ پوچھئے تو میں پھر بھی مزید تفصیل کے لئے تشنۂ بیان ہی رہا میرا یہ "سفرِ زندگی کے سفر"

سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور جس طرح میں نے بے یار و مددگار کامیابی کی خوشی یا ناکامی کی مایوسی سے بے نیاز رہ کر جانکاہ مصیبتوں اور ہمت شکن صعوبتوں کے ہجوم میں ایک بیان میں نہ آنے والی لذت کے ساتھ اپنی ناچیز جدوجہد کو ایک غائب از نظر مقصد کے حصول کے لئے آخر دم تک جاری رکھا۔ اس کی یاد میرے زندگی کے سفر میں "خضرِ راہ" بن جاتی ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ میرے قابلِ تعظیم ناظرین کے تحت الشعور پر بھی میرے اس سفر کے حالات کا مطالعہ نہایت پسندیدہ طور پر اثرانداز ہو کر وہ جذبات اور وہ لذت عمل پیدا کرے گا۔ جو ایسے قصوں کے مطالعہ کا اصلی مقصد ہونا چاہیئے۔

اس لحاظ سے میری یہ خواہش بے جا نہیں کہ کاش میں اپنے ناظرین کو تھوڑی دیر اور اپنا ہم سفر رکھتا۔ اور اپنے جذبات کا شریکِ حال رکھتے ہوئے ان کو مزید تفصیلات سے آگاہ کرتا۔ تاکہ ان کے دل پر یہ اثر اور بھی گہرا ہو جاتا۔

مَیں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ یہ ایک ادبی افسانہ نہیں ہے۔ اگر مَیں کسی کامل ادیب سے اصلاح لیتا تو شاید یہ کمی بھی پوری ہو جاتی لیکن ایک اندرونی آواز نے مجھے اس طریق کار سے یہ کہہ کر باز رکھا کہ ادبی اصلاح سے نقشے کے قدرتی خدوخال میں فرق آجانے کا اندیشہ ہے۔ اور تمہاری بے محاورہ اور سادہ زبان میں جو حقیقت اور تاثیر موجود ہے اس کے ادبی قلم کی نوک سے مجروح ہو جانیکا اندیشہ ہے پس میں نے حضرت مرزا غالب کے ارشاد کے بموجب ؏

"اور پھر وہ بھی زبانی میری"

اپنی کہانی کو اپنی ہی زبان میں بیان کرنا احسن سمجھا۔

اسی لحاظ سے مدّے اور مدّا آمیر کی شکل و شباہت کے تصور اور واقعہ کے لحاظ سے انکے چہروں پر جوش و جذبات کے اظہار کے لئے صفحہ ۱۶۱ پر جو دو تصاویر دی گئی ہیں انکو بھی میں نے کسی مصوّر کی موقلم کا رہون منت نہیں ہونے دیا۔ میں ادیب نہیں ہوں۔ ویسے ہی مصوّر بھی نہیں۔ لیکن جو حقیقی واقعہ کی اصلیت ان تصاویر کے دیکھنے سے مجھ پر ظاہر ہوتی ہے وہ ایک کامل اور مکمل تصویر سے شاید پیدا نہ ہوتی۔

میری آرزو تھی کہ ٹوچی اور دو قوم کے بعض متعلقہ عکسی منظر اس کتاب میں شامل کرتا۔ میں نے خود سفر کر کے ان کے حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا ہوا تھا لیکن قدرت کو ایسا منظور نہ ہوا اسی اثنا میں سرحد پر شورش شروع ہو گئی۔ اور میرا یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گذشتہ سال میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر "ہمایوں" ایسے فاضل اور مشہور زمانہ ادیب کی نظر سے "قید یاغستان" (پہلی ایڈیشن) گذری۔ یوں تو اکثر احباب کا تقاضا اس کے دوبارہ طبع کرانے کا لگا ہی رہتا تھا۔ لیکن صاحب موصوف کی ہمت افزائی سے میں نے کمر ہمت باندھی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میاں صاحب ایسے کامل ادیب کا میری نسبت کوئی توصیفی جملہ استعمال کرنا میرے لئے نہایت ہی قابلِ فخر اور حوصلہ افزا ہے لیکن ان کی مردم شناس نگاہ نے جو تمغہ تملق اور چاپلوسی کے گناہ سے دور رہنے کا مجھے عطا فرمایا ہے میں اسکو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو نبھانے کے لئے مجھے اپنی زندگی میں بہت ایثار کرنے پڑے۔ اگر شکریہ ادا کرنا چاپلوسی نہیں تو میاں صاحب موصوف کے سامنے اس تمغے کی عنائت کے لئے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اکرم

باب اوّل

ٹوچی

جو سر بفلک کوہستانی سلسلہ ہمارے ہندوستان کو افغانستان کے برفانی ملک سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے دامن میں کئی زرخیز وادیاں قدرت کے دلکش مناظر کو گود میں لئے دریاؤں اور کوہستانی نالوں سے سیراب ہو رہی ہیں۔ ہماری داستان ۱۹۱۰ء کے آغاز میں انہی چند ایک وادیوں اور ان کے خونخوار باشندوں سے متعلق ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی رنج والم کی کہانی اور غم ومصیبت کی داستان چھیڑنے سے پہلے ناظرین کو ان کے جغرافی اور تمدنی حالات سے تھوڑا سا تعارف کرا لیا جاوے۔ تاکہ واقعات کے جانچنے اور مواقعات کا نقشہ کھینچنے میں ان کی قوتِ متخیلہ کو مدد ملے۔

بنّوں پنجاب کے شمال مغرب میں صوبہ سرحدی کے چھ اضلاع میں

سے ایک ضلع ہے۔ یہ ایک بڑی فراخ اور سبز و شاداب وادی میں واقع ہے۔ اور جنگی نقطۂ نگاہ سے ایک بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ فراخ وادی ایسے بلند پہاڑی سلسلوں کے درمیان گھری ہوئی ہے جن میں سرحد کی نہایت ہی بہادر اور خونخوار قومیں آباد ہیں۔ ان پہاڑوں کے درمیان بعض نہایت زرخیز اور قدرتی خوبصورت مناظر سے لبریز چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام وادئ لوچی ہے۔ ہمارا آغاز داستان اسی وادی کے مرکز سے شروع ہوتا ہے۔

وادیئے بنّوں کا بیرونی دنیا سے تعلق صرف دو ایک پہاڑی سڑکوں کے ذریعہ ہے۔ یا افغانستان کی طرف چند دشوار گذار درے آمد و رفت کا واحد ذریعہ ہیں۔

بنوں پہنچنے کے لئے کوہاٹ تک ریل جاتی ہے۔ اس سے آگے استی میل ٹمٹم اور تانگے کا سفر ہے۔ راستہ عموماً دشوار گذار پہاڑوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اصلی بنوں ایک پرانا شہر ہے۔ جو اب ایک معمولی گاؤں کی حیثیت میں آباد ہے۔ اس سے دو میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر ایڈورڈ آباد کے نام سے دریا کے کنارے آباد کیا گیا ہے جسکی روزافزوں رونق۔ بازاروں اور کوچوں کی باقاعدگی۔ عمارات کی خوبصورتی اور زخاصکر تجارتی کاروبار نے پرانے شہر کی گرم بازاری کو سرد کر دیا ہے۔ اور اس کی شہرت اور نام خود چھین لیا ہے۔

یہ خوبصورت چھوٹا سا شہر عجب پُر فضا وادی میں واقع ہوا ہے چاروں

طرف بلند پہاڑوں کے نظارے اس کی قدرتی آن و بان کو دوبالا کر رہے ہیں۔ آب و ہوا نہایت مفرح اور دلکشا اور گرد و نواح نہایت سبز و شاداب ہے۔ سبزہ زار کی قطع و برید۔ روشوں کی ساخت اور نہروں کی روانی میں زمانے کے مصنوعی ہاتھوں نے بہت کم حصہ لیا ہے۔ قدرتی نظارے چاروں طرف بکثرت نظر آتے ہیں۔ اور قدرت کی صناعی میں دلچسپی لینے والوں کے دلوں کو لبھاتے ہیں۔ باوجود اس رونق و شادابی کے اردگرد کی وحشی اقوام نے ؎ فکر معقول بفرما گل بے خار کجاست
کا مصداق بنا رکھا ہے۔ ان جنگلی درندوں نے اس خطۂ سرسبز کو اپنے لئے خوان الوان نعمت سمجھ رکھا ہے۔ جب موقع پایا۔ پانچ دس مل کر حملہ آور ہوئے۔ لوٹ گھسوٹ کشت و خون کر کے جو کچھ ہاتھ لگا۔ لے کر لامتناہی سلسلہ کوہ میں غائب ہو گئے۔ یہاں کے باشندوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور اس باغ بہشت میں انہیں اسیر بے زنجیر بنایا ہوا ہے۔

ہماری رحمدل گورنمنٹ انگلشیہ رعایا کی اس مصیبت کو بہت محسوس کرتی ہے۔ اور اس کے انسداد کے لئے لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ لیکن قدرت کا ہاتھ اس کام کو بہت مشکل بنائے ہوئے ہے۔

بنوں کے مغربی جانب ایک اور وادی دریائے ٹوچی کے کنارہ کنارہ ۶۲ میل چلی گئی ہے۔ جو وادی ٹوچی کے نام سے موسوم ہے۔ اسکا زیریں حصہ قوم دوڑ سے آباد ہے۔ درمیانی وزیریوں سے اور بالائی محسود قوم کا جائے پناہ

ہے۔ بنوں سے نو میل تک راستہ ناہموار پہاڑی زمین سے ہو کر گذرتا ہے اس سے آگے ان خوفناک پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو بے رحم اور خونخوار قزاقوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ مسافروں کے آرام اور راستہ کی حفاظت کے لئے ہماری گورنمنٹ نے چھ چھ سات سات میل کے فاصلہ پر چوکیئں اور قلعجات بنائے ہوئے ہیں۔ جن کے نام اور فاصلے لکھ دینا مناسب ہے۔

نام	بنّوں سے فاصلہ	مختصر کیفیت
اسلام چوکی	۷ میل	بنّوں سے جاتے ہوئے سڑک کے بائیں جانب میدان میں واقع ہے۔ خاردار تاروں کے جال کو عبور کر کے ایک چھوٹا سا زینہ دروازہ تک پہنچا دیتا ہے۔
میرزا علی	۱۰ میل	پہاڑوں میں داخل ہوتے ہی سڑک نیچے اُتر کر دریائے ٹوچی کے کنارہ پر ہو لیتی ہے۔ ایک میل کا راستہ طے کر کے دائیں طرف تھوڑی سی بلندی پر یہ چھوٹا سا پوسٹ واقع ہے۔ سیدگی سے چند جوان اپنی باری پر مقرر کئے

نام	بنوں سے فاصلہ	مختصر کیفیت
		جاتے ہیں۔ اس پوسٹ سے قلعہ سیدگی تک سڑک کے اکثر حصہ پر نظر کام کرتی ہے۔
سیدگی پوسٹ	۱۴ میل	سڑک کے دائیں جانب ایک بلند پہاڑی کے سر پر واقع ہے۔ اس کو جنگی نقطۂ خیال سے کارآمد بنانے کے لئے بہت تفکر اور تدبر سے کام لیا گیا ہے۔ چاروں طرف خاردار تاروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ دریائے ٹوچی چند سو فٹ کی گہرائی پر بہتا ہوا اپنی سریلی سُروں سے قلعہ میں سونے والوں کے لئے رات کو لوری کا کام دیتا ہے۔
شنکئی	۱۷ میل	سیدگی پوسٹ سے تھوڑے فاصلے پر سڑک ایک نہایت شائع پہاڑ کو کاٹ کر گذرتی ہے۔ جو اس کے دونوں جوانب عمودی حالت میں نہایت خوفناک طور پر کھڑا ہے۔ اس جگہ کو

نام	بنوں سے فاصلہ	مختصر کیفیت
		تنگے کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ اور کئی دردناک واقعات اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ سڑک چکر کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنا شروع ہوتی ہے۔ اور پُورے ایک میل کی چڑھائی کے بعد شنکئی پوسٹ کے پاس تنگ سے میدان میں جا کھلتی ہے۔ پوسٹ بہت بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ اور سڑک پر سے دیکھنے میں بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ ایک کچّی سی پگڈنڈی پیچ و تاب کھاتی ہوئی نصف گھنٹہ سے زیادہ کی مسافت کے بعد پوسٹ تک پہنچا دیتی ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہاں کی باد تند ہے جو قلعہ کی دیواروں اور چھت سے ٹکرا کر ایک لگاتار شور سے کانوں کی بے طرح تواضع کرتی رہتی ہے۔
کھجوری	۲۰ میل	یہ قلعہ بھی سیدگی کی طرح بڑے پیمانہ

نام	بنّوں سے فاصلہ	مختصر کیفیت
		پر بنایا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے سامنے کی بلند پہاڑیوں کی زد میں ہے۔ اور کئی دفعہ قزاقوں نے اس پر حملہ کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ دریائے ٹوچی سے سڑک یہاں پر علیحدہ ہوتی ہے۔ اور میرانشاہ تک علیحدہ چلی گئی ہے۔ یہ قلعہ ایک نالہ کے نام پر مشہور ہے۔ جو اس موقع پر دریائے ٹوچی سے ملتا ہے۔
عیدک	۲۷ میل	میراں شاہ سے دوسرے درجہ پر یہ قلعہ ہے۔ نہایت زرخیز میدان میں واقع ہے۔ دو حصص پر منقسم ہے سول اور ملٹری پولیٹیکل نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام اسی میں ہے۔
ایضاً	۳۳ میل	چھوٹا سا پوسٹ شنکئی کی طرح بلند پہاڑی پر جو کہ تنہا کھڑی ہے واقع ہے۔
میراں شاہ	۴۰ میل	وادیٔ ٹوچی کا صدر مقام ہے۔ یہ قلعہ پہلے ایک ناموزوں جگہ پر واقع تھا

نام	بنّوں سے فاصلہ	مختصر کیفیت
دتہ خیل	۶۲ میل	جہاں سے منہدم کر کے اب جدید طرز پر نہایت مضبوط و مستحکم اور مناسب جگہ پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کا صدر مقام ہونا ہی اس کی تعریف خود کر رہا ہے۔ ایک بڑے وسیع میدان میں واقع ہے آب و ہوا نسبتاً بنّوں سے بہت سرد ہے۔ میں نے نہیں دیکھا۔

اگرچہ قلعوں اور چوکیوں کے لئے بہتر سے بہتر مواقع اختیار کئے گئے ہیں۔ لیکن پہاڑوں میں کہاں تک روک تھام ہو سکتی ہے۔ چار پانچ سال پہلے بیان کیا جاتا ہے۔ ٹوچی میں بالکل امن وامان تھا۔ لوگ آرام سے بسر کرتے اور بے خطر شبہائے تاریں سفر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان بدمعاشوں نے جو اپنی پاداش کردار اور سرکار انگلشیہ کے خوف انصاف سے اِدھر اُدھر مارے پھرتے تھے۔ متفق ہو کر زور پکڑا۔ اور غارت گری کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے پہل ان کا غصہ صرف کشت وخون اور غارت مال تک ہی محدود تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کی بدقسمتی سے ان کو ایک سود مند تجارت کی چاٹ لگ گئی۔ وہ بجائے قتل کرنے کے زندہ آدمیوں کو پکڑ لے جاتے۔ اور گراں بہا فدیہ پر ان کو وارثوں کے ہاتھ بیچ دیتے۔ اس تجارت نے

یہاں تک فروغ پکڑا۔ کہ اب یہ ان کا مستقل پیشہ بن گیا ہے۔ حصولِ فدیہ میں کامیابی کے لئے وہ اپنے بے گناہ قیدیوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے۔ اور بحالتِ مایوسی نہایت بے رحمی سے قتل کر ڈالتے ہیں۔

افغانستان یا غیر علاقہ کے جو لوگ ڈاکہ زنی کرتے ہیں۔ تین گروہوں پر منقسم ہیں۔ ایک تو افغانستان کی سرحدی رعیت کے وہ لوگ جنہیں ناداری کی وجہ سے اپنا پیٹ پالنا مشکل ہے۔ یہ لوگ سرکاری علاقہ میں مار دھاڑ کرنا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ اور مالِ غنیمت کو "ہم خرما" کا مصداق۔ یہ لوگ چھ چھ سات سات کے گروہوں میں چپکے سے نکل جاتے ہیں۔ اور لوٹ مار کر کے واپس آجاتے ہیں۔ اور پھر اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں۔

ان سے بڑھ کر سرحدی غیر علاقہ کے قزاق ہیں۔ ان کا بھی باقاعدہ پیشہ قزاقی ہے۔ ان کا مدعا غنیمت کے علاوہ پولیٹکل نظریہ بھی ہے۔ وہ ڈاکہ زنی کو پولیٹیکل مراعات کے حصول کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ اور اپنی بہادری کے اظہار کا موقع بھی تصور کرتے ہیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر فراریوں کا وہ فرقہ ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگیں قزاقی۔ رہزنی اور کشت و خون کے لئے وقف کر دی ہوئی ہیں۔ ان کا پیشہ اور مدعا صرف قزاقی ہے۔ خواہ وہ مال دار ہوں یا غریب بچے ہوں یا بوڑھے۔ چونکہ ہمارا واسطہ صرف اسی گروہ سے پڑنے والا ہے۔

اس لیئے ان کا حال ذرا تشریح سے لکھنا ضروری ہے۔

یہ لوگ اپنے آپ کو فَراری کہتے اور کہلاتے ہیں۔ اور اس نام کو مایۂ ناز سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ وارداتیں کر کے خوفِ انصاف سے بھاگے ہوئے ہیں۔ یا جیل اور حوالات کو توڑ کر مفرور ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ اس لفظ کو مہاجر کا مترادف سمجھتے ہیں۔ یعنی کافر کی سلطنت سے ہجرت کر کے اسلامی سلطنت میں آباد ہیں۔ اور ان کا پاکیزہ مدعا یہ ہے۔ کہ کافر سلطنت کی رعیت کو کبھی چین نہ لینے دیں ؎

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں افغانستان میں ہجرت کر گئے ہوئے ہیں۔ اور وہاں پر خاص خاص رعایات کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ کسی قسم کی مزدوری محنت ان کے واسطے ننگ و عار ہے۔ اور قتل و غارت سرمایۂ فخر۔ عموماً چھپڑوں کے جھونپڑوں میں آباد ہوتے ہیں۔ اور اپنے گاؤں علیحدہ بساتے ہیں۔ ایک ایک گاؤں میں بھی اپنے آپ کو قومیت کے لحاظ سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ اور ہر ایک قوم اپنے اپنے دھاڑوی علیحدہ گروہوں میں بھیجتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ منظّم طریقوں۔ جاسوسوں اور دلالوں کے ذریعہ اس کاروبار کو نبھاتے ہیں۔ اس لیئے سب سے زیادہ خطرناک یہی لوگ ہیں۔ ان لوگوں کی قزاقی کے مدعا یہ ہوتے ہیں۔ (۱) مالِ غنیمت۔ (۲) سرکار انگلشیہ سے دشمنی۔ (۳) اپنے ذاتی دشمنوں اور اپنی قوم کے دشمنوں سے بدلا۔ اور (۴) ڈاکہ زنی کو جہاد سمجھ کر ثوابِ آخرت کی تمنا۔

جس زمانے سے ہمارا دردناک قصہ تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال کی تھی۔ بسلسلہ ملازمت ملٹری ورکس میں پشاور سے تبدیل ہوکر کوہاٹ درہ کے راستہ ۷ فروری ۱۹۱۰ء بنوں پہنچا۔ جہاں وادئ ٹوچی میں بنوں سے عیدک تک ۲۷ میل سیکشن کا چارج لینے کے لئے مجھے حکم ملا۔ اکثر یاروا غیار نے وہاں کے خطرات کو مبالغہ آمیز افسانوں میں بیان کیا۔ اور مجھے ہیبت زدہ بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن سرحدی ملازمت میں رہ کر اور ایک دو فیلڈ فورس کے سرد و گرم دیکھنے کے بعد میں اس خطرہ کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ تاہم میں نے گیریسن انجینئر صاحب سے ایک معقول درخواست کی۔ کہ اس علاقہ میں میں ایک نیا آدمی ہوں۔ اور آتے ہی میرا تعین ایک خطرناک جگہ پر خلافِ مصلحت ہے۔ انہوں نے نہایت تسلی آمیز لہجہ میں فرمایا۔ کہ ٹوچی بے شک خالی از خطرہ نہیں۔ لیکن یہ سب وبال غیر مسلموں کے لئے ہے اور مسلمانوں کو وہاں کوئی خوف نہیں۔ یہ جواب سن کر میں خاموش ہو رہا۔

اس موسم میں ٹوچی کا یہ حال تھا۔ کہ افغانستان اور علاقہ سرحدی کی مختلف قومیں وہاں کی برفانی سردی سے بچنے کے لئے ٹوچی کے گرم اور غیر آباد پہاڑوں میں اُتری ہوئی تھیں۔ ان کی رسوم بود و باش سادگی تمدن اور ذرائع معاش کا تذکرہ خالی از لطف نہ ہوتا۔ لیکن خوفِ طوالت سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔ جب تک یہ اقوام ان پہاڑوں کے نشیب و فراز پر چھائی رہتی ہیں۔ قزاقوں کو لوٹ مار کا موقع کم ملتا ہے۔ اگرچہ اکیلے دوکیلے کیلئے

خود یہ قومیں بھی ملک الموت سے کم نہیں۔ لیکن شروع اپریل میں جب تمازتِ آفتاب سے پتھریلے پہاڑ مسِ تفتیدہ کی طرح تپنے شروع ہو جاتے ہیں۔ تو یہ قومیں بھی موسمی پرندوں کی طرح آب و ہوا کا اعتدال قائم رکھنے کے لئے بلندیوں کی طرف چڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہزاروں کے قافلے بنّوں اور اس کے گرد و نواح سے مِل مِل کر اکٹھے لوچی سے گذرتے ہیں۔ ان قدرتی زندگی بسر کرنے والوں کو اس طرح عالمِ خاموشی میں سفر کرتے دیکھنا۔ ایک اجنبی کے لئے کیسا پُرلطف نظارہ ہے۔ خاص کر جب وہ سرِ شام لہراتے ہوئے پانی کے کنارے کسی اتّفاقی سبزہ زار پر اُتر پڑتے ہیں۔ پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑوں سے ان کے سُرخ و سپید چہرے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں میں کیسے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مردوں کی تحکمانہ پُر وحشت نگاہیں۔ عورتوں کا دلربا جوشِ شباب۔ نوخیز لڑکیوں کا زہد شکن حسن۔ ننھے ننھے بچوں کا شور و غوغا مِل جُل کر عجب سماں پیدا کرتے ہیں۔ راستہ کے گرد و غبار سے سب اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔ جیسے کلنگوں کی ڈاریں ساری رات کے تھکا دینے والے پرواز کے بعد پانی کے کنارے اتر پڑیں۔ اور اپنی خوبصورت گردنوں کو بازؤں کے نیچے دے کر آرام کرنے سے پہلے اپنے جسموں کو صاف کریں۔ اور پھر چُپ چاپ سو جائیں۔

اس طرح اپریل کے اخیر تک یہ خانہ بدوش قومیں ان پہاڑوں کو خالی کر جاتی ہیں۔ اور ان کی جگہ لٹیرے ضلع بدر شکار کی تلاش میں

اِدھر اُدھر پھرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ٹوچی سے جانب شمال ایک اور وادی ہے۔ جسے وادی کیتی کہتے ہیں۔ اس میں وزیروں کے مختلف خیل آباد ہیں۔ اپریل کے اخیر میں ان کی فصلیں پک جاتی ہیں۔ اور مئی کے نصف کے قریب فصلیں کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس موسم کی سخت تمازت کی تاب نہ لا کر اور نیز کٹائی فصل سے فراغت پاتے ہی گھر بار چھوڑ ٹھنڈے پہاڑوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ اس وقت یہ قزاق بھیڑیوں کی طرح آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور سارا علاقہ ان کی سفاکانہ حرکات اور قزاقانہ دست بردوں کے پورا کرنے کے لئے خالی رہ جاتا ہے۔

انگریز افسروں کے لئے جب وہ ٹوچی میں دورہ کرتے ہیں۔ خطرہ کے مقاموں اور اونچی گھاٹیوں پر پکٹ بٹھائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی بہ نسبت دیگر خلقِ خدا کے بہت محفوظ ہوتی ہے۔ جو صرف اللہ کا سہارا لے کر جان ہتھیلی پر رکھ کر چل پڑتے ہیں۔

ٹوچی میں میرا ہیڈ کوارٹر بنوں سے چودہ میل فاصلہ پر قلعہ سیدگی میں ہے۔ جو خاردار تاروں کے جال میں گھرا ہوا ایک چھوٹی سی پہاڑی کے سر پر واقع ہے۔ اس پہاڑی کے عین دامن میں دریائے ٹوچی کا صاف شفاف پانی پتھریلی سطح پر لوٹتا ہوا اپنی میٹھی سروں کی گونج سے فضاء میں ایک عجیب ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ نالا کا پاٹ یہاں پر نصف میل کے قریب ہے۔ اور ساحل مقابل پر سنگِ خارا کی ایک بلند دیوار حدِ نظر تک چلی گئی ہے۔ اس قلعہ کے شمال مغرب میں ایک سر بفلک سلسلۂ کوہ دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔

جس کی چوٹی پر سے وادیٔ بنوں اور اس کے گردونواح کا عجب پُر لطف نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ قلعہ اور اس سلسلہ کا درمیانی فاصلہ ایک میل تک چھوٹی چھوٹی مدّور گھاٹیوں اور پتھر کی بلند عمودی دیواروں کی شان سے قدرت کی سحر کاریوں کا مطالعہ کرنے کے لئے عالمِ خاموشی میں ایک نہایت دلچسپ صفحہ پیش کرتا ہے۔

اس خشک ویرانہ میں میلوں تک کسی باقاعدہ آبادی کا نام و نشان نہیں۔ سیدگی قلعہ سے باہر نصف میل کے فاصلہ تک کسی طرف جانا بھی جان کے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ضروریاتِ زندگی اور اشیائے خوردنی بنوں سے مہیا کی جاتی ہیں۔ سوسائٹی کا کوئی امکان نہیں۔ گویا طوقِ ملازمت پہننے والوں کے لیے یہاں کا قیام قیدِ محض کا حکم رکھتا ہے۔

۲۴ر اپریل ۱۹۱۰ء مجھے گیریسن انجینیر صاحب سے ملنے کے لئے میراں شاہ جانا پڑا۔ اُس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ قلعہ میراں شاہ ایک وسیع میدان میں واقع ہے۔ ٹوچی نالہ اس موقعہ پر سڑک سے بہت فاصلہ پر ہو گیا ہے۔ یہ قلعہ دو حصص پر منقسم ہے۔ یعنی سول حصہ اور ملٹری حصہ۔ ہمارے گیریسن انجینیر صاحب کا ہیڈ کوارٹر بھی اسی قلعہ میں ہے۔ شمال کی جانب افغانستان کے بلند پہاڑ نظر آ رہے ہیں۔ اور علاقہ خوست میں پہنچنے کے لئے ایک درہ بھی یہاں سے نکلتا ہے۔

میرے پہنچنے کے دوسرے روز یعنی پچیس کی صبح بھی آسمان ابر آلود تھا۔ گویا اس روز کی نحوست کو محسوس کرتے ہوئے ہم سے اپنا چہرہ

چھپائے رکھنے کے لئے نقاب ابر اٹھانا نہیں چاہتا۔ بادل کو نہ معلوم ہماری شوئیِ قسمت کا کہاں سے پتہ چل گیا۔ کہ صبح ہی روتے اٹھا اور سارا دن اسکی آنکھوں سے آنسو نہ تھمے۔

بارش میں پہاڑی سڑکیں پتھروں کے گرنے کیوجہ سے اکثر جگہ ناقابلِ گذر ہو جاتی ہیں۔ اسلئے میرے منصبی فرائض مجھے علاقہ میں پہنچنے کیلئے مجبور کر رہے تھے میرا ارادہ ڈاک تانگہ میں واپس آنیکا تھا جس کی روانگی کا وقت بارہ اور ایک بجے دوپہر کے درمیان تھا لیکن دفتر میں دیر ہو جانیکے باعث میں اس سے رہ گیا۔ ایسے حالات اور ایسے وقت میں سفر کرنا خالی از خطرہ نہیں تھا لیکن سرحدی علاقوں میں اپنی ملازمت کی نوعیت کے باعث اور دو ایک جنگوں میں گولیوں کی بارش میں رہنے کیوجہ سے اور خاصکر قدرت سے ایک خطرہ پسند فطرت پانے کی طفیل اپنی جان کی قیمت اپنے فرائض کے مقابل ارزاں سمجھتا تھا چنانچہ بارش اور ناوقت ہو جانیکے ناموافق حالات پر احساسِ فرائض غالب آہی گیا۔ اور میں نے چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

میرے منصب کیلئے دو بدرقہ اور ایک ریوالور کی منظوری تھی جس کیلئے میں نے درخواست بھیجی ہوئی تھی۔ جو حسب قواعد پولیٹیکل محکمہ میں بھیج دی گئی ہوئی تھی۔ حالاتِ متذکرہ میں خطرہ کے لحاظ سے میں نے گیریژن انجینئر صاحب کی خدمت میں زبانی یاد دہانی کی چنانچہ حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے ایک ریوالور سب ڈویژنل کلرک سے دلا دیا۔ ایک کارتوس اپنے پاس سے دیا۔ اور تین کارتوس میں نے ایک اور صاحب سے مانگ لئے۔ گویا چار آدمیوں کی زندگی لینے کا سامان کر بیٹھا۔

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

باب دوم

گرفتاری

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ ڈاک کا ٹانگہ تو جا ہی چکا تھا۔ اتفاقاً لالہ سندر لال ٹھیکہ دار بھی اسوقت بنوں جانے کیلئے تیار تھے۔ اسلئے مجھے ان کی دو اسپہ ٹمٹم پر سوار ہونیکا موقعہ مل گیا۔ اور ڈیڑھ بجے کے قریب ہم میران شاہ سے روانہ ہو گئے۔

ٹانگے میں لالہ سندر لال اور میں اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور لالہ صاحب کا کوچبان اور ایک نوعمر بنیا پچھلی نشست پر۔ گھوڑوں کی باگیں لالہ جی بائیں ہاتھ میں اور ہنٹر دائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ ایک سگریٹ سلگا کر لبوں میں دبایا ہوا تھا۔ قلعہ کے دروازہ سے نکلتے ہی لالہ جی نے اپنے ہنٹر کو گھمایا۔ اور گھوڑوں نے ایک جست کے ساتھ مطلب سمجھ لینے کا اظہار کیا۔ قلعہ کے باہر چند قدم کے فاصلہ پر ایک آدمی سامنے سے آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر لالہ صاحب کا باگ تھامے ہوئے ہاتھ ڈھیلا پڑ کر زانو پر آ رہا اور ہنٹر والا ہاتھ بھی سست ہو گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید آنیوالے سے کوئی بات کریں گے لیکن اس کے گزر جانے کے بعد بھی لالہ صاحب اسی طرح کسی سوچ میں پڑے

جا رہے تھے۔ ان کو اس طرح مذبذب پاکر میں نے وجہ پوچھی۔ انہوں نے فرمایا

"اس آدمی کو تم نے دیکھا"۔

مَیں:۔ ہاں کیا یہ ڈاکوؤں کا جاسوس ہے؟

لالہ جی:۔ نہیں یہ حجام ہے اور یک چشم ہے۔

مَیں:۔ ہوگا۔ پھر؟

لالہ جی: شگون بد ہے۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنک رہا ہے۔ اگر ہم جائینگے تو ضرور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مَیں: مستثنےٰ قاعدہ کلیہ کو ثابت کرتا ہے۔ اور اگر آپ کا قاعدہ ٹھیک ہے۔ تو آج کا دن مستثنےٰ ہوگا۔ اور میں تو شگون کا قائل ہی نہیں چلو آج آزمائش ہی ہو جائیگی۔

لالہ جی نے کچھ تامل کے بعد باگوں کو پھر سنبھالا ہنٹر اٹھایا۔ اور گھوڑوں کی رفتار نے اس واقعہ کو رفت گذشت کر دیا۔

آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی پہاڑی نالوں میں پانی بہ کر بارش کی کثرت کا پتہ دے رہا تھا۔ ایشیاپوسٹ کی بلند پہاڑیوں پر چڑھنے کے لئے گھوڑوں کی رفتار سست کر دی گئی۔ پہاڑیوں کی نزدیک تریں چوٹیوں پر فوجی سپاہی بارانی وردی پہنے ہوئے سڑک کی حفاظت کر رہے تھے جس سے ہمارے دل کو ڈھارس ہو رہی تھی۔ نو میل کے سفر کے بعد سامنے کی طرف سے ایک تانگا آیا جس میں ایک یورپین افسر سفر کر رہا تھا۔ میں نے لالہ جی کو حسرت سے کہا "کاش ہماری سرکار اپنے سب اہلکاروں کی جانوں کی حفاظت اسی طرح کیا کرے۔ دیکھئے ان صاحب کا تانگہ گذر گیا ہے۔ اب سڑک پر سے پکٹیں اٹھ گئی ہوں گی"۔

لالہ جی نے ہنس کر جواب دیا "جی ہاں! کل مطالبہ کرو گے کہ سب کی تنخواہیں بھی ایک جتنی ہی چاہئیں" سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے لالہ جی نے فرمایا۔ کہ اس دفعہ وارداتیں معمول سے ذرا پہلے ہی شروع ہو گئی ہیں۔ کل کا واقعہ تم نے ٹھیکہ دار اکبر کے منشی کی زبانی سن ہی لیا ہے۔ کہ بدمعاشوں نے کس طرح تیرھویں میل میں ہی اسے لوٹ لیا۔ اور اگر اتفاقیہ مدد نہ پہنچ جاتی تو وہ اسکو ہمراہ لے جا ہی چکے تھے۔ کئی واقعات اور بھی اسی طرح کے ہو چکے ہیں۔ یہ کہکر لالہ جی کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔ شاید گفتگو کی نوعیت سے وہی یک چشم حجام انکے دیدۂ تصور کے سامنے آ گیا۔ کیونکہ نہایت متکبّرانہ لہجہ میں جس سے ولی ہراس کو دُور کرنے کا انداز پایا جاتا تھا۔ انہوں نے فرمایا "ماں کے پیٹ سے کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا۔ جو سندر کو زندہ پکڑ کر لے جائے"۔

لالہ سندر لال اپنی پوری جوانی پر ہیں اور بتقاضائے شباب جوشیلے خیالات سے مبرّا نہیں۔ اسوقت ان کی گفتگو سے غیر معمولی جوش ٹپک رہا ہے۔ جیسے اکثر مقاماتِ خطرہ میں انسان اپنے دل کو دلیرانہ گفتگو سے مضبوط رکھنا چاہتا ہے۔ ہمارے ٹھیکہ دار صاحب ایک خوش وضع میانہ قد خوبصورت جوان ہیں۔ گندمی رنگ۔ گول چہرہ لمبی لمبی بارعب مونچھیں۔ منڈھی داڑھی۔ سر کے بال ریشمی لنگی کے نیچے سے نکل نکل کر پیشانی پر بل کھا رہے ہیں۔ قدرت نے انہیں فراخ سینہ۔ پُرگوشت اعضاء اور چالاک جسم عطا کیا ہے۔

گھوڑوں نے ایشا کے بلند ترین مقام پر پہنچ کر نیچے اترنا شروع کیا۔ اس وقت بارش موسلا دھار شروع ہو گئی۔ چند میل کے سفر کے بعد ہم ایک کھلے میدان میں

آ نکلے جس کے وسط میں عیدک کا قلعہ دُور سے بارش کے درمیان دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ پہاڑوں کے درمیان اس وسیع میدان میں سبز و سیراب فصلیں ہوا کے جھونکوں سے مستانہ وار جھوم جھوم کر ایک کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ قلعے کے سامنے پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے ہم ٹھہرے۔ ہمارا ہمسفر بنیا یہاں پر اُتر گیا اور ہم پھر سرگرم سفر ہو گئے۔ لالہ جی اور مَیں بدستور آگے بیٹھے ہوئے تھے کوچبان پچھلی نشست پر تھا۔ عیدک کے میدان کو طے کر کے ہم پھر چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں داخل ہو گئے۔ اور ان کو جلدی عبور کر کے شیوہ کے وسیع میدان میں پہنچ گئے۔ اسوقت چار بجنے کو تھے۔ سڑک کا یہ حصہ دو تین میل تک خراب اور کچی تھا جس میں تانگے کے پہیئے بارش کی وجہ سے دھنسے جا رہے تھے۔ اسلئے اس نرم جگہ کی سختی میں گھوڑے قدم قدم چلنے لگے۔ اس موقعہ پر ایک سُرخ ریش[1] ضعیف العمر آدمی گھوڑے پر سوار سامنے سے نمودار ہوا اس نے پرمعنی نگاہوں سے ہماری جانب دیکھا۔ اور اس کے چہرہ پر بے محل سا تبسم ظاہر ہوا۔ اس کے اس انداز کو ہم سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ پاس سے گذر گیا ہم نے مڑ کر اس کو پشت سے دیکھا۔ وہ بھی گردن پھرائے ہماری جانب دیکھتا جا رہا تھا۔ اور وہی ناقابلِ فہم مسکراہٹ اس کے چہرہ پر سے عیاں تھی میں نے اور لالہ جی نے نگاہوں ہی میں تبادلۂ خیالات کیا۔ اور پھر سڑک پر نظریں جما کر بڈھے کی اس مخدوش ادا پر خاموشی کے ساتھ غور کرتے جانے لگے تھوڑی ہی دُور جا کر معمہ خود بخود حل ہو گیا۔ چند قدم کے فاصلہ پر ایک نشیبی جگہ سے

[1] وزیرِ امان نے اپنے مسکن میں پہنچ کر اس سُرخ ریش کا ملنا۔ اور بوجہ واقفیت اس سے معترض نہ ہونا۔ اور خاموشی کا وعدہ لینا بیان کیا۔

اچانک دو ہیبت ناک شکلیں نمودار ہوئیں۔ ایک نے لالہ سُندر لال کو اور دوسرے نے مجھ کو۔ رائیفلوں کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں سے بھی یکایک دو مسلح قزاق کود پڑے۔ لالہ جی نے فوراً ٹانگہ روک لیا۔ اس ایک لمحہ میں میرا خیال ریوالور کی جانب گیا جس میں چار کارتوس بھرے ہوئے تھے اور جسے میں نے قمیص کی جیب میں اس طرح چھپا رکھا تھا۔ کہ بغیر کوٹ اور واسکٹ کے بٹن کھولے کالر سے ہاتھ ڈال کر نکال سکتا تھا۔ لیکن کیا میرا ہاتھ ریوالور تک پہنچ سکتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اسے جیب سے نکال سکوں میری لاش زمین پر تڑپ رہی ہوگی۔ سامنے کی رائیفلیں آہستہ آہستہ ہمارے قریب تر پہنچ رہی ہیں۔ اور دائیں بائیں کی توپیں بالکل چھو رہی ہیں۔ لالہ جی پشتو میں مُنت ما۔ و ہمت مارو کہتے ہوئے نیچے کود گئے۔ میں اوسان خطا کئے بغیر موقعہ کی تاک میں ٹانگہ پر بیٹھا رہا۔ کوئی حکم اُتر نے کا نہیں دیا گیا تاہم حکم مفہوم کو ہم اچھی طرح سمجھتے تھے جس کی عدولی کے باعث ایک سخت صدمہ بندوق کے کُندے کا میری پُشت پر پہنچا۔ اور میں دھم سے آگے کو گر پڑا۔ مڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دو مہیب شکلیں پیچھے سے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں مجبوراً اتر پڑا۔ چار آدمی مجھے اور کوچبان کو لیکر سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔ ایک آدمی نے گھوڑوں کے ساز کاٹ ڈالے لالہ سندر لال نے بڑھ کر گھوڑوں کو پکڑ لیا۔ اور کسی غائبانہ امداد کی انتظار میں وقت ٹالنا چاہا۔ کوچبان کے دونوں ہاتھ باندھ دئے گئے۔ میری تلاشی لیکر سب چیزیں مجھ سے چھین لی گئیں۔ لیکن ریوالور قمیص کی جیب میں چُھپا رہا۔ اس خیال خام سے کہ یہ نام کے مسلمان سفاک مسلمانوں کو کسی قسم کی

تکلیف نہیں پہنچاتے ہیں اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلانے کے لئے اور اپنی موت کا قرب سمجھ کر بار بار کلمہ شہادت زبان پر لایا۔ کوچبان کی پگڑی سے میرے بھی ہاتھ باندھنے لگے۔ میں نے بہت منت زاری کی مگر ذرا آواز نکلنے پر خنجر کی جھلک میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی۔ تاہم میں نے ہاتھ چھڑانے کے لئے شریفانہ الحاح میں کسی قسم کے خوف کی پرواہ نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا صرف ایک ہاتھ کوچبان کے ہاتھوں سے جکڑ دیا گیا۔ اور دایاں ہاتھ آزاد رہا۔ اور میرے دل میں توقع پیدا ہوئی کہ ریوالور کا چھپا رہنا اور ایک ہاتھ کا ایسے طور پر کھلا رہنا ضرور میرے کام آنے کا۔

تانگہ سے اسباب نکال لیا گیا۔ اور گدیوں کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ لالہ سندر لال کو آگے لگا لیا۔ گھوڑوں اور اسباب سمیت ہم کو بھی دست بستہ ساتھ لے لیا۔ چند قدم کے فاصلہ پر جا کر ایک نشیب جگہ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ اسباب کی دیکھ بھال کی گئی۔ اور مناسب حصوں میں اس کو باندھا گیا۔ بارش سے بچاؤ کیلئے لالہ سندر لال کو ایک دری اوڑھنے کیلئے دی گئی مجھے بھی ایک کھیس دینا چاہا لیکن میں نے شدتِ رنج سے انکار کر دیا۔ یہاں پر میری دوبارہ تلاشی لی گئی لیکن اتفاق سے پھر بھی ریوالور ان کی نظروں سے بچا رہا میں نے دوسرا ہاتھ چھڑانے کیلئے بہت کوشش کی لیکن کارگر نہ ہوئی القصہ اسباب وغیرہ کی تقسیم کی گئی جس میں سے ایک ایک گٹھڑی اٹھانے کیلئے ہمیں بھی دی گئی سچ ہے کہ

چنین است رسم سرائے درشت
گہے پشت زین و گہے زین بہ پشت

گھوڑوں کو انہوں نے وہیں جھاڑی سے باندھ دیا۔کیونکہ ان کا ہمراہ لیجانا
محال تھا۔ اور ایک نالے میں ہمیں لے گھسے کچھ دُور جا کر کوچبان نے اسباب کی
گٹھڑی مجھ سے باصرار لے لی جس پہ قزاقوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔
ان میں سے ایک تیز رو دو تین سو قدم آگے ہو لیا۔ باقی پانچ ہمیں گھیرے
ہوئے اسکے پیچھے چل دیئے میرے اور کوچبان کے ہاتھ ایک ہی پگڑی سے بندھے
ہوئے تھے۔ اور اس پگڑی کا دوسرا سرا ایک نوخیز۔خوبصورت۔پست قد۔
فربہ اندام نوجوان کے ہاتھ میں تھا۔ بعد میں جا کر معلوم ہوا۔کہ یہ جوان بڑا محتاط
اور چالاک تھا۔ اس نے میرے جسم کو ٹٹولنا شروع کیا۔ یکایک اُسکا ہاتھ
ریوالور کی نالی پہ جا پڑا۔ جھٹ اس نے میری جیب سے نکال لیا۔ اس کی
آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ باقی قزّاقوں کو اس نے آہستہ مگر پُرغضب لہجے میں
آواز دی۔ جو فوراً ہی لپک پڑے۔ اس جوان نے ریوالور ان کو دکھا کر کہا
کہ تم اچھّے کے پچھے ہی مارے گئے تھے۔ ریوالور دیکھ کر سب غضب آلوُد
نگاہوں سے مجھے گھورنے لگے۔ ایک دو نے خنجر نکال لئے اور مجھے
بہت ڈرایا۔کہ تم نے اسے کیوں چھپائے رکھا۔ ریوالور تو اُن کے لیڈر
نے لے لیا۔ اور ساتھ لے جانے کی مصلحت سے مجھے کوئی تکلیف نہ
پہنچائی گئی۔
نصف میل چلے تھے۔ کہ ناگہ ایک گھسیارہ گھاس سر پہ اٹھائے
سامنے سے نمودار ہوا جس نے ضرور ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔ ہمارے سرگروہ نے
اشارہ کیا۔ اور ہمیں فوراً اس سے پوشیدہ کیا گیا۔ وہ خود اس گھاس والے کے

پاس گیا۔ جو غالباً ہیبت زدہ ہو گیا ہو گا۔ اس کو موت کی دھمکی دی گئی۔ کہ ان کا راز کسی پر ظاہر نہ کرے۔ اس تھوڑے سے وقفہ میں انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ تم تحصیلدار ہو جس کا جواب میں نے نفی میں دیا۔ پھر پوچھا۔ کہ تم کون ہو۔ جس کا جواب دینے سے پہلے مجھے دل میں فیصلہ کرنا باقی تھا۔ کہ آیا میں اپنا حال سچ سچ بتا دوں یا چھپائے رکھوں۔ اس لئے میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ آگے چل کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کچھ دُور تک ہم کو مشرق کی طرف گھاٹیوں کے درمیان لئے چلے گئے۔ جہاں یہ نالا ایک وسیع میدان میں جا کھلا۔ اس جگہ بہت سی عورتیں مویشی چرا رہی تھیں جنہوں نے معنی خیز نگاہوں سے ہماری جانب دیکھا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا۔ کہ وہ ہماری گرفتاری کے راز کو سمجھ رہی تھیں۔ اور مفروروں کی کامیابی سے اُن کو مسرت ہو رہی تھی۔ قریب دو میل شمال مشرق کی جانب جا کر پھر انہوں نے مغرب کا رُخ لیا۔ اور کئی میل نوچی سڑک کے متوازی چلے گئے۔ بلکہ بعض بعض چوٹیوں سے سڑک نظر بھی آجاتی تھی۔ اس دن سڑک پر دو ایک جگہ خانہ بدوش افغانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جو اگر ذرا بھی کوشش کرتے تو ہمیں چھڑا سکتے تھے۔ اس جگہ پہنچ کر ہمارے رہبر نے اشارہ کیا جس سے ہمارے محافظ آہستہ چلنے لگے۔ رہبر خود تیزی سے ایک گھاٹی پر چڑھ گیا۔ غالباً وہاں سے ارد گرد کا نظارہ دُور تک دکھائی دیتا ہو گا۔ اُوپر چڑھ کر پھر اس نے اشارہ کیا۔ جسے سمجھ کر سب کے سب تھم گئے۔ دو گھاٹیوں کے درمیان ہمیں لیٹ جانے کا حکم ملا۔ جہاں سے گھاٹی والا آدمی بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ اب بارش پھر زور سے شروع

ہوئی۔ ہمارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ اور میں سردی سے کپکپا رہا تھا۔
یہ وہ موقع ہے۔ جبکہ میں نے ان پانچ آدم خور انسانوں کو نظر بھر کر دیکھا۔
میرے بائیں طرف ایک دراز قد چالاک جسم سیاہ رنگ جوان مدّآ میر نامی پڑا
تھا۔ اس کی آنکھیں سُرمہ کی کثرت سے کوّے کی آنکھوں کی طرح چمک
رہی تھیں۔ جن کے گرد اگرد شکل کو زیادہ مہیب بنانے کے لئے سُرمہ کا
پلستر کیا گیا تھا۔ اس کی تیز نگاہیں دل کو چھید سے جاتی تھیں۔ چھوٹی سی
سیاہ پگڑی کے نیچے سے لمبے لمبے بال لٹک رہے تھے۔ منڈی داڑھی
لمبی مونچھیں۔ اس کی حرکات و سکنات۔ طرزِ نگاہ اور حاکمانہ اشاروں سے
صاف پایا جاتا تھا۔ کہ وہ حد درجے کا مختاط۔ بیدار مغز اور چالاک آدمی
ہے۔ اس کے اُبھرے ہوئے رُخساروں۔ موٹی آنکھوں اور مختصر گفتگو سے
اس کی طبیعت کی تندی سختی اور بے پروائی ظاہر ہوتی تھی۔ اس کے دائیں
طرف وہ فربہ اندام سبزہ آغاز نوجوان بیٹھا ہوا تھا جس کا ذکر ریوالور کے ظاہر
ہونے کے وقت آچکا ہے یہ خوتنے تھا۔ اسکے پاس لالہ سُندر لال ڈری
اوڑھے آنسو ڈبڈبائے روتی صورت بنائے چپ چاپ قسمت کو رورہے تھے
اُن کے دائیں طرف ایک یک چشم عمر رسیدہ میانہ قد سے ذرا اترتا ہوا اپنی ایک
آنکھ سے ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چوڑے چپٹے مہیب چہرے کو
لمبی گنجان داڑھی گھیرے ہوئے تھی۔ اس کی نظروں کے اتار چڑھاؤ بکھرے
ہوئے بالوں۔ بیہودہ حرکتوں سے اس کی متلوّن مزاجی اور بیوقوفی ٹپک رہی
تھی۔ اسے مدّے کہتے تھے۔ سب سے اخیر متلم نامی ایک مضبوط۔ بلند قد

نسوانی شکل جوان بے پروائی سے لیٹ رہا تھا۔ کانوں میں چاندی کے گوشوارے گلے میں ہیکل۔ اس کے خود آرا مزاج کا پتہ دے رہے تھے۔ اس کا بشاش چہرہ اور مسکراتی ہوئی لبیں۔ اس کی عاشق مزاجی اور دلیری کا ثبوت دے رہی تھیں۔ ہمارے مقابل گوری رنگت کا ایک تیس ۳۰ سالہ گربہ چشم۔ کوتاہ قامت اور بیدار ہوش گرگ دراز ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں لحظہ بلحظہ پھرتی تھیں۔ اور اس کی بیقرار نگاہوں اور پُر اضطرار اعضا کو ایک جگہ آرام نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے قزاقی اور شرارت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اُس کا نام گل قدم تھا۔ یہ سب رائیفلوں اور خنجروں سے مسلح تھے۔ اور سب کے گلے میں ایک ایک چرمی کیس لٹک رہا تھا جس میں تبرک اور حفاظت کے طور پر پنجسورہ وغیرہ کی ایک ایک جلد پڑی تھی۔ تاکہ سفاکی کے کام میں وہ اس سے طلب ہمت کریں۔ اس حالت میں ہم بے حس و حرکت چند منٹ پڑے رہے۔ ہاں پہلے ذکر کرنا میں بھول گیا۔ کہ راستے میں ہنت خوشامد اور رہبر کی سفارش سے میرا دوسرا ہاتھ بھی رہا کر دیا گیا تھا۔ اور اب میں بظاہر کسی چیز سے بندھا ہوا نہیں تھا۔

اپنے خیالات اور مایوسی کا نقشہ کھینچنا میرے قلم کی روانی سے باہر ہے اسکا اندازہ ناظرین خود لگا سکتے ہیں۔ لالہ سندر لال کے چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ دست و پا شل ہو رہے تھے۔ لیکن یہ حالت ہمارے ارادوں کیلئے بہت مُضر تھی۔ اور میں نے اسے دُور کرنا چاہا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور ان سے

پیشاب کی رخصت مانگی۔ ایک دو قدم ہی بڑھا تھا۔ کہ انہوں نے روک کر کہا یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں نے اپنا رویہ شروع سے ہی اپنی جائز خواہشوں کو پورا کرنے کیلئے دلیرانہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے انگلی سے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور ایک دو قدم آگے بڑھا۔ یک چشم غصہ سے خنجر نکال کر اٹھا۔ اور میرے سر پر پہنچا۔ اس نے اپنے دل کا شبہ دوسروں پر اس طرح ظاہر کیا۔ کہ اس کے پاس کارتوس ہیں۔ جنہیں پھینکنا چاہتا ہے۔ ناچار وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اٹھنے کے لیے سر پر کھڑا اصرار کرتا۔ اور میں جان بوجھ کر دیر لگاتا۔ تاکہ اس کو زیادہ شک ہو۔ آخر میں اٹھا۔ اور ازار بند ابھی ہاتھ ہی میں تھا۔ کہ اس نے تلاشی لینی شروع کر دی۔ میں بہت ہچکچایا۔ تاکہ اس کو پورا شک ہو جائے غرض پوری طرح مکمل تلاشی لی گئی۔ اور آخر اسے شرمندہ ہونا پڑا۔ مجھے اس حرکت سے یہ فائدہ مدنظر تھا۔ کہ ایسی چند مثالوں کے بعد میری کسی حرکت پر انہیں شبہ نہ رہیگا۔ اور وہ ایسی باتوں کو میری عادت کا خاصہ سمجھنے لگیں گے۔

میں اپنی جگہ واپس آبیٹھا۔ چہرے کو بشاش بنایا۔ لبوں پر زبردستی کچھ مسکراہٹ سی پیدا کی۔ ایک دو کی طرف دیکھ کر اس طرح مسکرایا گویا نظر پہلے سے آشنا تھی۔ یہ دیکھ کر انہوں نے بھی آہستہ سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ جس کو میں نے نہایت استقلال سے جاری رکھا۔ اور بیان کیا کہ میری یہ خواہش تھی۔ کہ ان بہادر لوگوں کو جن کا سکہ اردگرد کے سارے علاقے میں بیٹھا ہوا ہے! اور جنکا نام سُن کر لوگ کانپ اٹھتے ہیں دیکھوں اور ان کی طرز بود و باش کا مطالعہ کروں میں تمہارے ساتھ بڑی خوشی سے جانے کو تیار ہوں۔ میرے الفاظ نے
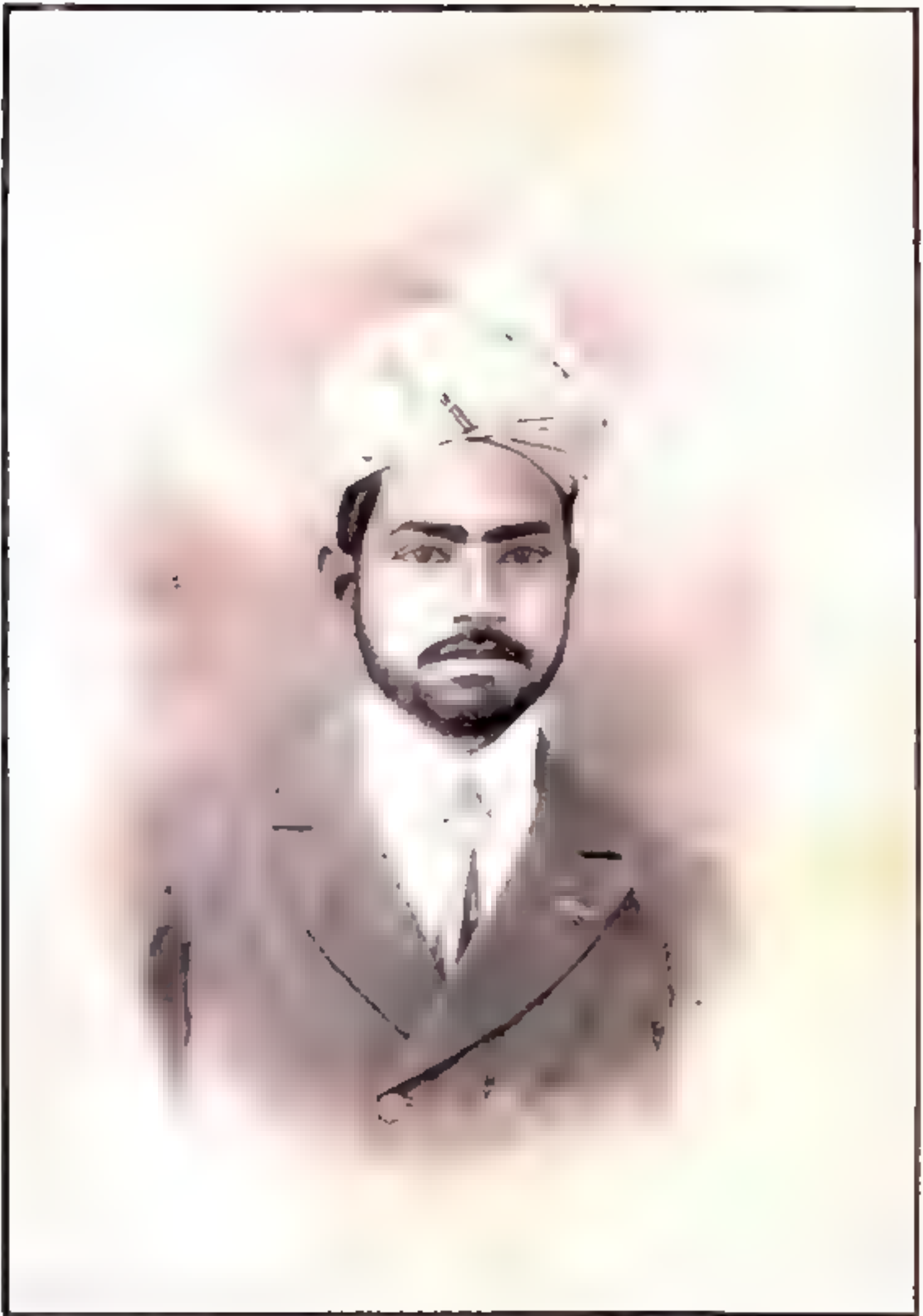
گرفتاری سے دو ماہ پیشتر

اُن پر اچھا اثر کیا۔ اور ان سب کی تیز پُرنخوت نگاہیں ذرا دھیمی پڑ گئیں۔ لالہ تسندر لال کی بھی جان میں جان آئی۔ نہ معلوم میرے اس طرزِ انداز کو انہوں نے کیسے سمجھ لیا وہ بھی ہنس پڑے۔ اور میری گفتگو کو تقویت دیکر اپنا بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ بلکہ برادرانہ طور پر تدآمیر سے نسوار طلب کی جس نے خندہ پیشانی سے ایک خوراک انہیں دیدی۔ ہمارے لالہ صاحب کے پاس ایک ڈبیہ سگریٹ کی تھی۔ ایک سگریٹ سُلگا کر انہوں نے دھواں نکالنا شروع کیا۔ اور تھوڑا سا جلا کر ساتھ والے کو دے دیا۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر میں بھی خوش ہوا۔ کہ اللہ کی عنایت سے میرا ساتھی کوئی ایسا بزدل نہیں ہے۔ جس کی رازداری سے مجھے نقصان کا اندیشہ ہو۔

ہمارا رہبر پہاڑی کی چوٹی پر چادر اوڑھے بُت کی طرح بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے کسی خطرہ کا شبہ پڑا ہوگا۔ اس نے ہر چار طرف سے اپنی تسلی کر کے پندرہ میں منٹ کے بعد چلنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر ہمیں لے بھاگے ان قزّاقوں کے لئے یہ ایک نہایت نازک موقعہ تھا۔ سرکاری علاقے میں اُن دشمنوں کے درمیان سے گذر رہے تھے جن میں وہ خونریزیاں کر کے بھاگے ہوئے تھے۔ اور جو ان کے خون کے پیاسے تھے۔ اس وقت انکو بڑی مشکل و اضطراب کا سامنا تھا۔ اُن کو ڈر تھا۔ کہ اگر چغہ نکل پڑا تو کسی طرح بھی وہ جانبر نہ ہو سکیں گے۔ اس موقعہ پر میں ان کی حرکات کو نہایت غور سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ شاید ایسی احتیاط کا موقعہ کبھی مجھے بھی آپڑے۔ ہم اس رہبر کے قریب پہنچ گئے۔ دوسروں نے اُس سے ٹھہرنے کا سبب دریافت کیا۔ جس کا

جواب اس نے بڑبڑاتی ہوئی دھیمی آواز میں دیا جس کو ہم نہ سمجھ سکے۔

ہمارا رہبر ایک ملا نما بھوری آنکھوں والا تیز ہوش ادھیڑ عمر پٹھان ہے۔ اسکے بھورے بال۔ سرخ چہرہ۔ منڈا ہوا سر بھوری گھنی داڑھی ہے۔ اور اس کی مدبرانہ نگاہ ہمراہیوں سے اُسے متمیز کر رہی ہے۔ وہ اپنی عقابی نظر پیچیدہ گفتگو اور چہرہ کے استقلال سے ایک ایسی گہری پالیسی کا آدمی معلوم ہوتا ہے جس کی طبیعت کی شرافت اور شرارت کا فیصلہ کرنا آسان نہ ہو۔ اس کا قد میانہ سے دو اڑھائی انچ پست ہوگا۔ اس کے قدم چھوٹے مگر بہت تیز اور ان تھک معلوم ہوتے ہیں۔ اور پہاڑوں کی سیدھی چڑھائیوں پر وہ بے تکان بغیر ہانپنے یا دم لینے کے چڑھ جاتا ہے۔ یہ وسیم گل ہے۔

اپنے ہمراہیوں سے چند ایک باتیں کر کے پھر ہمارا رہبر اسی فاصلے پر آگے ہو لیا۔ ہمیں نہ تو پورے نشیب میں چلاتے۔ نہ ہی چوٹی پر لے جاتے۔ البتہ چوٹیوں سے اتنا نیچے چلتے کہ سر پہاڑوں کی دوسری طرف سے نظر نہ آئے جس کا ہمیں یہ فائدہ سمجھا کہ اگر اس طرف سے ذرا خطرہ محسوس کریں تو جھٹ دوسری طرف ہو جائیں۔ اور ساتھ ہی اُدھر بھی نظر ڈالتے جا سکیں ۔ تاکہ خطرہ سے غافل نہ رہیں۔ چغہ کا خطرہ انہیں بھی سہمائے ہوئے تھا۔ اور اُن پُر خطر گھاٹیوں کو وہ جلد عبور کرنا چاہتے تھے۔ ہم قریباً ڈبل مارچ چلائے جا رہے تھے۔ قدم قدم پر ہمیں تیز تر چلنے کا حکم مل رہا تھا۔ بندوق کے سر ہمارے کندھوں کے ساتھ چھو رہے تھے۔ لالہ سندر لال کا طرز عمل میرے طریق کے بالکل برعکس تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اُن کی رائے بہت صائب ہے۔

اور آخر میں وہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اور میں نقصان لیکن خودداری مجھے اپنا طرزِ عمل بدلنے نہ دیتی۔ لالہ صاحب نے اپنے آپ کو اُن کی مرضی کے بالکل تابع کر دیا۔ اُن کی خوشامد درآمد کی دل میں ٹھان لی۔ ان کے جلدی چلنے کے حکم پر آپ دوڑ کر سب سے آگے ہو جاتے۔ اے کاش لالہ صاحب کو معلوم ہوتا۔ کہ ابھی کتنا سفر ہمارے درپیش ہے میں نے اپنی چال کو حتی الوسع سُست رکھا۔ جس کے دو معنے تھے۔ ایک تو یہ کہ شاید اس طرح چغہ ہمارے پیچھے پہنچ جائے۔ اور دوسرے لمبے سفر کے خیال سے بھی غافل نہیں تھا۔

اللہ اکبر میں اپنا چہرہ تو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ کہ اس کا نقشہ کھینچوں۔ لالہ صاحب کا یہ حال تھا۔ کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چہرہ اُترا ہوا تھا سانس بدن میں نہیں سماتا تھا۔ لب باوجود بار بار پانی پینے کے چمڑے کی طرح خشک تھے۔ اور ٹھنڈی سانسوں کا تار بندھا ہوا تھا۔ آہ میں بیچارے کو چبان کو بھول گیا۔ خدا جانے اس کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ وہ قوم کا خشک پٹھان تھا۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ اضطراب کا نہیں نکلا۔ البتہ چہرہ پر یاس وحسرت برس رہی تھی۔ اس نے کوئی لفظ ہائے یا بچاؤ کے بارے میں نہیں کہا چُپ چاپ ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔

راستہ میں باتیں کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اسلئے کوئی بات انھوں نے ہم سے دریافت نہیں کی۔ میں اس وقت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا جا رہا تھا۔ مجھے ابھی دل میں بہت فیصلے کرنے تھے۔ سب سے پہلا سوال ہم سے یہ

کیا جائے گا۔ کہ تم کون ہو۔ میں اس وقت جھوٹ بھول سکتا تھا لیکن کیا وہ میرے جھوٹ بولنے پر اعتبار کر لیتے۔ اور پھر اعتبار کرنے پر مجھے رہا کر دیتے کبھی نہیں۔ میں ان سوالوں کا جواب پہلے گرفتار شدہ لوگوں کی حکایتوں اور مثالوں سے دیتا تھا۔ اگر باوجود ہماری اس ناروا کوشش کے ہمیں نہ چھوڑتے۔ تو کیا انہیں پتہ نہ لگتا۔ کہ ہم کون ہیں۔ ضرور لگتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ پھر ہماری سچی بات کا بھی یقین نہ رہتا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی نسبت جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔ ع

گر راست بگوی و در بند بمانی

بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

دوسرے میں نے اگرچہ اُن سے پشتو میں گفتگو کی تھی لیکن ابھی گنجائش تھی کہ آیا میں صاف سمجھ سکتا ہوں۔ یا نہیں۔ کیا انکار میرے حق میں مفید ہوگا۔ یا اقرار۔ بالکل انکار تو اب فضول ہے۔ البتہ بین بین رہنا مجھے بہت بھلا معلوم ہوا جو بعد میں متعدد دفعہ بڑا مفید ثابت ہوا جس کا ذکر آگے چل کر آئیگا۔ سوم اگرچہ ہمارے پیچھے نکل آئے۔ تو کوئی صورت ایسی ہونی چاہیئے جس سے ان کو ہمارے راستے کا پتہ مل جائے۔ اسواسطے میں نے اپنی جیب کے چند کاغذ جو انہوں نے بعد ملاحظہ مجھے واپس کر دئے تھے۔ کچھ کچھ فاصلے پر پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے شروع کر دیے

میں دیتا جاؤں یارانِ وطن کو کیا پتہ اپنا

خدا جانے مجھے لیجائے وحشت کس بیاباں میں

چہارم سب سے اہم سوال یہ تھا۔ کہ ہم کس حالت جا رہے ہیں۔ اور یہ

دریافت کرنا بہت ضروری بھی تھا اور مشکل بھی۔ ابر چھایا ہوا تھا۔ اور مجھے بہت کم پتہ چلتا تھا۔ کہ ہمارا رُخ کس سمت ہے۔ تاہم اس سوال کے حل کرنے اور راستے کی پوری کیفیت معلوم کرنے اور نقشہ دل میں جمانے کے لئے میں نے باقی خیالات کو زبردستی دل سے نکال دیا۔ عصر قضا ہو رہی تھی میں نے ادائے نماز کے واسطے درخواست کی۔ جس کا جواب دیا گیا۔ کہ آگے چل کر پڑھیں گے۔ تھوڑی دور جا کر ایک چھوٹی سی نالی میں بارش کا پانی بہ رہا تھا۔ وہاں پر ہمارا رہبر رُک گیا۔ اور نماز کی اجازت ملی۔ ہم تین آدمیوں نے وضو کیا۔ باقی چار لالہ سندر لال اور کوچبان کو لئے بیٹھے رہے۔ خیال تھا کہ شاید وہ ہمارے بعد ادا کرلیں گے۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ وہ سب بے نماز تھے۔ وضو کرتے وقت میں نے اپنی پٹیاں کھول لیں۔ اور ذرا مسکرا کر کہا یہ کون لے گا ہر ایک نے آواز دی کہ مجھے دے دو۔ میں نے اُن کو اوپر کی طرف پھینک دیا۔ اور یک چشم نے لپک کر پکڑ لیں۔ ایسا ہی میں نے موزوں کے ساتھ کیا۔ جن کو ابھی دو چار روز ہوئے۔ بڑے شوق سے سابر لگوایا تھا۔ نماز پڑھنے میں میرا مدعا یہ بھی تھا۔ کہ سمت کا پتہ مل جائے۔ اس طریق سے ہمراہیوں کو خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ کہ اس کا منشاء یہ بھی ہو سکتا ہے۔ نماز کے بعد ہم فوراً چل دیئے۔ ان کی بجد کوشش یہ تھی کہ کسی پگڈنڈی یا راستہ کے قریب سے ہو کر بھی نہ گذریں۔ رلستے کی مشکلات کا صرف وہ لوگ اندازہ کر سکتے ہیں۔ جن کو پہاڑی علاقہ کبھی

پیدل طے کرنے کا موقع ملا ہو۔ بعض ایسی خطرناک جگہوں سے ہم گذرے
کہ ذرا پاؤں پھسلا اور ہم تحت الثرے میں جا گرے۔ غرض راستے
ہی میں شام کی نماز ادا کی گئی۔ ہم کافی تیز چل رہے تھے۔ کیونکہ اُن کے
دل میں بھی جان کا خطرہ سمایا ہوا تھا۔ اور اگرچہ وہ تیز سفر کرنے اور ہر
وقت دوڑ دھوپ میں رہنے کے بہت زیادہ عادی تھے۔ لیکن آخر
انسان تھے اور باقی ماندہ پہاڑی مسافت سے غافل نہیں تھے۔ اس
لئے انہیں بھی ذرا قدم سنبھال کر ہی چلنا پڑتا تھا۔ رات کی تیرگی ہماری
قسمت کی سیاہی کی طرح چھا گئی۔ ابر نے اور بھی گھُپ اندھیرا کر دیا۔
چند فٹ کے فاصلے پر انسان کی شکل نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ راستے
میں جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ اس لئے انہیں بہت اندیشہ ہو گیا۔ کہ ہم کہیں
چھپ نہ جائیں۔ وہ ایک دوسرے کو بلاتے اور متنبہ کرتے جاتے
بار بار کہتے کہ خبردار کوئی چھپ جائے گا۔ اور ہم ڈھونڈ نہیں سکیں گے
بندوقوں کی نالیاں ہماری پشتوں کے ساتھ ملا دی گئیں۔ میں نے فرار
کے لئے موقع کی بہت تاک رکھی۔ لیکن کچھ بن نہ پڑا۔ میرا خیال تھا۔ کہ رات
کسی غار میں ہمیں ٹھہرائیں گے۔ اور ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر خود
آرام کریں گے۔ پھر شاید کوئی موقع فرار ہونے کا مل جائے گا۔ کیا معلوم
تھا۔ کہ یہ درندے دن کی روشنی سے اس طرح بھاگتے ہیں۔ جیسے
آفتاب سے چمگادڑ۔ اور ہماری قسمت میں ساری رات لگاتار تیز رفتار سفر
لکھا ہے۔

ہم لگاتار اُوپر اور اُوپر کی طرف چڑھتے ہوئے رات کے نو بجے کے قریب ایک بلند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ آسمان پر ابر اسوقت پھٹ گیا! اور پندرھویں رات کے چاند کی بھینی بھینی چاندنی بادلوں سے چھنتی ہوئی ہمارے پژمردہ چہروں پر پڑنے لگی۔ اردگرد کے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں چمک اٹھیں۔ اتنی لمبی دوڑ سے لیڈرے بھی تھک گئے تھے۔ اور بھوک سے ان کی انتیں قل ہواللہ پڑھ رہی تھیں اس لئے ستانے کے لیے اس مسطح چوٹی پر سب بیٹھ گئے۔

ان خوفناک پہاڑوں کے درمیان رات کے نو بجے عالم سنسان میں جبکہ دنیا و مافیہا آرام و استراحت کی تیاریوں میں مشغول ہے ہمارا نو آدمیوں کا گروہ ایک مسطح چٹان پر بیٹھا ہوا زمانہ کے انقلاب کا ایک عبرت ناک منظر پیش کر رہا ہے انکے دلی جذبات کا اندازہ لگانا اگرچہ رجم بالغیب ہے لیکن چنداں مشکل نہیں۔ چھ حاکم اور تین محکوم چھ آقا اور تین غلام۔ چھ پاسبان اور تین قیدی چھ بھیڑیئے اور تین بکریاں۔ چھ ایسے ہیں جن کے دل آئندہ کی خوشگوار امیدوں کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں۔ اور چہروں پر مسرت برس رہی ہے تین ایسے ہیں جنکے سامنے ایک غیر متعین مدت کے لیے مصیبتوں اور تکلیفوں کے دروازے کھلے نظر آرہے ہیں اور اپنے آقاؤں کی ضرب المثل بربریت کے تصور سے انکے چہرے کملا رہے ہیں غرض قسمت کی نیرنگیوں کا ایک طوفان در آغوش یہ چھوٹا سا گروہ چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے۔

لالہ سندر لال سے گٹھری لی گئی۔ اس میں گھوڑوں کی نہاری کا دو ڈیڑھ سیر گڑ بندھا ہوا تھا۔ یہ نو آدمیوں میں تقسیم کیا گیا۔ آدھ پاؤ کے قریب میرے حصہ میں آیا لیکن میری طبیعت رنج والم سے ایسی بھر رہی تھی کہ گڑ کی گنجائش باقی نہ تھی۔ اسلئے

میں نے مُلّا شکل رہبر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کو دیدیا جس نے ایک دو دفعہ کے اصرار کے بعد یہ کہہ کر لے لیا۔ کہ" اچھا امانت کے طور پر رکھ لیتا ہوں" ایک رہزن کے مُنہ سے" امانت" کا لفظ کیسی ستم ظریفی ہے۔

اس آدھ گھنٹہ کے اثنائے قیام میں چاند اپنا روشن چہرہ ابر کے گرد و غُبار سے دھو چکا تھا مطلع صاف ہو رہا تھا۔ اور تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ ہم اٹھے۔ انہوں نے انگڑائیاں لیں۔ جیسے چیتا کمین گاہ سے اُٹھ کر اپنی سُستی دُور کرنے کے لئے اکڑتا ہے۔ اور روانہ ہو گئے۔

اس وقت چاند دائیں جانب ذرا پیٹھ کی طرف جُھکا ہوا تھا۔ اور مشرق کی جانب چاند کی روشنی میں دُور سے ایک میدانی خطّہ نظر آ رہا تھا۔ اور میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ یہ لوگ پہاڑیوں میں گھُوم گھُوم کر اس خطّے کو بچا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی ایک میل کے فاصلہ پر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ جس سے اس میدان کی آبادیوں کے نزدیک ہونیکا پتہ ملتا تھا۔ ہم نیچے اُترنے لگے فراریوں کے چہروں پر سے نا امیدی کی جھلک جو پہلے نظر آتی تھی اب بہت دُور ہو چکی تھی۔ اور زیادہ آزادی سے گفتگو کرنے لگے تھے۔ گویا ہمارے لیجانے میں کامیابی کا انہیں زیادہ یقین ہو گیا تھا۔ راستے میں ہمارے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ بھی تھا اور جابرانہ بھی۔ آہستہ چلنے یا کسی مشتبہ حرکت کرنے پر بڑی سختی سے پیش آتے لیکن عام گفتگو نرمی سے کرتے اور آئندہ کے سبز باغ دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ ہم سے کہتے کہ اپنے گاؤں میں جا کر تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے گا۔ اور بڑی تواضع سے

رکھا جائے گا۔ اس پالیسی کا صرف یہ مطلب تھا۔ کہ ہم چلنے میں کوئی عذر نہ کریں۔ لیکن ہم جانتے تھے۔ کہ چلنے میں ذرا لیت ولعل کرنا سوائے اپنے سر پر خود سختی لینے کے کوئی نتیجہ نہیں رکھتا۔

اب ہمارے ساتھ سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا۔ کہ تم کون ہو۔ میں نے جواب دیا کہ میں بارک ماسٹری کا بابو ہوں میرے اس جواب پر ان کی آپس میں بات چیت شروع ہوئی۔ اور حاشیئے چڑھنے لگے۔ ایک نے کہا مجھے معلوم ہے۔ یہ سڑک کا بابو ہے۔ دوسرا بولا اس کا بڑا حکم اور بڑا اختیار ہے۔ اس نے مزدوروں کی بڑی تنخواہیں کھائی ہیں۔ اور بڑا ظلم کیا ہے تیسرے نے پوچھا یہ وہی ہے نا جس کی سفید گھوڑی تھی؟ چوتھا اس کی تصدیق مجھ سے کرانے لگا۔ ان کی اس گفتگو میں میں نے جلدی دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور صرف اس سوال پر میں نے اتنا جواب دیا۔ کہ میری کوئی گھوڑی نہیں۔ میں ابھی دو ماہ سے بنوں آیا ہوں۔ اس پر پھر اُن میں کسی پہلے بابو کی بابت سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا۔ راستے میں انہوں نے بہت ضبط سے کام لیا۔ اور ہمارا پورا پورا حال دریافت کرنیکی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ جو کہ ان کے خاصۂ طبع سے بہت دور تھا۔ البتہ یہ بھی درست ہے۔ کہ راستے میں گفتگو کا موقع انہیں بہت کم ملا۔

میرے پاؤں میں نئے فوجی بوٹ تھے جنہوں نے بارش سے بھیگنے اور کیچڑ سے بھاری ہو جانے کے سبب سے میرے پاؤں کو بہت محفوظ رکھا۔

لیکن لالہ سندر لال کے پاؤں کا حال سنیئے۔ ان کی پشاوری جوتی بھیگ کر لمبی ہوگئی۔ اور دُکھ دینے لگی۔ انہوں نے وہ جوتی ان میں سے ایک کو بدیں غرض پیش کر دی کہ انکے اپنے پاؤں زخمی ہو جائیں اور وہ چلنے کے قابل نہ رہیں۔ لالہ جی راستے میں اُن کی چپلیاں مانگ کر پہنتے رہے۔ اور وہ بھی خود ننگے پاؤں چلنا قبول کر کے دینے میں دریغ نہ کرتے۔

راستہ بہت چکر کاٹتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ دریافت کرنا کہ ہمارا اصلی مدعا کس طرف ہوگا مشکل تھا۔ سمت کی دریافت میں اب چاند میرے لئے کافی مشرق نما آلہ تھا۔ ستارے بھی مدد دے رہے تھے۔ لیکن ستاروں سے مجھے بہت تھوڑی واقفیت تھی۔ ہماری بے بسی پر ہماری بے کسی رو رہی تھی۔ زمانے کی نیرنگیوں کا خیال فرمائیں۔ اور اس کے انقلاب کا اندازہ لگائیں۔ اُف۔ زمانہ کی موافقت پر بھروسہ کرنے والو۔ دنیاوی جاہ و جلال پر غرور دکھانے والو۔ ان فلک زدوں کو نظرِ عبرت سے دیکھو۔ کیا چند گھنٹے پہلے یہ اسی کم بخت زمانے کے سلوک پر ناز نہ کرتے ہوں گے۔ اس ابلہ فریب نیلگوں آسمانی گردش سے یہ ناآشنا نہ ہوں گے۔ وہ لوگ جو ان کے نیچے مزدوری کرتے ہوں گے۔ اب ان کے مخدوم ہیں۔ وہ جانیں جو کبھی ان پر حکومت کرتی ہوں گی۔ اب محکوم ہیں ایک چند منٹ کے عرصہ میں کیا سے کیا ہوگیا۔
تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء۔

چاند اپنی پوری بلندی پر نہیں پہنچا۔ اونچی بلند پہاڑیوں کے سایہ میں دور تک چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں چھپی نظر آتی ہیں۔ آگے پیچھے دائیں بائیں جدھر دیکھیں خوفناک پہاڑ استادہ ہیں۔ گویا ہمارے رنج والم۔ اور عالم گرفتاری۔ اور قزاقوں کے ظلم و سیاہ کاری پر خاموشی کا پردہ ڈالے ہیں۔ سچ ہے قسمت جب بدلتی ہے تو سارا زمانہ بگڑ بیٹھتا ہے۔ اپنا اس وقت کا حال محتاج بیان نہیں۔ ناظرین ہمارے دلی اضطرار ہمارے اندرونی خیالات۔ ہماری بے کسی اور بے بسی کا خود اندازہ کر لیں۔ نیچے اترتے اوپر چڑھتے۔ دائیں اور بائیں چکر لگاتے ہم ایک برساتی نالے میں اتر گئے۔ اس کے شمال و مشرق کے کنارے کنارے ایک اونچا سلسلۂ کوہ عمودی چلا گیا ہے۔ اور مقابل کی سمت بے قاعدہ نشیب و فراز کی گھاٹیاں ہیں۔ تھوڑا تھوڑا پانی اس نالے میں چل رہا ہے۔ چونکہ یہ نالہ ایسی سمت سے آرہا ہے جدھر ہم کو لیجانا منظور ہے۔ اس لئے اس سے بہتر پوشیدہ اور آسان رستہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارا ایلغار اسمیں شروع ہو گیا۔ اور دور تک ہم اس پتھریلے نالے میں اوپر کی طرف چلے گئے۔ یہ نالہ چکر کھاتا جاتا ہے اس لئے کبھی ہم اس کے دائیں کنارے ہوتے ہیں۔ کبھی بائیں۔ کبھی گھاٹیوں کے اوپر سے ہو کر خط مستقیم میں جا کر پھر اسی میں اترتے ہیں۔ چند میلوں کا سفر طے کر کے ہم اس نالے سے بھی وداع ہوئے۔ اور شمال مشرق کی جانب پھر لگاتار پہاڑیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ پورے چاند کی چاندنی

خوب نکھری ہوئی ہے اور ہم چڑھتے اندھیرے میں ہیں اور اتنے روشنی میں۔ کوئی راستہ نہیں ہے جس پر ہم چلیں۔ کوئی نشان نہیں جس سے پتہ لگائیں۔ فراری لوگ بار بار ٹھیرتے ہیں۔ اور گرد و نواح کی پہاڑیوں سے راستے کا سراغ لگاتے ہیں۔ راستے کے بھول جانے کے نشان اُن کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ اور ایک دوسرے کو کوستے ہیں۔ ہمارا رہبر کہنے لگا کہ مجھے ابھی چار پانچ ماہ ہوئے اور میں راستے کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ اور تم اتنے سالوں کے ان جنگلوں میں پھرنے والے ہو کر بھٹکتے پھرتے ہو۔ اب ہر ایک اپنی رہبری کا ہنر دکھانے لگا۔ اُن کے بھٹک جانے سے ہمارے دلوں کو کچھ سہارا ہوا۔ اور خوشگوار امیدیں دل میں آنے لگیں۔ اب ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں ہمارے سامنے ایک گہرے غار کی دوسری طرف بلند پہاڑ ہے اس پہاڑ کو دیکھ کر یہ سب جھجک گئے۔ اِن کے ٹھٹکنے سے مجھے شک ہوا کہ یہاں ضرور آبادی ہوگی۔ اور ساتھ ہی ایک سفیدی سی نظر آئی۔ جس پر مجھے ایک گاؤں کا گمان ہوا۔ پھر آبادی کا علم حاصل کرنے کے لئے میں نے صفحہ زمین کو مطالعہ کرنا شروع کیا۔ پہاڑی چوٹیوں پر بھی بعض جگہ پتھریلی زمین آجاتی ہے۔ یہ ایسی ہی جگہ ہے جس پر عام گھاس اُگی ہوئی ہے۔ مویشیوں کا گوبر۔ بکریوں کی مینگنیں سیلی زمین میں کھروں کے نشان آدمیوں کے نقش قدم صاف ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ حضرت انسان سے یہ جگہ ضرور آباد ہے۔ فراری پیچھے پلٹے۔ اور قدرے خوف زدہ ہو کر

مشرق کا رُخ کیا۔ قریب ایک میل جا کر وہ بیٹھ گئے۔ اور اپنی متفقہ معلومات سے راستے کا پتہ لگانے لگے۔ اُن میں سے ایک نے کہا راستہ جس پر ہم جا رہے ہیں۔ شاہی خیل کا ہے۔ تم میرے پیچھے آجاؤ۔ اور یہ کہہ کر سب سے آگے ہو لیا۔ پہاڑیوں کے گرد گھومتے نیچے اترتے اوپر چڑھتے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے۔ جس سے سب کو یقین ہو گیا کہ راستہ مل گیا۔

اب نیچے نشیب میں ہمیں ایک اور نالا ملا جس میں ہم اتر پڑے۔ اُس میں پانی بہت تھوڑا سا ہے۔ اس لئے غالباً یہ پہلا نالہ نہیں ہے اب ہم اس نالہ میں ہوئے کچھ دور جا کر کتوں کے بھونکنے کی آواز دور سے ہمیں سنائی دی۔ اُس وقت ان کی احتیاط کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ یقیناً وہ اس خطرے کے مقام کو بخوبی جانتے ہیں۔ اُن کی بندوقوں کی نالیاں ہمارے کندھوں کے ساتھ بار بار چھو رہی ہیں۔ برہنہ خنجر انکے ہاتھوں میں ہیں۔ اور رہ رہ کر (سلوک سلوک زئی سلوک سلوک زئی) اُن کی زبان سے نکلتا ہے۔ یعنی جلدی چلو جلدی چلو۔ میرے بوٹ نالے کے گول پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر آواز پیدا کر رہے ہیں۔ جوں جوں ہم نزدیک ہوتے جاتے ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز بڑھی جاتی ہے آہ یہ کیسا بیم و امید کا وقت آپہنچا۔ کیا واقعی ہم آبادی کے پاس سے ہو کر گذر رہے ہیں۔ کیا کوئی متنفس بھی ہماری مدد کے لئے بیدار نہ ہو جائے گا۔ کیا چند سو قدم کے فاصلے پر مکانات نہیں نظر آرہے۔

کیا وہ پتھر پر کھڑا اُکتا بھونکتا دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا سامنے کے بلند پہاڑ سے مختلف جگہوں پر سے کتے بھونکنے شروع نہیں ہو گئے۔ کیا ہمارے بائیں ہاتھ والے بلند پہاڑ دور تک آباد نہیں چلے گئے۔ کیا ہمارے دائیں طرف پتھر کی دیوار سیدھی کھڑی نہیں ہے۔ جس طرف فراریوں کا بھاگنا ناممکن ہے۔ اُس جگہ کے لوگ اگر مدد کو آپہنچیں تو کیا انہیں کسی طرف بھاگنے کو راستہ رہتا ہے۔ کیا یہ خواب ہے یا بیداری نہیں یہ سب کچھ صحیح ہے۔ میں بیدار ہوں لیکن میری قسمت گہری نیند سو رہی ہے ؎

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ سایہ بھی جدا رہتا ہے تاریکی میں انساں سے

کیا اس آبادی کی طرف میں بھاگ سکتا ہوں یہ لوگ اپنی جان کے خوف سے مجھ پر کبھی فائر کرنے کی جرأت نہ کریں گے۔ لیکن کیا چمکتا خنجر جھٹ میرے پہلو میں گھونپ نہ دیا جائے گا۔ کیا مجھے دو قدم فاصلہ لینے کی فرصت مل سکتی ہے۔ نہیں خنجر عین میرے پہلو سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ موت و حیات کا فیصلہ کرنے کے لئے میرا کلیجہ اچھل رہا ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ نہ پورا موقع ہی ملتا ہے۔ اور نہ جرأت ہی باز رہنے دیتی ہے۔ بار بار اس ارادے سے آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔ سخت لہجے میں مجھے پاؤں کی آواز نہ نکالنے کے لئے حکم دیا گیا۔ جس کی تعمیل میں میں نے اتنی کوتاہی برتی جتنی حسب موقع برت سکتا

تھا۔ ہمارے بخت خوابیدہ کی طرح سوئی ہوئی آبادی میں سے ہم ایک میل تک گذرتے رہے۔ نالا اب ہمارے بائیں جانب رہ گیا۔ اور ہمیں اب اُس چڑھائی پر چڑھنا ہے۔ جس کا میلوں تک ارد گرد کوئی ہمسر نہیں ہے۔ نالے کو چھوڑ کر انہوں نے سیدھا اس بلند پہاڑ کا رُخ کیا۔ رات تقریباً نصف یا اس سے زیادہ گذر چکی ہے۔ یہ چڑھائی اس قسم کی نہیں ہے۔ کہ سلامی میں جاکر یا چکر لگا کر ہم چڑھیں۔ آسماں سے باتیں کرتی ہوئی سفید بادل کے ٹکڑوں میں سے سر نکالے ہوئے اونچی نوکدار چوٹی ہمارے سر پر نظر آرہی ہے۔ اور راستہ سیدھا اوپر کو چڑھنا ہے۔ تھوڑی چڑھائی چڑھنے پر ہمارے دائیں طرف ایک گہری آبشار ملی جسکا پانی بلندی سے گر گر کر سفید جھاگ لا رہا ہے۔ جس پر پورے چاند کی کرنیں پڑ کر موتیوں اور ہیروں کی چمک پیدا کر رہی ہیں۔ اس آبشار کا شور سنسان رات کی خموشی میں دور تک میٹھی سروں سے ایک سماں پیدا کر رہا ہے۔ اس کے کنارہ چند منٹ ہم بیٹھ کر چل دیئے آٹھ گھنٹے لگاتار ہم مسافت طے کر چکے ہیں۔ اور تخمیناً تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ میل زمین ہم قدموں سے ماپ چکے ہیں۔ تمام عمر میں اتنا بڑا سفر ہم نے کبھی نہ کیا ہوگا۔ دس پندرہ روز پہلے میں نے دوڑنے کی ورزش شروع کی تھی۔ اور جب کوئی پوچھتا۔ تو میں ہنسی سے کہتا کہ شاید کہیں فراری لوگ پکڑ کر لے جائیں۔ اِس لئے پہلے مشق اچھی ہے۔

میرا دل کسی قسم کی امید سے اب مبرّا ہو چکا ہے۔ سوائے اس کے

چارہ نہیں۔ کہ مشکل اور مصیبت سے خوگر ہو کر اپنے دل کو خوش رکھ جائے۔ اب وہ وقت ہے کہ لالہ سندر لال دم توڑ چکے ہیں۔ سانس اُن کے بدن میں نہیں سماتا۔ اور ٹانگیں چلنے سے جواب دے چکی ہیں۔ ذاربوں کے قدم بھی سست پڑ چکے ہیں۔ اور اُن میں مختلف درجے کی تکان کے باعث زیادہ زیادہ فاصلہ ہو گیا ہے۔ سب سے آگے ہمارا اُملا شکل رہبر ہے۔ جس کو وسیم گل کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ محبت کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن اُس کی گفتگو سے عیاری ٹپک رہی ہے میں اسکے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ باقی فراری لالہ سندر لال اور کوچبان کو لئے بہت پیچھے آ رہے ہیں۔ اور اُن کا کچھ کچھ آپس میں بھی فاصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے ملّا صاحب سے اب آزادی سے گفتگو شروع کی۔ بہت سی باتوں میں جن کا اعادہ باعثِ طوالت ہے۔ میں نے اپنی راستی اور سادگی کا نقش اس کے دل پر ضرور جمالیا! اور اسے یہاں تک اعتماد ہو گیا۔ کہ جب ہم سب سے آگے نکل گئے۔ تو اُس کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ رائفل سے کارتوس نکالا اور خالی رائفل مجھ کو پکڑا دی۔ اور دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ میرے دل میں بار بار جوش اٹھتا کہ بندوق کو نالی سے پکڑوں اور ملّا صاحب کا سر کندا مار کر پھوڑ دوں۔ خون میری رگوں میں دوڑ کر مجھے دیوانہ کئے ہوئے تھا۔ لیکن وہ بھی میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ جب وہ فارغ ہو کر اٹھا۔ تو میں نے اسے کہا۔ کہ اسے ایسی حرکت کسی قیدی سے نہیں کرنی چاہیئے۔ اور

اتنی جلدی اعتبار نہ کر لینا چاہیئے۔ جس کے جواب میں اُس نے کہا کہ مجھے تم پر کوئی شک نہیں رہا۔ راستہ میں مَیں نے اُس سے بہت دلیری سے گفتگو شروع کی۔ میں نے اس سے کہا۔ کہ حیف ہے میرے مرد ہونے پر میں تو عورتوں سے بدتر ہوں۔ ریوالور میری پاکٹ میں ہو۔ اور میں اس طرح بے بس ہو کر زندہ جان دوسرے کے ہاتھ میں دیدوں۔ اس کا جواب اُس نے یوں دیا۔ کہ تم نے بہت بہادری اور عقلمندی کی اگر تمہارا ہاتھ ذرا بھی جیب کی طرف سرکتا۔ تو تم بلاشبہ گولی کا نشانہ بن کر زمین پر لوٹتے ہوتے۔

ہمیں اوپر چڑھ کر جگہ بہ جگہ پس ماندوں کا انتظار کرنا پڑتا تا۔ لالہ سندرلال بہت تھک گئے ہیں۔ باوجود سخت دھمکیوں کے اور لگاتار اصرار کے اُن سے قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ بار بار مجھے آواز دیتے ہیں۔ کہ خدا کے واسطے انہیں آہستہ چلاؤ۔ میرے دم میں دم نہیں رہا۔ میں نے بھی وسیم گل سے آہستہ چلنے کی سفارش کی اور کہا کہ اگر تیز چلو گے تو لالہ صاحب کو منزلِ مقصود تک نہیں لے جا سکو گے۔ غرض ہم بادلوں کے درمیان سے گذرتے۔ آسمان پر چڑھتے ایسی چوٹیوں پر پہنچ گئے جس سے آگے نہ اتنی بلند چوٹی آتی ہے۔ اور نہ پیچھے گذر چکی ہے۔ فراری کہتے تھے کہ اس جگہ سب سے زیادہ بلند یہی پہاڑ ہے۔ وہاں سب اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے سب کو دم چڑھے ہوئے تھے۔ زمین پر چت لیٹ گئے۔ لالہ سندرلال ہانپ رہے تھے۔ میں نے اُن کو دبانا شروع کیا۔ اور ایک فراری سے

بھی کہا۔ وہ بھی انہیں دبانے لگا۔ اور اب ہم میں پھر گفتگو شروع ہوئی میں نے کہا کہ جس جگہ کتے بھونکتے تھے۔ اور آبادی بالکل قریب تھی۔ میں نے وہاں بھاگ نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ کیونکہ نہ تم بندوق چلا سکتے تھے۔ اور نہ پیچھے دوڑ سکتے تھے۔ میری اس بات نے اُن سب کے دلوں پر الٹا اثر کیا۔ چنانچہ اُن میں یک چشم جوش میں بولا۔ کہ اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دو۔ میں نے کہا۔ کہ میں ہاتھوں سے تھوڑا ہی بھاگنے لگا البتہ پاؤں باندھ دو تو اچھا ہو گا۔ وسیم گل نے جواب دیا یہ بڑا ہنس مکھ ہے۔ سارا راستہ اسی طرح کی باتیں کرتا آیا ہے ٭ انہی ایام میں مَیں نے ایک انگریزی ناول ختم کیا تھا۔ جس میں ایک ڈاکو کا حال تھا۔ اور اس نے اپنے گرفتار ہو جانے پر بجائے حواس باختہ ہونے کے گرفتار کنندگان سے تمسخر اور ٹھٹھا شروع کیا۔ اور اس طرح اُن کو غافل کر کے بھاگنے کا موقع نکال ہی لیا۔ وہ حکایت اب میرے خیال میں تھی۔ اور وہی پالیسی میں نے اختیار کر رکھی تھی۔ اُن کے تھک جانے پر میں ان سے مذاق کرتا۔ اور اپنے چہرہ سے کسی قسم کے گھبراہٹ کے آثار نہ ظاہر ہونے دیتا۔

کچھ دیر سستا لینے کے بعد ہم اٹھے اور اس بلند ترین پہاڑ سے اُترنا شروع کیا۔ اس اترائی میں مَیں نے قصداً بہت تیزی کی کیونکہ سوائے وسیم گل کے باقی آدمیوں کو میں نے تھکا ہوا پایا۔ میں چاہتا کہ کوئی موقع مل جائے۔ اور باقی دور رہ جائیں۔ تو میں اس کو کسی طرح زیر کر لوں۔

لیکن لالہ سندر لال بار بار آہستہ چلنے کی فرمائش کرتے جاتے تھے۔ اس لئے پھر مجھے مجبوراً اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ باقی کے قزاق بھی کچھ سست پڑ چکے تھے۔ اس لئے لالہ صاحب کی خواہش کے حامی معلوم ہوتے تھے۔ رات کے دو بج چکے تو میں نے نماز کی درخواست کی۔ وسیم گل نے کہا۔ کہ یہ اترائی اتر کر نماز ادا کریں گے۔ ہم ایک گھنٹہ سے زیادہ تک اترتے رہے۔ راستے میں وسیم گل نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا ساتھی کون ہے۔ میں نے کہا سندر لال ہے۔ اس نے پوچھا کام کیا کرتا ہے۔ میں نے جواب دیا ٹھیکہ دار ہے۔ یہ سُن کر وہ نہایت متعجب ہوا۔ اور حیرانی کے لہجے میں دریافت کیا۔ یہ خود سندر لال ہے یا اس کا بھائی۔ میں اس کی اس حالت سے سمجھ گیا۔ کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور ضرور یہ لوگ ہمارے لالہ صاحب کے پُرانے آشنا ہیں۔ لیکن اسوقت پردہ پوشی بالکل خلافِ مصلحت تھی۔ اس لئے میں نے تبلادیا۔ کہ یہ خود سندر لال ہے۔ اُس نے کہا کہ اس کے پیچھے تو بہت لوگ جانیں دے چکے ہیں۔ اس وقت اس نے باقی ساتھیوں کو مطلع کیا۔ اور ہر ایک نے اس خبر کو تعجب اور مسرت کے ساتھ سُنا۔ اسی جگہ راستے میں وسیم گل نے دوسروں سے پوشیدہ مجھ سے پوچھا۔ کہ تمہاری گھڑی جو میں نے چھین لی ہے کتنی قیمت کی ہے میں نے چیزوں کی قیمت کم تبلانے میں یہ مصلحت سمجھی کہ وہ ہمیں امیر نہ سمجھیں۔ اسلئے میں نے گھڑی کی قیمت ساڑھے چھ روپے بتائی۔ اُس نے کہا چونکہ اب یہ میرے حصے میں ہے۔ اس لئے اس کی قیمت دو اڑھائی روپے بتانا۔

اس کی یہ بات سن کر ایک بڑے حقارت آمیز طریق سے میں نے اُس سے کہا۔ کہ اگر میرا سر بھی کاٹا جائے تو بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ اگرچہ یہ الفاظ بلحاظ واقعات ریاکارانہ تھے لیکن میرے اس دلیرانہ جواب نے اس پر بہت اچھا اثر کیا۔ بجائے بُرا منانے کے اس نے میرے رویہ کی قدر کی۔

اب نماز خفتن کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ ہم ایک ریتلے سے نالے میں پہنچ گئے۔ وسیم گل نے اس کی ریت کو کھودا۔ اور دیکھ کر مجھے یقین دلایا۔ کہ تھوڑی دور چل کر اس میں پانی نکل آئے گا نصف میل چل کر اس نالے میں پانی بہنے لگا۔ وہاں ہم ٹھہر گئے۔ وسیم گل اور میں نے وضو کیا۔ لالہ سندر لال کو آرام دینے کی خاطر میں نے نماز میں دیر لگائی۔ آخر وسیم گل نے باقی پانچوں کو کہا۔ کہ تم لالہ سندر لال اور کوچبان کو لے کر چلو۔ ہم دونوں تیز چلنے والے ہیں۔ تم کو مل رہیں گے[1]۔ غرض کہ وہ روانہ ہو گئے اور ہم پیچھے رہ گئے۔ میرا ایک مقصد یعنی لالہ صاحب کے آرام لینے کا تو فوت ہو چکا ہے۔ اب یہ خیال باقی رہا کہ شاید اس طرح اکیلے رہنے سے میں ظالموں سے جاں بر ہو سکوں۔ وہ نصف میل کے قریب آگے چلے گئے ہوں گے۔ جب ہم روانہ ہوئے۔ وسیم گل مجھے کہتا ہے کہ تم آگے چلو۔ اور میں پیچھے ہی رہتا۔ اس نے مجھے دھمکایا لیکن میں نے جو بدیا۔

---

[1] وسیم گل کا یہ خیال اور پھر دوسروں کا ہمیں چھوڑ کر چلے جانا ان کی کمال جوانمردی اور دلاوری پر دال ہے اور شرم ہے ہمارے لئے کہ انہوں نے ہمیں ایسا کمزور خیال کر رکھا ہے۔ کہ ایک آدمی کو ہنکالیجانے اور غلامی کے طور پر آگے لگا لینے کے لئے وہ اپنے ایک معمولی سے آدمی کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔

کہ میں آگے کہاں جاسکتا ہوں۔ جبکہ مجھے راستہ بھی معلوم نہیں۔ شاید مجھ سے ڈر گئے ہو۔ یہ لفظ سن کر وہ دلیرانہ آگے ہولیا۔ ہمراہیوں کے پاس پہنچنے تک میں نے بھاگنے کا موقع ڈھونڈا۔ لیکن کوئی تدبیر بھی سمجھ میں نہ آئی۔ رات کے چار بجے کے قریب ہمارے سامنے ایک وسیع میدان کھلا اور پانی کے زور سے چلنے کی آواز کان میں پڑی۔ یہ کیتی کا نالا ہے۔ اب ہمارا راستہ اس نالے کے کنارے ہولیا ہے۔ اس کے دونوں کنارے پہاڑوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ بعض بعض جگہ فصلیں لہرا رہی ہیں۔ یکایک ہمارا راستہ بڑا خطرناک ہوگیا۔ ہمارے دائیں طرف کیتی کا دریا سیلاب میں آیا ہوا ہے۔ اور بالکل عمودی بلکہ پانی کی طرف جھکی ہوئی دیوار کے سر پر ہم چل رہے ہیں۔ اور تیس۳۰ چالیس۴۰ فٹ کی گہرائی پر پانی زور شور سے بہہ رہا ہے۔ ہمارا راستہ ڈیڑھ فٹ سے کسی جگہ زیادہ نہ ہوگا۔ اگر ذرا بھی دایاں پاؤں پھسلے تو جان کی خیر نہیں۔

یہ ایک خداداد موقع تھا۔ جس سے فائدہ اٹھانے کی مجھ سے جرأت نہ ہوسکی۔ اگر میں وسیم گل کو نیچے گہرائی میں دھکیل دیتا۔ تو اسکے ساتھیوں کو خبر ہونے سے پہلے میں جھاڑیوں میں چھپ چکا ہوتا۔ اور اغلب یہی تھا کہ بچ نکلتا۔ اس موقع کی یاد سے اب بھی دماغ کو خون چڑھ جاتا ہے اور پھر اپنے اوپر حیف آتا ہے۔ میں نے ناول والے ڈاکو کی نقل کر کے موقعہ تو پیدا کر لیا۔ لیکن افسوس اس جیسی جرأت نہ پیدا کرسکا۔

اب ہم ساتھیوں سے ملکر ان سے بھی دو اڑھائی سو قدم آگے نکل گئے۔

ہمارے بائیں جانب کی پہاڑیوں پہ مرزنی کی گھنی جھاڑیاں ہیں۔ جن میں ہم بارہا ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس خطرناک راستہ پہ ہم چار پانچ میل تک چلنے کے بعد نالے کے آباد اور سرسبز کنارہ پر پہنچ گئے۔ جہاں کھیت لہلہا رہے تھے۔ اور جس کے درمیان سے اب ہمارا راستہ جا رہا تھا۔

باب سوم

رہائی

آزاد کر دے مجھ کو او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

چاند کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ ستارے ایک ایک کر کے ہمارا ساتھ چھوڑنے لگے۔ مرغان سحر نے ہمارے خیر مقدم میں نواسنجی شروع کی۔ مہتاب نے اپنی پرانی چادر لپیٹ لی۔ اور اس کی جگہ آفتاب نے چمکدار نورانی جامہ دنیا کو پہنانا شروع کیا۔ ہر ایک چیز اجنبیت کے رنگ میں رنگی دکھائی دینے لگی۔ گویا اس ایک رات کے سفر نے ہمیں دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔ ایسا عالم جس کے تمام راز ابھی ہم سے مخفی ہیں۔ ہاں باد سحر

دونوں عالموں میں پیغام رسانی کر رہی ہے۔ اور اس کے ٹھنڈے مست کر دینے والے جھونکے کچھ پیغامِ وطن لا رہے ہیں۔ مرغانِ سحر کے چہچہے ان کی رنگا رنگ سریلی آوازیں اس محویت کو بڑھانے میں مدد دے رہی ہیں۔ ہمارے عزیز دوست ہمارے پیارے اقارب بستر استراحت پر میٹھی نیند کے مزے لے کر اٹھے ہوں گے۔ اس سے بالکل بے خبر کہ اپنے پاک خدا کے آگے سر جھکاتے ہوئے اپنے ایک عزیز خان ماں سے دور فاقہ سے بدحال تکان سے چور مسافر کے لئے حرفِ دعا زبان سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ وطن کی دلآرام اور پیاری شکلیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ ؎

دیکھ کر غربت میں ہر سو عالم افسردگی
یاد آتی ہے مجھے رنگینیٔ صبحِ وطن

صبح کے اس حسرت انگیز سین اور ارد گرد کے ایسے رنج افزا منظروں میں ہمارا نو آدمیوں کا گروہ کینتو دریا کے کنارے جا رہا ہے۔ اور یہ گفتگو شروع ہے۔

وسیم گل۔ سندر لال یہ ختک کون ہے۔ کچھ مال و دولت رکھتا ہے یا نہیں۔

سندر لال۔ یہ ٹمٹم چلانے والا مزدور ہے۔ اس کی پانچ روپے ماہوار تنخواہ ہے۔ اور میں اسے جانتا ہوں۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔

وسیم گل (مجھ سے)، کیوں بابو سچ بتانا تم جھوٹ نہیں بولتے۔ اس ختک سے ہمیں کچھ فائدہ ہونے کی امید ہے یا نہیں۔

مَیں۔ مَیں اگر کہوں کہ میں اسے جانتا ہوں۔ تو غلط ہے۔ سوائے اس کے کہ تُم کا مالک نہیں نوکر ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ اگر تم اسے لے گئے تو سوائے اس کے کہ یہ پانچ یا چھ ماہ تم سے روٹی کھائے اور پھر تمہیں اس کو چھوڑ دینا یا مار ڈالنا پڑے۔ اور کچھ نہ ہوگا۔

خوِنے۔ اسے لے چلو پانچ چھ سو روپیہ تو ضرور اس سے مل ہی رہیگا۔

مَدامیر۔ خٹک کا تیرا کوئی بھائی بہن۔ ماں باپ ہے یا نہیں۔ کہ تمہیں ہیں مار ڈالیں؟

خٹک۔ میرا بھائی یا ماں باپ نہیں۔

مَدامیر۔ پھر تمہیں ماردیں؟

خٹک۔ چُپ رہا۔

گُل قدم۔ اس ڈوس کو لے چلو۔ جب اس کے دانت توڑے جائیں گے تو پھر یہ مانے گا۔

لالہ سُندر لال۔ مارنے سے تمہیں کیا فائدہ۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ صرف پانچ روپے اس کی تنخواہ ہے۔ نہ عورت ہے نہ بال بچہ خدمت کر کے گذارہ کرتا ہے۔

مَیں۔ آخر مسلمان تو ہے۔

مَدامیر۔ ہمیں مسلمانی نہیں چاہیئے۔ ہمیں روپیہ چاہیئے۔

چاند کی چاندنی پر صبح کی سفیدی غالب آگئی۔ لالہ سندر لال بہت بیتاب ہو گئے۔ اور بے اختیار ہو ہو کر پوچھتے۔ کہ ابھی کہاں تک جانا ہے۔

وہ کسی نزدیک پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے تسلّی دیتے کہ بس اس کی دوسری جانب منزلِ مقصود ہے۔ راستے میں وسیم گل مجھے بار بار کہتا کہ میں کبھی مسافت سے نہیں تھکا۔ لیکن بھوک مجھے بہت کمزور کر دیتی ہے۔ اب بھوک سے میں بدحال ہو رہا ہوں۔ اُس نے راستے میں بار بار بھوک کی شکایت کی۔ اور کہا کہ جلدی چلو۔ فلاں پہاڑی کے سر پر ہمارے فراریوں کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں پہنچ کر کچھ کھانے کو مل جائے گا۔ میں نے اُسے جتایا تم نے کل پیشیں کے وقت کا کھایا ہے۔ اور رات کو تمہیں نہیں ملا۔ ہماری طرف دیکھو کہ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔ اور کل سارا دن اور آج کی ساری رات بھوک اور سفر میں گذری ہے۔ افسوس کہ میں نہیں جانتا۔ کہ میری یہ شیخی گویا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ میں جتنی دیر اُن کے پاس رہا وہ میری تیز رفتاری اور جسمانی طاقت کے مدّاح رہے اور اس لیئے میری حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔

اب صبح ہو گئی وہ خطرے کے مقاموں سے دور نکل گئے ہیں۔ اُن کی بادشاہی اب قریب آ گئی ہے۔ صبح کی نماز میں نے اور وسیم گل نے ادا کی۔ اُس نماز میں اُن میں سے ایک اور بھی ہمارا شریک ہو گیا ہم پر ظاہر کیا گیا کہ اب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ مشورہ کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ خٹک غریب ہے اسے چھوڑ دو۔

وسیم گل۔ خٹکا ہم تمہیں چھوڑتے ہیں۔

خٹک۔ مہربانی۔

ختنے۔ میری سلوار پھٹی ہوئی ہے۔ یہ لے لو اور اپنی اتار دو۔ ختنک نے اپنی سلوار اتار دی اور ایک پھٹی پرانی دقیانوسی چھوٹی سی سلوار اس سے لے لی۔

مدّامیر۔ میرے پاس دوسری قمیص نہیں ہے۔ ختکا یہ قمیص مجھے دیدے۔

مدّے۔ آخر یہ مسلمان ہے اس کے ساتھ اتنا ظلم نہ کرو۔

گل قدم۔ مسلمان ہے تو گھر سے اسے روپیہ دے دو۔ ختکا یہ پگڑی مجھے دے دے (بیچارے ختنک نے وہ بھی دے دی)

میں۔ اگر تم اسے چھوڑتے ہو۔ تو چند باتیں اس کے ساتھ ہیں پوشیدہ طور پر کر لینے دو۔

وسیم گل۔ نہیں ہمارے سامنے کرو۔ چنانچہ میں نے اور لالہ سندر لال نے مفصلہ ذیل پیغام اس کو دئیے۔ ہمارے پکڑے جانے کا حال بارک ماسٹر صاحب سے کہنا۔ راستے کی تکلیفوں اور ہمارے حال کو اچھی طرح بیان کرنا۔ ہمارے دوستوں سے کہنا کہ ہمارے گھروں میں خبر کردیں۔ میں نے اُسے ایک کاغذ لکھ کر دینے کی اجازت مانگی۔ پر نہ ملی۔ ختنک سے ہیں بڑے تپاک کے ساتھ ملا۔ اس سے علیحدہ ہوتے وقت جو حالت اضطراب کی ہم پر گذری صرف ایک دردو بھرا اور مصیبت زدہ دل اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کی پشت پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور ایک آہ بھر کر زبانِ حال سے کہا ؎

خبر ما بہ سانید مرغانِ چمن   کہ ہم آوازِ شما در قفسے افتادہ است

ملّا امیر نے آہستہ سے خنک کو کچھ دُور لے جا کر راستہ بتایا اور روانہ کیا۔ اور ساتھ ہی یہ لفظ بھی اس سے کہے کہ جا کر کہہ دینا دُو دُو تین تین ہزار روپیہ لئے بغیر ہم نہیں چھوڑیں گے۔ یہ کابلی روپیہ سے مراد تھی۔ اور ان لفظوں کو مبالغہ کے لہجے میں سمجھ کر ہمارے دل کو قدرے تسلّی ہوئی لیکن کیا معلوم ان کی طینتیں اور دل کس پلید مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ خنک روانہ ہوا تو اُس پر یہ ظاہر کیا گیا۔ کہ اپنے گاؤں کے قریب پہنچ کر انہوں نے اسے چھوڑا ہے۔" تاکہ ان عقابوں کے بلند آشیانوں کا پتہ صحیح نہ معلوم ہو جائے۔

خنک کی رہائی کے مقام سے ڈیڑھ گھنٹہ آگے چلکر ہم جناب امیر صاحب والی سلطنت کابل کی سرحد میں داخل ہوئے۔ یہاں پہلی آبادی جو ہمیں نظر آئی وہ فراریوں کے ہم پیشہ بھائی بندوں کا ایک گاؤں ہے جو چھپروں اور جھونپڑوں کی صورت میں دریائے کینو کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ اس میں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس گاؤں کے قریب ایک مدوّرا اور مخروطی پہاڑی کے سر پر ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ جس کی چھت گری ہوئی ہے۔ اور نہایت ردّی اور کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا دروازہ موٹی دیواریں نیچی چھت صاف ظاہر کر رہی ہے۔ کہ یہ رہنے یا آرام کرنے کی خاطر نہیں بنایا گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا۔ کہ ہم ایسے بدنصیب قیدیوں کی جائے سکونت ہے۔ یہ پہلا نظارہ تھا۔ جسے دیکھ کر میرا دل کانپ گیا۔ یہاں پر ہمیں ایک

اونٹوں کی قطار نالے سے گذرتی ہوئی ملی۔ جو شاید بنوں کو جا رہے تھے۔
لالہ صاحب نے پشتو میں اُن کے مالکوں کو سلام کیا۔ اور کہا۔ تم ہم
قیدیوں کا حال کیا جانو۔ یہ فقرہ اس درد سے کہا گیا۔ کہ پتھر کو بھی موم کر
دیتا۔ لیکن انہوں نے ایک تبسّم کے انداز سے دیکھا اور ہنس کر چلدئے۔
یہاں پر اس وقت پہاڑیوں کا نہایت دلکش نظارہ تھا۔ ہم اکثر جگہ
بادلوں سے ہو کر گذرتے تھے۔ ہم دیکھتے تھے۔ کہ ہمارے اوپر
تھوڑی اُونچائی پر بادلوں کے ٹکڑے چل رہے ہیں۔ جب اُن کے
اندر پہنچتے تو گویا ایک دھوئیں جیسے میں داخل ہوتے۔ اور بھیگ جاتے
باوجود دل کی سخت پریشانی کے ہیں ان کوہستانی نظاروں کا لطف
اٹھانا گیا۔ اس گاؤں کے قریب نالے کو ہم دو دفعہ عبور کر کے ایک
چھوٹی سی مسجد میں پہنچے۔ یہاں سب فراری اپنی کوششوں کا صلہ دیکھنے کے
لئے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک ملّا امیر نامی درمیان بیٹھ گیا۔ سارا مال
اسباب اُس کے آگے جمع کر کے رکھا گیا۔ ہم ایک کونے میں دبکے
سردی سے کپکپاتے قسمت کا بدلا ہوا رنگ دیکھ رہے تھے لالہ سندر لال
نے گرفتار ہوتے ہی اپنے زائد کپڑے ان کے حوالے کر دئیے تھے۔
میرے کپڑے میرے بدن پر تھے۔ اپنا اسباب اس طرح اپنی آنکھوں
کے سامنے تقسیم ہوتے دیکھنا عجب حسرت بھرا نظارہ تھا۔ چھوٹی سی کچی
مسجد جس کے تین طرف دیوار اور ایک طرف کھلی تھی۔ پندرہ فٹ لمبی اور
دس فٹ چوڑی ہو گی۔ اس کے آگے ایک چھوٹا سا صحن دو فٹ بلندی کی

کچی دیوار سے گھرا تھا۔ جس میں ایک بڑا پرانا درخت توت کا کھڑا تھا مسجد کے شمال کی طرف پہاڑ اور جنوب کی طرف نالا بہتا تھا۔ جس کی فراخی کے باعث اس میں گندم کی فصلیں کھڑی تھیں۔ اس فصل میں ایک پٹھان یوم (بیلچہ) ہاتھ میں لئے اور اس کے دستہ پر ٹھوڑی کو سہارا دئے ہمارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہمارے اسباب کا کھویا جانا اتنا قابل تاسف نہ تھا جس قدر ہماری آنکھوں کے سامنے اُس کا اس طرح آپس میں بانٹا جانا حسرت انگیز تھا۔ گویا اپنی بے بسی اور بے اختیاری مجسم کو ہم سامنے دیکھ رہے تھے اور اپنی گردش روزگار کا تماشہ عبرت کی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے

کپڑے ہمارے تن کے کھرکی ہیں اک نشانی   مضراب تار غم ہیں اور یاد عیش فانی
جب قید ہو کے ظالم ہم ہو چکے ہیں تیرے   پھر بال و پر ہمارے کیوں نوچنے کی ٹھانی

ہماری چیزوں کی قیمتیں ہم سے پوچھی جاتی تھیں مصلحتاً چیزوں کی قیمتیں ہم تھوڑی بیان کرتے۔ میں کھیس اوڑھے اور لالہ سندر لال دری لئے ایک کونے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ سندر لال کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور رونے کی آواز نکل گئی۔ انہوں نے سبب پوچھا۔ لالہ سندر لال صاحب نے بڑی دانائی کی۔ ان کی اس وقت کی عقل کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فرمایا کہ جس کی جیبیں ہمیشہ روپے سے بھری رہتی ہوں جس کے اردگرد ہر وقت نوکر رہتے ہوں۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ تک چھوڑ خود جیب ہی نہ رہے۔ اور کوئی یار نظر نہ آتا ہو۔ وہ کس طرح نہ روئے۔ تم خدا کے واسطے ایک روپیہ بالو کو اور ایک مجھے دے دو ہم خرچ نہیں

کریں گے۔ وہ بھی تمہارے ہی ہوں گے۔ اس تقریر سے دو ایک کے
دل میں رحم آیا۔ اور انہوں نے آٹھ آنے لالہ صاحب کو عنایت کئے
کہ اپنے پاس رکھو۔ لالہ صاحب کا خیال تھا کہ شاید اس آٹھ آنے سے
کبھی بیسیوں روپے کا کام نکل آئے۔

چیزیں سب تقسیم ہو چکیں۔ تقریباً نیلام کا طریقہ تھا۔ پہلے چیز کی قیمت مقرر
کی جاتی۔ پھر آواز ہوتی کون لیتا ہے۔ جو پہلے "ہاں" بول اٹھتا اس کا مال ہوتا۔
اگرچہ اس وقت آپس میں بہت جھگڑتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی
چیز پر اعتراض کرتے لیکن تقسیم کرنے والا بڑا سخت مزاج تھا۔ اور بڑی
کرخت آواز سے فیصلہ کرتا جسے خواہ مخواہ انہیں منظور ہی کرنا پڑتا۔ اس
کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ ساری چیزوں کا ذرا ذرا حساب زبانی رکھتا۔ اور
ہر ایک کی رقوم بغیر چیزوں کے دیکھے گن دیتا۔ ہماری چیزیں تقسیم ہو چکیں۔
میری انگلی میں ایک سونے کی انگشتری تھی۔ جو میرے ایک دوست کی
نشانی تھی۔ میں نے خود ہی اپنی انگلی سے نکال کر ان کو دکھائی۔ اور کہا یہ
میرے ایک دوست کی نشانی ہے۔ میں اس شرط پر تم سے اس کو اپنے
پاس رکھنے کی اجازت مانگتا ہوں۔ کہ اس کی قیمت تمہیں ادا کر دونگا۔ مدّا میر
نے نہایت تندی سے جھپٹ کر انگشتری مجھ سے چھین لی۔ لالہ سندر لال
سے قیمت پوچھی اور بولی دینے لگا۔ اس وقت ایک حیرت اور استعجاب میں
ڈال دینے والا نظارہ پیش آیا۔ چپٹے چہرے والا ادھیڑ عمر کا ذاری جس کی
ایک آنکھ کانی تھی۔ نام مدّے تھا۔ اور جس کے چہرے پر استغنا اور

سادگی برس رہی تھی۔ متانت اور سنجیدگی کے دیوتا کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک عجب اندازِ شرافت سے تحکمانہ لہجہ میں صرف چار لفظ ادا کیے "انگوٹھی اس کو واپس دے دو"۔

اس کے اس طرزِ ادا۔ اور اس سنجیدگی سے کھڑے ہو کر ایسا مطالبہ کرنے سے سب فراری خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ مدامیر نے اپنے رفیق کے اس بلند ترین معیارِ اخلاق کے مظاہرہ کو اپنے لیے باعثِ ہتک سمجھا۔ اور غصہ اور غضب میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں فلسفیانہ جواب یوں دیا۔ کہ "یہ ہمارا بھائی بند نہیں۔ قریبی نہیں۔ دوست نہیں۔ کس بنا پر اس سے رعایت کر کے انگوٹھی واپس دی جائے"۔ مدے نے جسے اب بجائے رفیق کے اس کا حریف کہنا زیادہ موزوں ہے سنجیدگی کے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ کہ ہمارا شیوہ نہیں کہ اپنے گھر پہنچ کر "بندیوں" کے تن بدن سے چیزیں اتار ہی جائیں۔ گرفتاری کے وقت جو کچھ ہو چکا سو ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے جسم سے ہم کوئی چیز نہیں اتار سکتے۔ ہم[۱] نے فلاں ہندو کو گرفتار کیا تھا۔ اور اس کی طلائی بالیاں ہم نے آخر تک اسی کے پاس رہنے دی تھیں۔ ہمیں اپنے معیار سے گرنا نہ چاہیئے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ انگوٹھی واپس دیدو۔

مدامیر نے اپنے حریف کے تیور بدلے ہوئے دیکھے۔ تو وہ بھی جھٹ کھڑا ہو گیا۔ بیک وقت دونوں کے ہاتھ ہیش قبضوں پر تھے۔ اور

---

[۱] ناظرین کو یاد ہو گا کہ اس شرافت کے پتلے نے خنک کے کپڑے اتارتے وقت بھی احتجاج کیا تھا۔ اور غالباً یہ رنج بھی اس کے دل میں اثر کر رہا ہو گا۔

ایک لمحہ میں دو آبدار خنجر دو ہاتھوں میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔

معزز ناظرین میں اس واقعہ کو جس رنگ میں آج یعنی ان حالات کی دوسری ایڈیشن کے وقت دیکھ رہا ہوں۔ اس رنگ میں اپنی دردناک مصیبت کے فوراً بعد نہیں دیکھ سکتا تھا۔ واقعات وہی ہیں لیکن نظریہ اب مختلف ہے۔ قزاقوں کے بھیس میں مدے کو میں انگریزی ناولوں کے فرضی نائیٹوں (Knights) سے بڑھ کر بہادر اور شریف ہستی سمجھتا ہوں۔ مدے اپنے گاؤں کا مقبول ترین رکن ہے۔ وہ سخی ہے۔ گاؤں کے نادار لوگوں کی مالی امداد کرتا ہے۔ اکثر فراری اس کے مقروض ہیں اور قرض بھی حسنہ ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باعث اس کی طاقتوں میں فرق آچکا ہے۔ لیکن وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ اس کی بہادری پر کوئی حرف گیری کر سکے۔ وہ خطرہ میں سب سے آگے رہنا پسند کرتا ہے۔ ڈاکہ میں شمولیت محض اس لحاظ سے ہے۔ کہ اس کی بہادری پر حرف نہ آئے۔ ورنہ جہانتک میرا تجربہ ہے وہ زر فدیہ سے بے نیاز ہے۔ قیدیوں کی ایذادہی میں اس نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ اگر لیا ہے تو ان کو بچانے کے لئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری رہائی کے وقت جبکہ گاؤں کا ہر ایک متنفس غصہ۔ انتقام اور مایوسی کی آگ میں دیوانہ وار جل رہا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ صرف مدے کا درد آشنا دل ہی تسکین اور راحت محسوس کر رہا ہوگا۔ اب ان حالات کی روشنی میں موجودہ واقعہ کو ملاحظہ فرما کر اس کی فطرت کا اندازہ لگائیں۔

غرض جب فریقین کو میں نے برہنہ خنجر تولے ہوئے برسر پیکار دیکھا تو

۵۶ - ا

”اور ایک لمحہ میں دو آبدار خنجر دو ہاتھوں میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے“

”...مدے کا رویہ مدامیر کو مرعوب کرنے کے مترادف تھا...“ ص ۹۱

"اور مدامیر فزاریوں میں شاید آخری شخص ہوگا جو مرعوب ہو سکتا" ص۶۱

(آنکھوں کے نیچے سرمہ کا حلقہ ملاحظہ ہو)

میرا دل دہل گیا۔ اس چیلنج کا انجام کچھ بھی ہو۔ بانی میں ہی سمجھا جاؤں گا۔ اور فوری انتقام مجھ سے لیا جائے گا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نتیجہ کا منتظر تھا۔ انگشتری کو پاس رکھنے کی درخواست اب میں واپس نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ درخواست مدے کی درخواست بن چکی تھی۔ میں کوئی دخل دینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

مدّے کا رد یہ مدّا امیر کو مرعوب کرنے کے مترادف تھا۔ اور مدّا امیر شاید فزاریوں میں آخری شخص ہو گا جو مرعوب ہو سکتا۔ اس نے نہایت فیصلہ کن الفاظ میں جواب دیا۔ کہ "انگوٹھی واپس نہیں دی جائے گی"۔

مدّے نے جو کہ غصہ رنج اور شرافت کی اندرونی کشمکش کے باوجود سکون کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ پھر اسی مؤثر لہجہ میں کہا۔ کہ دیکھو اگر شیوہ کا احترام تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ تو پھر تم میری ضمانت پر انگوٹھی اسے واپس کر دو۔ یہ ایسا مدلل مطالبہ تھا جس کی وجہ سے دوسرے فزاریوں کو بھی بیچ بچاؤ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور مدّا امیر کے پاس بھی اب کوئی دلیل سوائے ہٹ دھرمی کے نہ رہی۔ سب نے مدّے کی ضمانت پر انگوٹھی واپس دینے کی تائید کی۔ اور مدّا امیر نے ایک خشمگین نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور انگوٹھی میری طرف پھینک دی۔ اس طرح یہ معاملہ "وسلے بخیر گذشت" ہو گیا۔

جو کھیس میں سردی کی وجہ سے اس وقت اوڑھے ہوئے تھا۔ وہ نیلام میں مدے کے حصہ آیا تھا لیکن وہ میرے پاس ہی رہا اور مدّے نے کبھی جتایا تک بھی نہیں تھا۔ جب مجھے اس کی ضرورت نہ رہی تب اس

نے واپس لیا۔

اب اسباب کی تقسیم ہو چکی ہے۔ سب اٹھے ہیں۔ اور وسیم گل پھر سب سے آگے ہو لیا ہے۔ وہ بھوک سے بیتاب ہو رہا ہے۔ اُسے مجھ پر بہت بھروسہ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ کارتوس سے بھرا ہوا پستول اس نے مجھے دے دیا۔ میں نے پوچھا کہ تمہیں مجھ پر اتنا اعتبار ہے۔ کہ بھرا ہوا پستول دشمن کے ہاتھ میں دیتے ہو۔ اس نے جواب دیا مجھے یقین ہے۔ کہ اگر تم مجھے مارو گے تو بچ کر تم بھی نکل نہیں سکتے۔

اگرچہ وہ گاؤں جس میں ہمیں جانا ہے۔ اسی کیتو کے کنارے پر واقع ہے۔ لیکن اس جگہ یہ دریا بہت پیچ و خم کھاتا ہے۔ اس لئے اسے چھوڑ کر وہ سیدھے شمال کی جانب پہاڑیوں کے بیچ میں سے ہو لئے۔ ہمارے دائیں طرف دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک قلعہ کھڑا ہے۔ وسیم گل سے میں نے اُس کی بابت دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ امیر صاحب کا سرحدی قلعہ ہے۔ بہت دیر سے غیر آباد پڑا تھا۔ اب سپاہی اسے قابلِ سکونت بنا رہے ہیں۔ اور چند روز میں آباد ہو جائے گا۔ دو تین میل کی مسافت کے بعد ہم ایک اور گاؤں کے عین پاس سے مغرب کی طرف ہو کر گذرے ان گاؤں والوں کو انہوں نے پشتو زبان میں السلام علیکم کہی۔ انہوں نے مجھے ذرا بھی تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ البتہ وسیم گل کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اُس گاؤں کا نام بندی کلی ہے۔

صبح کے ساڑھے نو بجنے کو ہیں۔ ہم اس گاؤں کے قریب پہنچ گئے

"اس گاؤں کا نظارہ جس طرح میری آنکھوں میں پہلے پہل گذرا ناقابلِ بیان ہے۔" ص ۹۳

ہیں جس میں ہماری قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں پہلی آواز جو میرے کان میں پڑی وہ ایک مرغے کی بانگ تھی۔ جس نے بڑے تپاک سے بار بار ہمارا خیر مقدم بلند آواز سے کیا۔ اس گاؤں کا نظارہ جس طرح پہلے پہل میری آنکھوں کے سامنے گذرا۔ ناقابل بیان ہے۔ ایک نیچی ہموار اور مسطح پہاڑی پر خانہ بدوش قوموں کی طرح چھپروں کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کی معمول سے زیادہ پختگی اور باقاعدگی صاف ظاہر کر رہی ہے۔ کہ یہاں رہنے والوں کا منشاء یہ نہیں ہے۔ کہ چند روز رہ کر چلے جائیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غربت کے باعث انہی مکانات پر انہیں قانع ہونا پڑا ہے۔

ہم گاؤں میں جنوب مشرقی جانب سے داخل ہوئے۔ اور جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے وسیم گل کا چھپر اسی کونہ میں بنا ہوا ہے۔ وہ سیدھا مجھے اسی قفس نما چھپر میں لے گیا۔ اس کا طول چھ گز اور عرض چار گز کے قریب تھا۔ اُس کی جنوبی دیوار میں ایک چھوٹا سا کھلا حصہ ڈھائی فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا دروازہ کا کام دیتا تھا۔ باقی چاروں طرف سے بند تھا۔ چھپر کے عین وسط میں لکڑی کا ایک ستون چھت کو سہارا دیئے کھڑا تھا۔ دھوئیں کی وجہ سے چھت اور دیواریں سیہ ہو رہی تھیں۔ چھپر کے شمال مشرقی کونے میں ایک چارپائی بچھ رہی تھی۔ جس کے قریب پتھروں کے چولھے میں آگ سُلگ رہی تھی۔ چھپر کے دروازہ پر ایک فربہ اندام سرخ و سفید رنگ بلند قد جوان عورت نے مسکراتے ہوئے پشتو میں وسیم گل کا خیر مقدم کیا۔

وسیم گل نے ایک فاخرانہ تبسم سے جواب دیا۔ اور فاتحانہ شان سے مجھے ہمراہ لئے محل میں داخل ہوگیا۔ اس کے اشارہ سے اُس چارپائی پر ایک چٹائی ڈالی گئی۔ اور وسیم گل نے بڑی خندہ پیشانی اور رحم دلی کے ساتھ مجھے کہا کہ اس پر آرام کرو۔ میں منہ سر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ چھپر جا بجا بارش کی وجہ سے ٹپک رہا تھا۔ اور خاصکر چارپائی پر خوب بوندیں پڑ رہی تھیں۔ چند منٹ میں چھپر عورتوں کے ہجوم سے بھر گیا۔ جو مسرت سے قہقہے لگا کر ہنستی تھیں۔ وسیم گل کی شکل اب تھیٹر کے مسخرے کی سی بن گئی۔

عورتوں کے ہجوم میں بیٹھا ہوا وہ ہر طرف سے مبارکبادیں لے رہا تھا۔ جن کا جواب وہ ایک عجیب انداز ظرافت میں دے رہا تھا۔ وہ مصنوعی متانت پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن فرط انبساط اور کامیابی کے جذبات کی وجہ سے اس کے چہرہ پر شرارت اور مسخراپن رہ رہ کر ٹپک رہا تھا۔ حتیٰ کہ شدت اشتہا کو بھی فراموش کئے ہوئے تھا۔

عورتیں کم ہونے لگیں اور ان کی جگہ مرد آنے لگے۔ مردوں کے چہروں سے کوئی غیر معمولی علامات ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ البتہ ان کی نگاہوں سے میری طرف غرور اور نخوت کے آثار ٹپک رہے تھے۔ انہوں نے وسیم گل سے پوچھا یہ کون ہے۔ وسیم گل نے ایسی مسرت میں جس سے بے پروائی کی بو آرہی ہو اور جیسے کوئی ڈھور ڈنگر کا ذکر کر رہا ہو جواب دیا۔ "یہ بابو ہے"۔ اس اثنا میں لالہ سندر لال مع اپنے ہمراہیوں کے پہنچے۔ وہ تھکان سے چور پاؤں سے زخمی چھپر کے باہر زمین پر گر پڑے۔ ان کی ظاہرا

حالت مجھ سے بدرجہا خراب تھی۔ نیز مجھے پھر بھی مسلمان ہونے سے دل میں کچھ سہارا تھا۔ ان کے دل کی حالت کو کون پوچھے۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمت پر انہوں نے آتے ہی عورتوں سے بے تکلفانہ گفتگو شروع کر دی۔ گویا اُن سے پہلے ہی آشنا تھے۔

لالہ سندر لال اس وقت مسکرا رہے تھے۔ اور اپنی گرفتاری اور قید کے خیالات کو نہ معلوم کن خوشگوار امیدوں سے چھپائے ہوئے تھے۔ ہمارے دل کی بیقراری ہماری حالت یاس ہماری بے کسی اس وقت کون خیال میں لا سکتا ہے۔ عورتیں ہیں تو ہماری گرفتاری پر مبارکباد دے رہی اور قہقہے لگا رہی ہیں۔ مرد ہیں تو خون کی پیاسی نگاہوں سے ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ وسیم گل کی تقریر سے اس قدر لاؤبالی پائی جاتی تھی گویا وہ اپنی کسی بھیڑ بکری کا ذکر کر رہا ہے۔ ہم دو غریب الوطن بے یار و غمخوار اُنکے رحم اور قہر پر منحصر بیٹھے ہیں۔ ہماری آہیں اندر ہی اٹھتی ہیں۔ اور اندر ہی سرد ہو جاتی ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اپنا وطن یاد آیا۔ اپنے والد بزرگوار اور اپنی پیاری ماں کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی میری گرفتاری کی خبر سننے پر ان کی جو حالت ہونے والی ہے اس کو بار بار سوچتا ہوں۔ ؏

ہاں وطن میں کس طرح اس ماں کے دل کو چین ہو
شامِ غربت نے چھپایا جس کا نور العین ہو

میری آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ اور اپنے غم کی طرح

انہیں پی جاتا ہوں۔ اپنا وطن اپنے دوست اپنے عزیز واقارب خواب و خیال کی طرح یاد آتے ہیں۔ ان چھپروں کا مقابلہ اپنے گھروں سے کرتا ہوں۔ اور خونخوار درندوں کو اپنے وطن کے مہذب اور شائستہ لوگوں سے ملاتا ہوں۔ اور اس قید اور بے بسی کو اپنی پہلی آزادی اور خود مختاری کے سامنے لاتا ہوں۔ اور ایک رات کے وقفہ میں جو تغیر ہماری زندگی میں پیدا ہو گیا ہے اسے سوچتا ہوں۔ ع

اے فلک تیرے کرشموں کا عجب انداز ہے
کل جو سر تھا آسماں پر خاک کا انباز ہے

غرض ان کی مہار کیا دیں ان کے قہقہے۔ ان کی نگاہیں ہمارے زخمی دلوں پر نمک پاشی کا کام کر رہی تھیں۔

کچھ ابلے ہوئے چاول تیار تھے۔ مٹی کے برتن میں ڈال کر مجھ سے کھانے کو کہا گیا۔ ہر چند طبیعت غم سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن بھوک سے بھی جاں بلب ہو رہا تھا۔ میں نے چاولوں کو خوب سیر ہو کر کھایا۔ لالہ سندر لال کو مدتے یک چشم اپنے گھر لے گیا۔ چونکہ لالہ صاحب بہت تھکے ہوئے تھے۔ اور مدتے اور اس کی بیوی دونوں رحمدل تھے۔ اس لئے وہ اُن سے باخلاق پیش آئے۔ اُن کو کھانے کیلئے دودھ۔ گڑ اور روٹی مل گئی۔

ہمارا پہلا دن جس بیقراری اور اضطراب میں گزرا۔ اس کا اندازہ ناظرین خود لگا سکتے ہیں۔ ظہر تک میرا وقت خونخواروں کے چہروں کے مطالعہ اور انکی گفتگو سے انکے رویہ کا اندازہ لگانے میں گذر گیا۔ ظہر کے وقت میں نے مسجد میں بیباکانہ طور پر چند ایک خیالات کا

اظہار کیا۔ ان کی قزاقانہ تجاویز میں ان کا ہمنوا ہو کر یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ آیا وہ مجھے اپنے اندر جذب کر کے اپنے ہاں آزاد رہنے دے سکتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے بظاہر میرے خیالات کو بغور سنا لیکن جو جواب انہوں نے مجھے دیئے وہ نہایت ہمت شکن اور مایوس کن تھے۔ اس لئے میں نے اپنا رویّہ بدل دیا۔

عصر کے وقت وسیم گل مجھ سے کہنے لگا کہ آؤ تمہیں باہر لے جاؤں۔ گاؤں کے جنوب کی طرف ایک اور بارانی نالا خشک پڑا ہوا تھا۔ اس طرف مجھے لے گیا۔ حسن اتفاق سے اس میں اس وقت سیلاب آگیا اور بڑے زور سے پانی کا شور دور سے سنائی دیا۔ پانی سانپ کی طرح لوٹتا برف سی جھاگ چھوڑتا آرہا تھا۔ اور سر پر خس و خاشاک پتھر اور لکڑیوں کے ٹکڑے تیرتے تھے۔ اتے لڑتے جھگڑتے آرہے تھے۔ اس پانی کے کنارے مجھ کو وہ لے کر بیٹھ گیا۔ طرح طرح سے مجھے ڈراتا دھمکاتا۔ دوسروں کی سختی اپنی رحمدلی اور مجبوری دکھاتا رہا۔ میں اسے صاف طور پر کہتا کہ یاد رکھو میں کبھی تم سے جھوٹ نہ بولوں گا۔ جو کچھ بھی میری جائداد ہے۔ اور جو کچھ بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں سب دینے کو تیار ہوں۔ لیکن میری درخواست ہے کہ تم جب تک مجھ سے ناامید نہ ہو جاؤ۔ مجھے تکالیف اور بےعزتی سے بچائے رکھو۔

وسیم گل کا یہ حال تھا کہ اسے مفرور ہوئے ابھی چار پانچ ماہ ہوئے تھے۔ تین سال کی قید کا حکم اسے اور مغل کو میراں شاہ میں ملا تھا۔ اور بنوں جیل خانے کی طرف ان کو لیجا رہے تھے۔ راستے میں عیدک کی حوالات

توڑ کر بھاگ نکلے۔ ننگے حوالات توڑنے کا ذکر بھی ایسی کتاب میں پُر لطف
ہوتا۔ لیکن بخوفِ طوالت قلم انداز کیا جاتا ہے۔ اسے ابھی تک امید تھی کہ
شاید میرا جرم بخش دیا جائے۔ اور سرکار مجھے معاف کر کے واپس بلا لے۔
حسنِ اتفاق کہئے یا میری بدقسمتی کہ وہ مجھے ایک بااختیار افسر خیال کر رہا
تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ پولیٹیکل محکمہ میں میری سفارش اس کے سب جرائم کی معافی
دلا کر اس کو پھر وطن میں آزادی دلا دے گی۔ اس لئے وہ حسن سلوک سے
مجھے ممنون بنانا چاہتا تھا۔ وسیم گل ایک پکا نمازی۔ قرآن شریف باقاعدہ پڑھنے
والا مہینہ وظیفے کرنے والا تھا۔ مگر دغا باز جھوٹی قسمیں کھانے والا۔ دوستی
کے لباس میں فریب دینے والا۔ بددیانت اور حد درجہ کا شیطان تھا۔ وہ
کسی کا سچا دوست نہ تھا۔ بڑا استاد اور بڑا زود فہم دقیقہ رس تھا۔ وہ ہندوستان
میں کراچی و بمبئی۔ اجمیر اور مختلف مقامات کی ہوا کھا چکا تھا۔ اس کی بیوی شاید
اسی کے ہاتھ سے قتل ہو چکی تھی۔ اور اب یہ مغل کی بہن کے ساتھ شادی
کرنے کی امید میں مغل کے ساتھ ایک ہی چھپر میں رہتا تھا۔ اس کے یہ
خواص اس کے ہمراہیوں پر بھی خوب روشن تھے۔

کوئی آدھ گھنٹہ وسیم گل نالا پر گفتگو میرے ساتھ کرتا رہا اور پھر واپس لے آیا۔

اس سے کم درجے پر محتاط نوتے خنا۔ یہ اپنی نو عمری میں استقدر بہادر
اور ایسا ہوشیار تھا کہ میں اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ بڑا ہو کر یہ ایک مشہور ڈاکو بنیگا۔
لیکن افسوس اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ اور ہمارا بھاگ نکلنا اس کی موت کا
باعث ہوا۔ یہ کم گو مستقل مزاج۔ لیکن زود رنج بڑا دلیر۔ خوف و خطر میں سب

سے آگے رہنے والا۔ اپنے مطلب کی بات پر جھٹ یقین کرنیوالا جہاں نواز نوجوان تھا۔ وہ تمسخر کیا کرتا تھا۔ لیکن آواز نکال کر یا قہقہہ لگا کر کبھی نہ ہنستا۔ لافیں مارنے اپنی تعریف کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کا اسے اشتیاق نہ تھا۔ وہ عملی آدمی تھا۔ لیکن کسی کے ساتھ اس کی گہری دوستی نہ تھی۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور اپنی بوڑھی ماں اور جوان بدصورت بھاوج کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کی بھاوج کے خاوند یعنی خوسنے کے بھائی کو مرے دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اس کا ایک اور فاقہ مست بھائی عملدا داسی گاؤں میں بسر اوقات کرتا تھا۔

مغلم جس کو میں "زنانہ مزاج" کا لقب دے چکا ہوں وحشی اور بے سمجھ تھا۔ اس کی اپنی رائے کوئی نہ تھی۔ وسیم گل جس طرح کہتا یہ مانتا۔ اور جو کچھ وہ چاہتا یہ کرتا۔ مغلم مجلسوں میں رائے دینے یا اپنا آپ دکھانے سے پرہیز کرتا۔ وہ کسی مجلس میں بلائے بھی نہ جاتا۔ اس کے مزاج میں بڑی ضد تھی لیکن تاہم وہ ہر دلعزیز تھا۔ اور باقی لوگ اس کو اچھے لفظوں سے یاد کرتے۔ مغلم کی ایک بیس بائیس سالہ بہن تھی۔ اس کا خاوند دیوانہ ہو گیا تھا اور بہن اب بھائی کے پاس رہتی تھی۔ خاوند سے طلاق دلوا کر اس کا بھائی بہن کو کسی اور کے پاس بیچ دے گا۔ اس عورت کا نام نیکنا مے تھا۔ یہ بڑی جوان دراز قد مضبوط اور فربہ اندام تھی۔ خدا اس کو جزائے خیر دے اس نے میرے ساتھ بہت احسانات کئے۔ جن کا میں ممنون رہونگا۔ ہمارا ایک چشم مدے اُس گاؤں کے دو متمول آدمیوں میں شمار کیا

جاتا تھا۔ اور دولت مند اور معمر ہونے کی وجہ سے دوسرے اس کی قدر کرتے۔ وہ منکسر المزاج۔ مہمان نواز اور رحمدل تھا۔ لیکن بہت سادہ لوح تھا۔ اس کی رائے کی اگر قدر ہوتی۔ تو صرف اس کے متموّل اور محسن ہونے کی وجہ سے۔ لیکن وہ خود اپنی قدر پہچانتا تھا۔ اور کبھی کسی معاملہ میں بیجا دخل نہ دیتا۔ وہ اپنی سنگدلی کی بہت سی حکایات سُناتا۔ اور اپنی طبیعت کے بدل جانے کا سبب یہ بیان کرتا۔ کہ ایک روز اس نے ایک مسلمان کو بے گناہ نماز میں کھڑے گولی کا نشانہ بنایا۔ جس کے چند روز بعد اسکی آنکھ بیٹھ گئی۔ اس واقعہ سے بہت رقیق القلب ہوگیا۔ تاہم ذرا سا جوش بھی اس رقیق القلب سے نہایت بیرحمی کا کام کرا سکتا ہے۔ اس کی ایک خوبصورت نوجوان بیوی تھی۔ جسے یہ بہت چاہتا تھا۔ اور اکثر مجھے فخر کے سلجے میں کہا کرتا۔ کہ میں اس پر عاشق ہوگیا۔ اور چھ سو روپے پر میں نے اسے خریدا تھا۔ پٹھانوں میں عورتوں کے بیچنے کا عام دستور ہے۔ خواہ وہ علاقہ انگلشیہ میں ہوں یا کسی اور جگہ۔ بلکہ بغیر قیمت کے لڑکی دینا وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ جتنا بڑا خاندانی ہو۔ اتنی ہی زیادہ قیمت وہ لڑکی پر لیتا ہے۔ غرض کہ اس کی بیوی بھی رحمدل اور نیک طینت تھی۔ اور اللہ نے یہ اچھی جوڑی ملائی تھی۔ اُن کا ایک چار سالہ لڑکا اور ایک آٹھ نو سال کی لڑکی تھی۔ اس لڑکی کو بھی اس نے چھ سو روپے میں ایک پچیس سالہ جوان کے ہاتھ بیچ رکھا تھا۔ اس کا نام ایلا دار تھا۔ جس کا ذکر کبھی آگے آئے گا۔ یہ چار فراری تھے جن کے خصائل میں نے بیان کئے ہیں۔ باقی کے دو فراری

خوست میں رہتے تھے۔ اور ان سے ملنے کا اتفاق ہمیں صرف دو تین دفعہ ہی ہوا۔

آج رات کو سونے کے لئے مجھے چارپائی ملی۔ بارش کی وجہ سے سردی بہت تھی۔ لحاف بھی اوڑھنے کو مل گیا۔ کوئی زنجیر یا کاٹھ ہم کو نہیں مارا گیا۔ لالہ سندر لال صاحب کو تو قدرت نے خود کاٹھ[1] مار رکھا تھا۔ اُن کے پاؤں سوج گئے تھے۔ ان کو مالش کے لئے گھی دیا گیا۔ اتنے لمبے غیر معمولی سفر سے ہمارے جسم کی ہڈیاں درد کرتی تھیں۔ ہم کروٹ بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ اُن کے کپڑوں میں جوؤں کی اتنی کثرت تھی کہ وہی لوگ خیال کر سکتے ہیں جو ان کی بود و باش سے واقف ہیں۔ اُن کی ورثہ میں میرے خیال میں باپ دادا کے کپڑے بھی جاتے ہوں گے۔ نہ تو وہ کپڑوں کو کبھی دھوتے ہیں۔ جہاں سے پھٹ گیا جس رنگ کی دھجی مل گئی تھوپ دی۔ میرے ناظرین نے اس قوم کے اکثر اشخاص کو سردیوں کے موسم میں کپڑے اتارے دھوپ میں بیٹھے جوئیں مارتے دیکھا ہوگا۔ اس لئے زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔

---

[1] کاٹھ ایک بھاری شہتیر ہوتا ہے۔ جس میں اتنا بڑا سوراخ کرتے ہیں۔ کہ پاؤں بڑی مشکل سے اندر گھس سکے۔ پھر پنڈلی کے ساتھ ایک خانہ دوسرے سوراخ سے لگا دیتے ہیں جس سے پنڈلی قابو آجاتی ہے۔ اور آدمی ایک ہی پہلو پڑا رہتا ہے۔ ۱۲۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیران قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

۲۵ اپریل ۱۹۱۰ء کی شام ہو گئی۔ لیکن میں سیدگی نہ پہنچا۔ چونکہ نوکر کو کھانے کی تیاری کے لئے میں پہلے اطلاع دے چکا تھا۔ اس لئے اسے تردد ہوا۔ اس نے بذریعہ تار عیدک سے دریافت کیا۔ وہاں سے کوئی پتہ نہ ملا۔ پھر میراں شاہ سے پوچھ بھیجا۔ انہوں نے کہا یہاں سے سندر لال اور محمد اکرم دونوں چلے گئے ہیں۔ نوکر کو فکر ہوئی لیکن کیا کر سکتا تھا۔ اس نے دلکو یوں تسلی دے لی کہ غالباً ہم عیدک گاؤں میں ٹھہر گئے ہیں اس لئے خاموش ہو رہا۔ ۲۶ اپریل کی صبح کے نو بجے تک ہماری کسی نے خبر لی۔ نہ کسی کو خیال آیا۔ سچ ہے مسافرت میں کون کسی کو جانتا ہے۔ اتفاقاً ہمارے گیریسن انجینئر صاحب اس روز ضروری ٹانگے پر میراں شاہ سے بنوں تشریف لیجا رہے تھے۔ انہوں نے ٹم ٹم راستے میں کھڑی دیکھی اور گھوڑے بھی پاس ہی بندھے مل گئے۔ کچھ شک گذرا کھجوری پوسٹ میں پہنچ کر انہوں نے

رپورٹ کی اور دریافت کے بعد ہمارے غائب ہو جانے کا حال کھلا۔ بنّوں میں میرے ایک نہایت ہی مہربان دوست ملک عبد الرحیم نام گورنمنٹ ٹیلیگراف آفس میں ٹیلیگرافسٹ تھے۔ انہوں نے خبر پاتے ہی جھٹ گوجرانوالے ہمارے گھر تار دیدیا۔ اور لالہ سندر لال کے ایک مشفق نے ان کے ہاں لون میانی میں اطلاع کر دی۔

بنوں میں سید اللہ داد شاہ صاحب اوورسیئر میرے ایک روشناس تھے۔ انہوں نے صرف اخوت اسلامی نہیں بلکہ رشتہ انسانی کے باعث ہم دونوں کی رہائی کے لئے بہت کوشش کی اپنے افسروں کے پاس پہنچ کر اُن سے معقول اور مدلل گفتگو سے مدد طلب کی۔ اور وقت مال۔ اور تکلیف سے مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ میرے بھائی صاحب اور میرے والد بزرگوار یکے بعد دیگرے بنّوں پہنچ کر آپ کے مکان پر ہی ٹھہرتے رہے۔

لالہ سندر لال کے گھر والوں کو جب خبر ملی۔ تو انہوں نے کچھ پروا نہ کی ان کے دو بھائی ہیں۔ لالہ مول چند و لالہ لچھمن داس۔ والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر پر تھا۔ لالہ سندر لال صاحب فرماتے ہیں۔ کہ جب میری گرفتاری کی خبر گھر پہنچی تو اُن کے بھائی نے بازار میں کھڑے ہو کر معمولی سادگی سے کہا کہ ہم روپیہ کہاں سے لائیں۔ وہ اپنا حصہ کھا چکا ہے۔ ہم سمجھیں گے کہ پہلے بھائی کی طرح یہ بھی مرگیا۔ غرض اس خبر کے پہنچنے کے بہت دن بعد لالہ سندر لال کا ایک بھائی بنوں آیا۔ اور یہی کوشش کی کہ جس طرح ہو سکے بغیر روپے

کے رہائی ہو جائے۔ میرے بعد جو کچھ میرے گھر والوں پر گذری اور جو تدابیر وہ عمل میں لائے ان کا تذکرہ جناب قبلہ گاہی نے کتاب کے آخیر میں خود کر دیا ہے۔

ہم پھر اپنی داستان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دوسرے روز بھی آسمان ابر آلود تھا۔ اور بارش بھی خاصی ہوئی اسی دن سے اُنھوں نے اپنی روش مہمان نوازی کی مہمان کشی سے بدل ڈالی۔ ہمارے خشک لبوں کی سی بے رس مکی جوار کی روٹی ہماری خوراک بنی۔ اور قہر آلود نگاہیں ہماری تسلی کا ذریعہ ہوئیں۔ اس روز ان فراریوں کے ساتھ مَیں مجمعؔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ بارش موسلادھار پڑ رہی تھی۔ مجمع کا چھپر جا بجا ٹپک رہا تھا چلم کا دور چل رہا تھا۔ لالہ سندر لال صاحب اپنے چھپر میں پاؤں پکڑے بیٹھے تھے۔ کیونکہ وہ فراریوں کے ساتھ عام خلط ملط سے مصلحتاً پرہیز کرتے تھے۔ اتنے میں دو مسلح آدمی دوڑتے ہوئے بارش سے پناہ لینے کے لئے اُدھر آنکلے۔ اور بے تکلف مجمع میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اس طریق سے السلام علیکم کی جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ ان لوگوں سے ناآشنا نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ڈھلی ہوئی عمر کا معمولی دیہاتی لباس میں ملبوس تھا۔ البتہ اس کی نگاہوں سے مقابلتاً ادب و شائستگی کے آثار ظاہر تھے۔ دوسرا جوان پشاوری وضع کی لنگی سر پر باندھے ہوئے اور ایک سیاہ بانات کا چھوٹا سا کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ جس پر سرخ لیس لگی ہوئی تھی اس کے چہرہ سے تواضع اور تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ یہ دونوں

ؔ چوپال

نووارد آکر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اُن کی گفتگو سے معلوم کر لیا
کہ یہ امیر صاحب کی دولت کے سپاہی ہیں۔ میں نے جوان سے دریافت
کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ خاص کابلی ہے۔ اور فارسی اسے اچھی طرح آتی ہے
مَیں نے اس سے فارسی میں گفتگو شروع کر دی۔ باتوں باتوں میں مَیں
نے اسے اپنا مختصر حال بتا دیا۔ اور اس طرز سے گفتگو کی جس سے مدد
کی تمنا پائی جائے۔ لیکن اس نے مجھے صاف طور پر جتا دیا کہ وہ کسی طرح
بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔ تاہم میں اس کی خوئے نیک کی تعریف کروں گا۔
کیونکہ وہ بہت شیریں کلامی سے میرے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ اور جو کچھ اس
نے مجھے بتایا صاف اور سچ تھا۔ اس نے مجھ سے بیان کیا کہ تمہارے
پکڑے جانے کی رپورٹ ہو چکی ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ میں اپنے
افسر سے تمہارے بارہ میں کچھ کہوں۔ لیکن وہ بھی کچھ نہ کر سکے گا۔ اور یہ
لوگ تمہیں بہت ایذا دیں گے۔ اس گفتگو نے مجھے سکتہ کے عالم میں
ڈال دیا۔ اور میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ امیر صاحب
کے علاقہ میں ہم کبھی علانیہ قید نہیں رکھے جا سکتے۔ جب کبھی سرکاری افسروں
تک خبر پہنچے گی تو ضرور ہمیں چھڑا لیں گے۔ لیکن اس مکالمہ نے مجھے
محوِ حیرت بنا دیا۔ مَیں نے اس سپاہی سے ایک شریفانہ دوستی کا وعدہ
لیا۔ اور اس کا نام پوچھا۔ اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد اپنا نام
امام الدین ظاہر کیا۔ اور رخصت ہوتے وقت مجھے بہت تسلی دی اور ایک
پھول بطور یادداشت دیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ اُس نے ان لوگوں سے میری

کوئی شکایت نہ کی۔ البتہ دوسرے ادھیڑ عمر نے اُن کو کچھ شبہ میں ڈال دیا! اس پر ہمارے صیاد مجھ سے بہت بُری طرح پیش آئے۔ اور مجھے حکم دیا کہ کسی غیر شخص کے ساتھ آئندہ میں کوئی گفتگو نہ کروں۔

اسی دن عصر کے وقت خونے۔ گل قدم اور ایک اور آدمی ایک بھاری درخت کے تنے کو مشکل سے اٹھائے ہوئے لا رہے تھے۔ جسے دیکھ کر ہمارا لہو خشک ہو گیا۔ کیونکہ یہ ہمارے پاؤں کا زیور کاٹھ تھا۔

اب رات چھا گئی آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ تاریکی کے باعث دائیں کو بایاں نہیں سوجھتا۔ کالی رات۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ چاروں طرف پہاڑوں کی بلندیاں۔ یہ حالات دل میں ایک ہلکی سی امنگ نظروں سے غائب ہو کر بھاگ نکلنے کی پیدا کر رہے تھے۔ آٹھ دس فراری ہمیں لئے اس مجمع میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی وحشیانہ ڈینگیں ہانک رہے تھے۔ اُن کے کندھوں پر بندوقیں اور کمر میں کارتوس بندھے ہوئے تھے۔ میں اور لالہ سندر لال یاس و حرمان پر تکیہ لگائے اپنی قسمت کا انجام سوچ رہے تھے ہمیں ڈرانے اور رعب بٹھانے کی خاطر سخت خونخواری کا سلسلہ گفتگو شروع کر رکھا تھا۔ پرانے قیدیوں کے مُردے اکھاڑ رہے تھے۔ جو اُنکے دستِ ظلم سے اپنی زاد و بوم خویش و اقربا دوست و آشنا کے دیدار سے ناامید ہو کر اسی پتھریلی مٹی میں ہمیشہ کے لئے سو رہے تھے لالہ سندر لال اُن کے بیان کی تائید کرتے جاتے تھے۔ کیونکہ عرصہ دراز سے اسطرف مقیم ہونے کے باعث وہ بہت سے واڑوں قسمت قیدیوں کے حالات

سے آشنا تھے۔ میرے چہرہ کی رنگت میری تیرہ بختی کی طرح بدل رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے میں بہت متاثر ہو رہا تھا اور اپنے نامعلوم انجام پر ایک کمزور اور ڈگمگاتی نظر ڈال رہا تھا۔ مرغ نو گرفتار کی طرح دل پہلو میں پھڑک رہا تھا بار بار۔ دیوانہ وار ولولے اٹھتے کہ رات کی سیاہی میں چھپ کر اپنی قسمت آزمائی کروں۔ لیکن جاؤں تو کدھر جاؤں۔ چھپوں تو کہاں چھپوں۔ اگر آئیو الا ستہ لوں تو یقینی موت کے منہ میں پڑوں۔ غائبانہ ادگرد کی پہاڑیوں میں گھومتا اور نقشے دل میں جماتا تھا۔ یہ ایک بیہودہ جنون تھا۔ جس کا انجام صرف خوفناک مرگ تھا۔

رات بہت گذر گئی۔ ہمارے داروغہ صاحب اٹھے اور اپنے اپنے وارڈ میں ہمیں لے گئے۔ لالہ سندر لال کو قدرت نے خود ہی زنجیر میں جکڑ رکھا تھا۔ یعنی اُن کے پاؤں سوجکر چند قدم چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے چھپر میں لیجا کر زمین پر سونے کا اشارہ کیا پتھریلی زمین پر جس سے پتھر کی نوکیں نکلی ہوئی تھیں صبر و شکر کا بستر بچھا۔ ہاتھ کا تکیہ لگا کر میں لیٹ گیا۔ درخت کا وہ تنہ میرے پاؤں کے پاس رکھا گیا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت کیا تھی۔

گرم عذاب نمائی بدرد داغ وجدائی
شکنجہ تاب ندارم بریز خونم و رستی

اس لکڑی میں ایک سوراخ تھا۔ جس میں میرا پاؤں بڑی مشکل کے ساتھ ڈالا گیا۔ اور پھر اوپر سے ایک فانہ لگا دیا گیا۔ جس سے بالکل میری پنڈلی جکڑی گئی۔

میرا بھی اتنے لمبے سفر کی تھکان کے بعد حال یہ تھا کہ ٹانگیں اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ اور اگر وہ ابھی چند روز کاٹھ نہ پہناتے تو بھاگنے کی طاقت مجھ میں نہ تھی۔ میں نے بہت احتجاج کیا اور کہا کہ ؏

ذرا دم لینے دو ٹھہرو بھلا ایسی ہے کیا جلدی
ابھی ہم آپ ہی ماندے تھکے آئے ہیں منزل کے

ارباب بصیرت کے لئے اس وقت مجھے ایک قصہ یاد آیا ہے۔ جب میں انٹرنس پاس کر کے لاہور انجینئرنگ کلاس میں داخل ہوا تو میرے بھائی صاحب مشن کالج ایم۔اے کلاس میں تعلیم پاتے تھے۔ اور میں اکثر بورڈنگ ہاؤس نیوٹن ہال میں ان کے پاس رہا کرتا تھا۔ ایکروز ایک صاحب نے مذاقیہ باہر سے دروازہ کی زنجیر لگا دی۔ ایک دو منٹ میں میرا دل ایسا گھبرایا کہ میں چلا اٹھا اور دوڑ کر دروازے کے شیشے توڑنے لگا۔ میری اس بے صبری پر وہ بہت متعجب ہوئے۔ اب وہی میں ہوں اور وہی میرا نازک دل ہے۔ خاک کے بستر کی کچھ پروا نہیں بدن کے زخمی ہونے کا کچھ اندیشہ نہیں۔ افسوس میری آزادی چھن گئی۔ اور چھنی بھی تو کیسی کہ کروٹ نہیں بدل سکتا۔ جو کچھ میرے دل پر گذری زبان کو طاقت بیان نہیں۔ پسوؤں نے بھی مجھ پر رحم نہ کھایا۔ بندھا ہوا دیکھ کر دل کی خوب ہوس نکالی۔ وہ رات ماہی بے آب کی طرح دو بجے تک میں نے بسر کی ؏

کباب سیخ ہیں لیکن پڑے ہیں ایک پہلو پر
مزا کیا گر بچالیں جان کو ہم کروٹیں لے کر

"Leg in stock and head on stone."

page 91

عالمِ خاموشی میں لیٹا۔ والدین کی بیقراری کا نظارہ دیکھ رہا تھا خصوصاً والدہ صاحبہ کے تو سُن کر ہوش اڑ گئے ہوں گے۔ اپنے پیارے فرزند کی گرفتاری کا صدمہ ان کو کس طرح بیقرار کئے ہو گا۔ آخر بیتابی دل سے نہ رہا گیا۔ ایک ہی پہلو نکیلے پتھروں پر لیٹے جسم دکھنے لگا۔ اور بیقراری سے تڑپ کر حلق سے بسمل کے کراہنے کی مانند آواز نکل گئی۔ بیتاب ہو کر آخر دسیم گل کو جو کہ پاس ہی چارپائی پہ سو رہا تھا۔ ہلایا اور کاٹھ سے پاؤں نکالنے کی التجا کی۔ وہ بہت جھنجلایا۔ اور غصہ سے کروٹ بدل کر دوسری طرف رُخ پھیر لیا۔

غل نہ کر مرغ قفس سوتا ہے صیاد ابھی
کون سنتا ہے ترا نالہ و فریاد ابھی

صیاد کی اس سنگدلی اور اپنی اس بے بسی پہ دل تمام رات مُرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہا۔

شب تا بہ سحر خفتہ بہ خلوت گہے نازے
بے خوابیٔ آں دیدۂ بیدار چہ دانی

آخر صبح کے قریب اُس نے چھپر سے باہر سر نکالا۔ اُس کے سر نکالتے ہی کُتے بھونکنے لگے۔ پھر وہ واپس آیا اور کاٹھ اتار دیا۔ سر نکالنے سے غالباً کتوں کی بیداری کا اندازہ مدِنظر تھا۔

اس گاؤں میں چالیس سے زیادہ جوان تھے۔ لیکن نماز پڑھنے کے وقت عموماً سات آٹھ جمع ہوتے۔ باقاعدہ نماز پڑھنے والے دو چار آدمی بمشکل ہوں گے۔ گاؤں سے چند قدم کے فاصلے پہ ایک معمولی سے چھپر کی مسجد بنی ہوئی تھی۔ لیکن نماز عموماً نالائیتی ہی میں پڑھتے تھے۔ وہاں بھی

پتھروں کے نشان رکھ کر ایک چھوٹی سی مسجد بنا رکھی تھی۔ جب تک میں کھلا رہا فراری ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک لمحہ کا بھی بھروسہ نہ کرتے چنانچہ اس امر سے مجھے اتنا فائدہ ضرور تھا۔ کہ نالے تک نماز پڑھنے کے لیئے میں ان کے ساتھ چلا جاتا۔ جب میں وضو کرنے بیٹھتا تو ارد گرد کی پہاڑیوں کو بڑے غور سے دیکھتا۔ بھاگ نکلنے کے ہر امکان اور ہر پہلو پر غور کرتا۔ اس نالے کی تہ بڑی فراخ تھی۔ اور بہت جگہ بڑی گھنی مزرئی (پیٹھ) اُگی ہوئی تھی۔ جس میں رات کو چھپ سکنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ نالے کے دوسری طرف پہاڑی کا ایک لگاتار سلسلہ میلوں تک چلا گیا تھا۔ اور ہمارے گاؤں کے عین مقابل اس سلسلہ کوہ میں ایک دَرہ معلوم ہوتا تھا۔

آج یہاں پہنچے ہمیں تیسرا روز ہو گیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے لیئے قسیم گل مجھے اپنے ساتھ نالے والی مسجد میں لے گیا۔ نماز سے فراغت پا کر وہ میرے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں دور سے مسافروں کا ایک گروہ مسلح اس گاؤں کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ سب چوکنے ہو گئے۔ نماز کیوقت بھی وہ بندوقیں اپنے سے جدا نہ کرتے تھے۔ رائفلوں میں کارتوس بھر لیئے۔ اور لگے پہچاننے کہ یہ کون ہیں۔ آخر ایک دو آدمی ان سے پہچان لئے گئے۔ فراریوں نے کہا کہ قوم وزیر کے ملک ہیں اور غالباً "بالو" کی رہائی کے متعلق آ رہے ہیں۔ ان نو واردوں نے جب فراریوں کو مسجد میں بیٹھے دیکھا تو گاؤں کا رخ چھوڑ کر ہماری طرف ہی آ گئے۔ ان میں سے دو آدمی بڑے قد آور اور مضبوط توانا تھے۔ اور شکل اور صورت سے سر کردہ معلوم

ہوتے تھے۔ وسیم گل ان میں سے ایک کے ساتھ لپٹ گیا اور بڑے تپاک سے اس کیساتھ بغلگیر ہوتا رہا۔ اور اس کی تشریف آوری کا بڑا شکریہ ادا کیا۔ اب سب کو یقین ہوگیا کہ بابو اور سندر لال کے واسطے سرکار نے بھیجے ہیں۔ کیونکہ ٹوچی کے آدمیوں کا اِدھر آنا بغیر کسی ایسے کام کے نہیں ہوسکتا تھا۔

ہمارے علاوہ اس چھوٹے سے گاؤں میں چار اور بدنصیب قیدی بھی موجود تھے۔ ایک ان میں سے اپنے بہار کا موسم دیکھ چکا تھا۔ اور خزاں کے سفید آثار اس کے سر سے نمایاں تھے۔ یہ بنوں کا رہنے والا لکھمی چند نامی تھا۔ دوسرا پچیس سالہ نوجوان تلو رام ٹوچی کا رہنے والا تھا۔ تیسرا تیرہ چودہ سال کا ایک بھولی بھالی شکل کا لڑکا[1] تھا۔ اور چوتھا ایک خوردسال بچہ جس کی عمر چار سال سے کم تھی۔ یہ بھی ٹوچی کے ایک ہندو گنی رام نامی کا لختِ جگر تھا۔ اور نو ماہ سے آغوشِ مادر سے نکل کر ان ظالموں کے پنجے میں گرفتار تھا۔ یہ آٹھ دس ملک اِسی بچے کی آزادی حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ پٹھانوں میں ایک رسم ہے جسے ننوتی کہتے ہیں ننوتی کے معنے ہیں پشتو میں وفد یا جرگہ۔ یعنی جب کوئی بشر کسی کا کوئی بھاری قصور کرتا ہے یا خون کر دیتا ہے یا کوئی اور بڑی التجا کسی دوسرے سے رکھتا ہے۔ تو وہ اس کے ہاں ننواتی لے کر جاتا ہے۔ اور یہ رسم خاص طریقہ پر ادا کی جاتی ہے قوم کے بڑے بڑے سرکردگان کو ساتھ لے کر ایک دُنبہ اس کے گھر لے جاتے ہیں۔ دُنبہ ذبح کیا جاتا ہے۔ سارے ملک بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اور اس سے رحم کی درخواست کی جاتی ہے۔ یہ رسم شاذ و نادر ادا ہوتی

---

[1] یہ نونہال موضع دوڈیل کے ایک متمول جینی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کیساتھ ہمکلام ہونیکا موقعہ ہم کو نہیں دیتا اس پر بیحد مظالم توڑے جا چکے تھے۔ اور ہماری رہائی کے تھوڑے دنوں بعد یہ بدنصیب زرکثیر (غالباً ۹ ہزار روپیہ) فدیہ ادا

ہے۔ اور جہانتک ممکن ہو کوئی پٹھان اس کو رد نہیں کرتا۔

ان نو واردوں میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اور یہ گروہ اس لڑکے کی طرف سے رسم ننوتی ادا کرنے آیا تھا۔ اس لڑکے کا ایک اور بھائی کسی مقدمہ میں گرفتار تھا۔ اور اس بچے کے معاملہ سے کچھ تعلق رکھتا تھا۔ سرکار نے اُس سے کہا کہ اگر بچہ چھڑا لاسکو۔ تو تمہاری سزا کم کردی جائے گی۔ اب یہ اس کا بھائی ننوتی لے کر ننھے سے قیدی کو چھڑانے آیا تھا۔ یہ معاملہ جس طرح وہاں خوست میں میرے کانوں تک پہنچا تحریر کرتا ہوں۔ میں نے تحقیق نہیں کیا کہ اصل واقعات کیا تھے۔

اُن ملکوں سے میں نے اپنی بابت دریافت کیا کہ ہمارے پکڑے جانے کی بھی کسی کو خبر پہنچی۔ انہوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی جس سے مجھے بہت قلق ہوا۔ ان میں سے ایک سید صاحب بھی بوجہ بزرگ ہونے کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں بار بار دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتیں۔ میں بھی ایسی نظروں کا متلاشی تھا۔ کھسک کر ان کے پاس ہولیا میری حالتِ زار کو دیکھ کر وہ بہت متأثر معلوم ہوتے تھے۔ ان کی پوشیدہ نگاہوں سے رحم اور ہمدردی ظاہر ہوتی تھی۔ اور دوسروں کے سامنے وہ مجھے لاپرواہی کی نظروں سے دیکھتے۔ اس لئے مجھے ان سے دریافت حالات کے لئے جرأت پیدا ہوئی۔ میں سپاہی والے معاملہ کے بعد بہت محتاط رہتا تھا۔ اور خاصکر جب قراری اس وفد کے افراد سے ہمارے ربط بے غرض نہ ہوتے تو مجھے ان افراد کی نیت پر شبہ پیدا ہوتا کہ کہیں بھید لے کر مجھے

رسوا نہ کریں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے شاہ صاحب نے سچے دل سے میری مصیبت کو محسوس کیا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔ کہ آپ کو ہمارے آنے کی کیوں نہ خبر ہوئی۔ آپ کسی اور راستے سے آئے ہوں گے میرے اس سوال کی تہ کو وہ سمجھ گئے کہ مقصود راستہ کے حالات دریافت کرنا ہے انہوں نے بے تکلف مجھے ہاتھوں کے اشارے سے بتا دیا کہ تم کو یہ ان پہاڑوں کے پیچدار راستوں سے لائے ہیں۔ اور ہم اس طرف سے سیدھے میدانی راستے سے آئے ہیں۔ باتوں باتوں میں ہی انہوں نے راستے کا کچھ حال مجھے سنا بھی دیا۔ اور چوری چوری ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس کی دوسری طرف پہنچ جاؤ تو بچ جاؤ گے۔ اس لفظ کو میں نے سن کر بات کو مصلحتاً اس طرح ختم کیا۔ کہ یہاں سے بھاگنا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو خیال بھی میرے دل میں نہیں آسکتا۔ میں نے لالہ سندرلال صاحب سے بھی یہ ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے ملامت کی کہ کسی آدمی سے اس قسم کی بات نہ کرو۔ پہلے سپاہی والا معاملہ بھول گئے۔ اب اور گل کھلاتے ہو۔

اسی روز نماز عصر کے قریب گاؤں کے جنوب مشرقی طرف ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ گوشت کی بھنی ہوئی بوٹیاں مہمانوں میں تقسیم ہو رہی تھیں۔ میں شاہ صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہ چار پانچ سوار سفید منشیانہ لباس پہنے ہوئے آگئے سب نے انکو سلام کیا۔ انمیں سے ایک نے بڑھ کر پوچھا کہ یہ مہمان کون ہیں۔ فراریوں نے جواب دیا کہ ٹوچی کے ملک ہیں! اور شاہ غاثی[1] حاکم خوست سے

---

[1] اصل میں یہ لفظ ایشک آقاسی کا بگڑا ہوا ہے۔ جو ایک عہدہ کا نام ۱۲

ملنے جا رہے تھے۔ راستہ میں ہمارے ہاں ٹھہر گئے ہیں۔ اس نے فراریوں سے ذرا درشت لہجے میں کہا۔ کہ تم لوگ ہم کو خبر نہیں کرتے اور غیر ملک کے آدمیوں کو گھر لا بٹھاتے ہو۔ کیا یہ سارے شاہ غاثؒ کے پاس جائیں گے۔ ان کے نام لکھوا دو۔ ایک ایک کر کے وہ ان کے نام پوچھا گیا چنانچہ میری طرف بھی اس نے اشارہ کر کے نام پوچھا۔ لیکن وسیم گل نہایت چالاکی سے ٹال گیا۔ اس لئے مجھے شبہ ہوا کہ شاید سرکاری حکام سے ہمیں پوشیدہ قید رکھا ہوا ہے۔ اس لئے میں بھی اپنا نام اُسے ایسی صورت میں بتلانا چاہتا۔ کہ وہ میرا حال پوچھے۔ شاہ صاحب بھی مجھے اس پر جرأت دلاتے اور کہنیاں مارتے تھے۔ کہ اٹھو بولو۔ لیکن شکر ہے کہ میں نے جرأت نہ کی۔ ورنہ سخت گت بنتی۔ وہ نام لکھ کر چلے گئے۔ اور معلوم ہوا کہ وہ جمعدار صاحب تھے۔ امیر صاحب کی سرحد کا وہ قلعہ جو ہمیں راستہ میں پڑا۔ اور جو بہت دیر غیر آباد رہنے کے بعد ہماری آمد کے وقت مرمت ہو رہا تھا۔ اب آباد ہو چکا تھا۔ اور یہ لوگ اسی قلعہ سے آئے تھے۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے تھوڑا ہی بعد قلعہ کے کمانڈنگ افسر میجر صاحب آموجود ہوئے۔ وہ عمر رسیدہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی کربڑی داڑھی ایک بے رعب چہرہ کے نیچے چھاتی پر ایک میلے کرتہ پر بکھری ہوئی تھی ان کی حرکات سنجیدگی سے خالی تھیں۔ اور للچائی ہوئی نگاہوں سے وہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہمراہ دو تین سپاہی بھی تھے۔ جن میں کل والا امام الدین بھی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ لیکن ظاہراً بڑی مغائرت کا

سلوک میں نے کیا۔ جس سے وہ بھی سمجھ گیا۔ کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔
میجر صاحب ان فراریوں سے چند ایک امور پر جھگڑتے رہے
شاہ صاحب اب بھی میرے ساتھ شانہ زنی کر رہے ہیں۔ لیکن میں جانتا
ہوں کہ میجر صاحب کو ضرور میرا پتہ ہے۔ اور میرا بولنا محض مصیبت کا خریدنا ہے
جاتے وقت امام الدین نے فارسی میں کہا۔ کہ اگر میجر صاحب کو کچھ کہنا چاہتے
ہو تو میں ان سے عرض کر دوں۔ لیکن یقین رکھو کہ فائدہ کچھ نہیں اور یہ لوگ
تمہیں زیادہ تکلیف دیں گے۔ میں نے اس کی نصیحت کا شکریہ ادا کیا۔ جاتی
دفعہ وہ ایک پھول مجھے دے گیا۔ ہماری یہ دو باتیں بھی ایک اور سپاہی نے
اسی وقت فراریوں سے کہہ دیں۔ اور مجھ پر ایک قہر کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ مجھے
حکم ہوا کہ تم بالکل اپنے چھپر سے باہر نہ نکلا کرو۔ اور نماز بھی اندر پڑھا کرو۔ سچ
ہے جب قسمت بدلتی ہے تو سب تدبیریں اُلٹی آپڑتی ہیں۔ ملک میر افضل وفد
کا ایک ممتاز رکن تھا۔ اس پر وسیم گل کو کامل اعتبار معلوم ہوتا تھا۔ اگر میں اس
سے کوئی علیحدہ بات کرنی چاہتا تو وسیم گل باوجود اتنا محتاط ہونے کے اجازت
دے دیتا۔ جس سے میرے دل میں یقین ہو گیا کہ یہ ملک کبھی میرا خیر خواہ
نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس سے میں نے کوئی ایسی بات نہ کی جس کے
ظاہر ہو جانے سے مجھے اندیشہ ہو۔

رات کو مہمان جب کھانے سے فراغت پا چکے تو میں نے بڑی عاجزی
سے درخواست کی کہ میری قسمت کا فیصلہ کیا جائے۔ کہ کتنے پر میری رہائی کی
صورت ہو سکتی ہے۔ غرض سب مل کر بیٹھ گئے۔ اور مجھے ارشاد ہوا کہ تم اپنا حال

سچا سچا بیان کرو۔ چنانچہ میں نے اپنا حال بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اور خاتمہ پر عرض کیا کہ اگر تم ہم پر اتنا رحم کرو کہ ہم اپنے مکان میں بیٹھے رہیں۔ اور میرے چھوٹے بھائی کی تعلیم ادھوری رہ کر اس کی زندگانی خراب نہ ہو۔ تو میں تم کو نقد چھ سو روپیہ ادا کر سکتا ہوں۔ میری اس تقریر پر انہوں نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ اور وسیم گل نے ایک چھوٹی سی تقریر کے بعد میری قسمت کا فیصلہ بارہ ہزار کلدار پر کیا۔ بارہ ہزار ناقابل ادا جرمانہ کا حکم سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کیا میری ہستی میرے عزیز بھائیوں کے لئے مصیبت اور آفت کا باعث بنے گی۔ کیا اتنے روپے پردہ میری آزادی کو خرید سکیں گے۔ طرح طرح کے خیالات نے میرے دماغ کو گھیر لیا۔ اور ایک بت کی طرح اُن کے سامنے زمین پر بیٹھا رہا۔ قسم قسم کے احکام میرے لئے تجویز ہوتے رہے۔ آخر رات بہت گذر چکی تو مجھے کل والے بستر پر لٹا کر "کاٹھ" کا زیور پہنا دیا گیا۔ اور تنبیہ کی گئی کہ آج رات اگر تم نے اظہار بیقراری کیا یا چیخ پکار کی تو سزا پاؤ گے۔ باقی رات واقعات پر غور کرتے بے خوابی میں گذری۔ آج کے واقعات کی فوری بالیدگی دل و دماغ کی استقدر جاذب رہی کہ کاٹھ اور بستر کی تکالیف کی طرف توجہ ہی نہ گئی۔ اور تمام رات فدیہ کے تعین اور اس کے نہ پہنچنے کی صورت میں ایذاؤں کا تصور کرتے کرتے ہی سحر ہو گئی۔

چوتھے روز میری قسمت کسی قدر جاگتی معلوم ہوئی۔ اس گاؤں سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر ایک اور گاؤں ہے۔ جس میں ایک ملک لوآنا نامی رہتا ہے۔ فراریوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ انگریزوں کا جاسوس

ہے۔ اور قیدیوں کی بابت جو کچھ خط وکتابت ہوتی ہے وہ اسی لوآنہ ملک کی معرفت ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے سودا بنتا اور فراریوں کو روپیہ پہنچتا ہے۔ اس ملک کا فرستادہ ایک آدمی ہمارے دریافتِ حال کیلئے آج دس بجے صبح کے قریب ہمارے گاؤں میں پہنچا۔ اس نے فراریوں سے میرے ساتھ ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اور فراریوں کے ہمراہ چھپر میں آکر میرے بالمقابل چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری بیحد تسکین کی اور یقین دلایا کہ تم بہت جلدی رہائی پاؤ گے۔ اس کی شکل وشباہت سے بڑی چالاکی اور دغابازی ٹپکتی تھی۔ میری تسلی کر کے وہ فراریوں کی طرف یوں مخاطب ہوا۔ کہ میں ایک بات اس کے کان میں کہنا چاہتا ہوں۔ جس میں خدا کی قسم تمہارا سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ انہوں نے صاف انکار کیا۔ کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں۔ اور ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ لیجا کر۔ خدا جانے کیا کیا کچھ سمجھاتا رہا۔ بڑی مشکل اور بڑی قسموں کے بعد آخر اس نے اجازت لے ہی لی۔ اس آدمی نے میرے کان میں کہا۔ کہ ہم آٹھ۸ دس۱۰ جوان یہاں نالے میں چار پانچ دن بعد چھپائیں گے۔ اور تمہیں خبر کریں گے۔ تم ہمارے ساتھ نکل بھاگنا۔ اس سوال نے مجھے عجب کشمکش میں ڈال دیا۔ اُس ناآشنا پر میں کہاں تک اعتبار کرتا۔ اور اس سوال کا جواب میں کن الفاظ میں دیتا۔ یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ جسے چند لمحوں میں حل کر کے جواب دینا تھا۔ زندگی سے میں ناامید ہو چکا تھا۔ اللہ پر بھروسہ کر کے میں نے اس کو جواب دیا۔ کہ میں تو تیار ہوں۔ لیکن اس پر عمل کرنا مجھے ناممکن

معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یہ پٹی پڑھائی اور ہزار تسکین دے کر خوست کی طرف چلنے لگا۔ اس نے پھر مجھ سے جلدی ملنے کا وعدہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنی تجویز کی بیہودگی اور اس کے ناممکن العمل ہونے کو بخوبی جانتا تھا اور غالباً اس کا مقصد میرے دل میں ایک امید کی جھلک قائم رکھنا تھا۔ تاکہ اس محویت میں گھبرا نہ جاؤں۔ اس وقت مندرجہ ذیل خطوط لکھ کر ہم نے اسکو دیئے۔

پہلا خط[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قبلہ و کعبۂ ارین این اسیر بے تقصیر مدظلکم۔ آداب تعظیم و تکریم کے بعد معروض ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی اور ارادہ سے اور اپنی کج قسمتی اور بدبختی سے میں بتاریخ ۲۵ اپریل ۱۹۱۰ء ایک اور آدمی کے ہمراہ ضلع خارجیوں کے ہاتھ پڑ گیا۔ شکر ہے اللہ کا جو کچھ پیش آتا ہے اسی کی طرف سے ہے۔ ہم دن کے چار بجے پکڑے گئے۔ اور اگلے دن کے نو بجے یعنی پورے سترہ گھنٹے سے زیادہ کے بعد دوڑا دوڑا کر ہمیں خدا جانے کتنے دور فاصلے پر لے آئے۔ آپ سترہ گھنٹے سے خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور جو کچھ ہمارا حال یہاں پہنچ کر ہوا ہوگا۔ اور راستے کی پہاڑوں کی اترائی چڑھائی کی تکلیف آپ اپنے دل میں سوچ لیں۔ حکایتوں میں سُنا کرتے تھے۔ کہ اس طرح پکڑ کر غلام بنایا کرتے ہیں۔ اب ہم امیر صاحب کے علاقے میں

---

[1] یہ خط بعینہٖ میرے پاس موجود ہے اس لئے اس کی حرف بحرف نقل کی جاتی ہے۔

ہیں[1] اور انگریزوں کی دسترس سے فراری لوگ بالکل محفوظ ہیں۔ آپ گھبرا نہ جائیں اور اپنے دل کو صبر دے کر اللہ کا شکر کریں۔ میں نے آپ کا حال اور بھائی عبدالعزیز صاحب اور عزیزی محمد یوسف کا حال انہیں بتایا لیکن وہ اتنا روپیہ مانگتے ہیں۔ جو میں نے کبھی آنکھوں سے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ میری رہائی اور قید اللہ کے اختیار میں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥ والدہ صاحبہ کے روبرو اس امر کا بالکل ذکر نہ کریں۔ اور انہیں بالکل نہ بتائیں اور آپ بھی صبر فرمائیں۔ اگر بھائی عبدالعزیز صاحب یا آپ ہر دو بنوں میں تشریف لے آئیں۔ اور قوم دوڑ کے ذریعے سلسلہ خط و کتابت چلا سکیں تو کچھ کارروائی ہو سکے۔ بابو محبوب[2] عالم صاحب اگر کچھ مدد کر سکیں تو ان کی عنایت ہے۔ جو کچھ اور گرفتاروں کا حال دیر ہو جانے کی وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ الاماں۔ بابو محبوب عالم صاحب اگر سید[3] افتخار الدین صاحب کی معرفت کچھ کر سکیں تو بہت کچھ ممکن ہے۔ آپ تحصیلدار صاحب گل بادشاہ صاحب عیدک ٹوچی کی معرفت مجھے شاید یہاں بھی مل سکتے ہیں۔ بارہ ہزار روپیہ مجھ سے مانگا گیا ہے۔ معلوم نہیں اسی ملک میں مرنا ہے یا کسی اور میں۔ پاؤں میں زنجیر اور کاٹھ پڑے ہیں۔ آپ بنوں میں پہنچ کر مجھ سے خط و کتابت کریں۔ پھر حال احوال معلوم ہو جائے گا۔ (خاکسار محمد اکرم اسیر از خوست ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء)

---

[1] اصل خط جناب والد صاحب قبلہ سے دستیاب ہو گیا۔ اس لئے نقل حرف بحرف صحیح ہے۔
[2] جناب ڈپٹی محبوب عالم خان صاحب (مرحوم) والد صاحب کے ماموں زاد بھائی صوبہ سرحدی میں۔ وہ چکے تھے اور اس طرف انکے تعلقات بڑے وسیع تھے۔ [3] جناب سید افتخار الدین صاحب سی۔ آئی۔ ای ان دنوں سفیر کابل تھے یہیں نے ان ہر دو اصحاب کے اسمائے گرامی ایسے رسمی طور پر اسلئے تحریر کئے کہ اگر فراری میرا خط پڑھوا بھی لیں تو بھی ان کو کسی متعدد ہستی کی امداد حاصل ہونے کا پتہ نہ چلے۔

دوسرا خط[1]

ازجانب محمد اکرم قیدی گڑھی فراریاں

بعالیخدمت جناب اے۔سی۔آر۔ای ہنوں

میں نہایت ادب سے پہلے اس امر کی معذرت چاہتا ہوں۔ کہ میں نے ایک عریضہ براہ راست پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے ہم پچیس اپریل کو قریب چار بجے کے فراریوں کے ہاتھ پکڑے گئے۔ اور ستره گھنٹہ سے زیادہ کے سفر کے بعد ہم ایک دور دراز ملک میں لائے گئے۔ فراریوں کے ظلم و تعدی کی حکایتیں اسقدر زبان زد خاص وعام ہیں کہ ان کی تشریح کی حاجت نہیں۔ ہمارے مصائب اور ہمارا واویلا ایک پولیٹکل دماغ پر بہت کم اثر ڈال سکتے ہیں۔ مزید براں ہم پولیٹکل ریشہ دوانیوں سے بہت دور چلے آتے ہیں۔ کیونکہ ہم جناب امیر صاحب کے مملکت میں صوبہ خوست میں ہیں۔ بارہ ہزار فدیہ میرا مانگا گیا ہے۔ گورنمنٹ کے لئے یہ مشکل نہیں ہے۔ کہ میری جائداد کا اندازہ لگا سکے۔ میں تحریر ہذا گورنمنٹ کو مجاز کرتا ہوں۔ کہ وہ میری ہر قسم کی جائداد میری رہائی کے لئے فروخت کر دے۔ اور میں نہایت تعظیم سے ملتجی ہوں۔ کہ جتنی کمی رہ جائے گورنمنٹ ازراہ رعایاپروری اُس کو پورا کر دے۔ اور میں تیار ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں۔ کہ گورنمنٹ میری تنخواہ سے اس رقم کو آہستہ آہستہ پورا کر لے۔ میں اپنے والدین کے

---

[1] اس خط کا مضمون انگریزی میں تھا۔ اصل خط دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے اس کا ترجمہ جہاں تک حافظہ میں محفوظ تھا تحریر کر دیا۔

بڑھاپے اپنے بچے کے یتیم اور بیوی کے بیوہ ہوجانے پر گورنمنٹ کے رحم کو متحرک کرنا چاہتا ہوں۔ قیدیوں کی رہائی میں دیر ہوجانے کے باعث جو حال ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں محتاج بیان نہیں۔ میں نے ہنوں میں جناب کے ماتحت صرف ڈھائی ماہ کام کیا ہے۔ اس لیئے میں اپنی لیاقت اور اپنے فرائض کو جانفشانی سے ادا کرنے اور مفید ہونے کا حق پیش نہیں کرسکتا۔ بس صرف گورنمنٹ کے رحم کا خواستگار ہوں۔ جو فراری ہمیں پکڑ لائے اُن کے نام حسب ذیل ہیں۔ مدّے۔ خوّنے معلم۔ مدآمیر اور گل قدم۔ میں ہوں جناب کا محمد اکرم قیدی۔

قریباً اسی مضمون کا ایک خط جناب پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کی خدمت میں تحریر کیا گیا۔ ایک علیحدہ کاغذ پر اپنی ایک تصویر بنائی۔ سر کے نیچے پتھر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔ ہاتھ چھاتی پر بندھے تھے۔ اور پاؤں کاٹھ میں جکڑے تھے اس تصویر کے اوپر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مفصلہ ذیل چار سطور نظم کی لکھیں۔

Legs in stock and head on stone

And hands together tied on breast

The bed of earth and food of bone

Enough to spoil a life of rest

علاوہ ان خطوں کے چند ایک اور خطوط مختلف دوستوں کو لکھے جن کا مضمون تقریباً ایک ہی تھا۔

ہاں اس موقع پر فراریوں نے جناب پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف خط کی پشت

پر یہ بھی مجھ سے لکھوایا۔ کہ "میں نے اُن کی گفتگو سے معلوم کیا ہے۔ کہ ہماری گرفتاری میں فلاں ملک کا ہاتھ ہے"۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا دشمنی سے انہوں نے اس کی نسبت یہ مضمون لکھوایا تھا۔

ہمارے خط لے کر وہ روانہ ہو گیا۔ دور تک بیٹھا میں اس کو دیکھا کیا حتیٰ کہ وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد دل پھر حسرت و غم میں ڈوب گیا۔ فراری لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے "سرکار نے بڑی جلدی اس کا پتہ لگایا ہے۔ یہ سرکار کا کوئی بڑا عہدہ دار معلوم ہوتا ہے قیدیوں کی ہفتوں کوئی خبر نہیں لیتا۔ اور اس کے لئے چوتھے دن آدمی آگیا"۔ ان کی ان باتوں سے مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔

جس مصیبت جس اضطراب اور جس گھبراہٹ میں ہمارے دن گذرتے تھے ایک آزاد اور رنج نادیدہ دل اُن کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب تک کسی مصیبت کا انجام معلوم نہ ہو۔ دل نہایت بے چین رہتا ہے۔ ضرور ہے کہ جیل خانے سے حوالات میں روحانی تکلیف بہت زیادہ ہو۔ کسی مجرم کو سزا کا فیصلہ سننے سے پہلے ضرور ہے کہ دلی اضطراب بیحد ہو۔ لیکن ہم تو سیشن سپرد تھے۔ ہماری زندگی اور موت کا ہی فیصلہ نہ تھا صرف موت کی سزا کا لفظ ہمارے کانوں سے بہت مانوس ہو چکا تھا۔ انسان کو ذبح کر دینا یا رائفل کا نشانہ بنا دینا ایک نہایت معمولی اور ادنےٰ بات تھی افسوس جن تکالیف کا ذکر سن کر وہ دل جس میں انسانی ہمدردی کا ایک ذرہ بھی ہو۔ ضرور چشم پُرنم ہو جائے۔ وہاں معمولی کارروائی خیال کی جاتی۔ بعض

کے دل میں ضرور یہ خیال آتا ہوگا۔ کہ وہاں قیدیوں کی جیب میں روپیہ تو ہے نہیں پھر ان کو تکالیف دینے سے کیا حاصل۔ لیکن بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک باقاعدہ تجارت شروع کر رکھی ہے۔ بیسیوں آدمی پکڑے جا چکے ہیں۔ اگر وہ تکالیف نہ دیں اور جھوٹ موٹ لکھوا کر خطوط بھجوا دیں تو جو قیدی وہاں سے چھوٹ کر آئیں وہ باقیوں کا پردہ صاف صاف کھول دیں تو اس طرح ان کی تجارت رُک جائے۔ یا اگر کسی کے فدیہ سے ناامید ہو کر اُسے زندہ چھوڑ دیں تو کسی قیدی کا فدیہ کبھی ادا ہی نہ ہو۔

تلو رام قیدی جس کا میں پہلے نام لے چکا ہوں عید ک کے نزدیک ایک سرحدی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایسی خونخوار وحشی اقوام میں کسی ہندو کا اپنی بہادری کے سر پر رہنا محال ہے۔ اس طرف یہ قاعدہ ہے کہ ہندو اپنے گاؤں میں اپنے آپ کو کسی کی پناہ میں دے دیتا ہے۔ اگر وہ قبول کر لے تو اس کی جان و مال کا محافظ ٹھہرتا ہے۔ اور عام طور پر اس ہندو کو اس پٹھان کی عورت کہا جاتا ہے یعنی اس کی آبرو و مال کا وہ ایسا ذمہ وار ہے جیسے اپنی عورت کا۔ اور اس ہندو کو اگر کوئی نقصان پہنچے تو اس پٹھان کی ہتک اور بے عزتی سمجھی جاتی ہے۔ اس تلو رام کے گرفتار کرنے والے سات آدمی تھے۔ جن میں ایک اس کو پناہ دینے والے پٹھان کا اپنا بیٹا تھا۔ اس پٹھان نے یہ بڑی بے عزتی کا کام کیا۔ جس کی مثال شاذ ہی پائی جاتی ہے۔ کہ اپنے ہندو کو پکڑ لایا۔ یہ پٹھان تُوچی کے ایک بارسوخ مَلک کا لڑکا تھا۔ اسکا نام خوائے تھا۔ ان دنوں بہت غریبی کی حالت میں پہنچ کر یہ کام کر بیٹھا۔ سچ ہے افلاس جو کچھ

بھی کرائے تھوڑا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھے گا۔ اور اس کے باپ سے تھوڑا سا روپیہ لے کر چھوڑ دے گا لیکن اسے یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ خود دوسروں کے ہاتھ میں بے بس ہو جائے گا۔ تلورام کو پہلے چند دن اپنی حفاظت میں رکھا۔ اور آزاد رکھا۔ کچھ دن بعد دوسرے حصہ داروں کو شک پیدا ہوا کہ روپیہ لے کر خود اسے رہا کر دے گا۔ اس دن سے اس بیچارے کی شامت آئی۔ جو جو کچھ اس پر گذری خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ لیکن آفرین ہے اس کی ہمت اور استقلال پر کہ اُف تک زبان سے نہ نکلا۔ اب خواشے اس کی حالتِ زار دیکھ کر دل ہی دل میں پشیمان اور شرمسار ہوتا۔ لیکن بے بس تھا۔ ذرا سی رعایت نہیں کر سکتا تھا بلکہ دوسروں کے روبرو اس سے نہایت سختی کا برتاؤ کرنا پڑتا۔ لیکن یہ حکمتیں بھی اب پیش نہیں جاتی تھیں۔

ہمارے پہنچنے سے پہلے تلورام کے بیان کے مطابق جو ایذائیں اس کو دی گئیں اگر وہ سچ ہیں تو ان کے بیان کے لئے بھی پتھر کا دل چاہیئے اس لئے ہم ان کی تفصیل قلم انداز کرتے ہیں۔ یہ بھی سُنا تھا کہ اس اثنا میں اُس کا بوڑھا باپ اُس کے ملنے کے لئے آیا تھا۔ پہلے تو اسے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ آخر بڑی منت و زاری کے بعد ان کی سرسری سی ملاقات ہوئی۔ مجروح بیٹے کا ایک مصیبت کی حالت میں باپ کے گلے مل کر چلا آنا کیسا دردناک نظارہ ہو گا۔ اُن کے دلوں کے ارمانوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ باپ کا دل اسے دیکھ کر کس طرح پھڑکتا ہو گا۔ لیکن اس کی ہمت

دیکھئے کہ بیٹے کو روتے دیکھ کر اس نے منع کیا اور کہا کہ تم عورتوں کی طرح کیوں چلاتے ہو۔ صبر سے مصیبت کو برداشت کرو۔ اگر تم ایسے ہی کم ہمت ہو گئے تو میں تمہیں کبھی نہ چھڑاؤں گا۔ ایک باپ کی زبان سے بیٹے کی نسبت یہ الفاظ تعجب خیز ہیں۔ اس بیچارے بوڑھے باپ نے فدیہ کا فیصلہ آٹھ سو روپیہ کیا۔ اور ادائیگی کا بندوبست کرنے کے لئے رخصت ہوا لیکن اس واقعہ کو آج کئی مہینے ہو چکے ہیں کہ باپ نے پھر خبر تک نہ لی۔ تلو رام کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا۔ اس سے میں نے یہ اخذ کیا۔ کہ اس قوم میں دنیا کی محبت پدری الفت پر غالب ہے۔ اور وہ ابھی تک فدیہ کی رقم میں مزید تخفیف کا خواہاں ہے

جس دن ہم گرفتار ہو کر اس گاؤں میں پہنچے بہت تھوڑے مرد گاؤں میں موجود تھے۔ باقی لوگ مختلف سمتوں میں غدی یعنی دھاڑے پر نکلے ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ واپس ہو رہے تھے۔ توچی کے ملک جوگنی کے لختِ جگر پدن کے لئے بطورِ تَوقی آئے ہوئے تھے اُن کو ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ پدن کے سارے حصہ دار موجود نہ تھے۔

آج ہمیں آئے پانچواں دن ہے۔ صبح کے آٹھ بجنے کے قریب ہیں خونے ہاتھ میں دو زنجیریں لئے ہوئے ہے۔ گل قدم کے ہاتھ میں ایک شک یعنی ہتھوڑا ہے۔ دونوں ٹیلیگراف کے ایک لمبے تار کو سیدھا کر رہے ہیں۔ لالہ سندر لال ٹانگیں نیچے لٹکائے سامنے چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا۔ اور سیماب کی طرح لوٹتا۔ کبھی جا کے اُن کے ہاتھ پکڑتا کبھی رحم کی درخواست کرتا۔ مجھے اس وقت کی مجنونانہ حرکات

سے اب بھی دل میں خفت سی محسوس ہوتی ہے۔ زنجیر سے میری طبیعت سخت گھبراتی تھی۔ اللہ غنی ہماری آزادی کس طرح چھنتی جارہی ہے۔ رات دن زنجیر میں جکڑے پڑا رہنا کیسا روح کا سوہان ہے۔ میرے اضطرار اور اضطراب پر وہ ہنستے اور مجھے غصے سے گھورتے تے۔ گویا میری بیقراری کا مزا لیتے تھے۔ میں اٹھ کر مسجد کو چلا گیا۔ وہاں ملک بھی بیٹھے تھے اور بہت سے فراری بھی جمع تھے۔ میں نے جا کر ملکوں سے التجا کی کہ کسی طرح وہ اپنے رسوخ کو کام میں لاکر زنجیر کی مستقل گرفت سے ہمیں نجات دلائیں۔ میرا بیحد اضطرار ان پر اثر کیئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ انھوں نے فراریوں کی بڑی منت سماجت کی جس پر فراریوں نے وعدہ کیا کہ اچھا ہم "بابو" کو زنجیر نہ ڈالیں گے۔ لیکن اس وقت لالہ جی کو اس طرح زنجیر میں جکڑے جاتے ہوئے دیکھ کر میرے دل کو اس جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ اور میں نے بے حد کوشش کی کہ اس رعایت سے لالہ صاحب کو بھی مستفید ہونے دیں۔ لیکن میری سعی بالکل رائگاں رہی۔ اور انہیں زنجیر پہنا ہی دی گئی۔ میں لالہ صاحب کی زنجیر کو ایسے ہی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے مجھے ہی پہنائی جارہی ہے۔ مجھے لالہ جی کا اسیرِ زنجیر دیکھنا اور اپنا زنجیر سے آزاد رہنا مروّت سے دور معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ اس امر کے اظہار سے شرم آتی ہے۔ لیکن لالہ صاحب جانتے ہیں کہ ایامِ اسیری میں کئی دفعہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر اُن کو مصیبتوں سے بچاتا رہا۔

آج رات کچھ اور فراری واپس آ گئے۔ اور پدن کے حصہ دار پورے ہو گئے۔ وسیم گل کے چھپر میں بیٹھ کر انھوں نے ملکوں سے علیحدہ فدیہ کے

مسئلے پر گفتگو کی۔ یہ لوگ ملکوں کو صاف جواب دینا بھی پسند نہ کرتے۔ اور ان
کی التجا کو ماننا بھی نہ چاہتے تھے۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ آپس میں سے ایک
کو سکھلا دیا جائے۔ کہ تم نے اپنا حصہ نہ چھوڑنا۔ اور پورا طلب کرنا۔ اور باقی
آدمی یہ جواب دیں گے۔ کہ اگر سارے اپنا اپنا حصہ چھوڑ دیں۔ یا کم کر دیں
تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے۔ یہ مشورہ آپس میں ٹھہرا کر وہ ملکوں کے پاس
گئے۔ اُن کے ساتھ مجھے بھی جانا پڑا۔ رات کو وہ بالکل مجھے اپنے
سے الگ نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس وقت کی گفتگو بھی عجیب پولیٹکل
تھی۔ ان کے جوابوں سے ملکوں کو تسکین ہوئی۔ کہ شاید یہ کام بن چلا ہے
ہر ایک یہی جواب دیتا کہ مجھے چھوڑنے میں کچھ عذر نہیں۔ میں اپنا حصہ چھوڑ
دیتا ہوں۔ لیکن اگر دوسروں نے روپیہ لیا تو پھر میں بھی حقدار ہوں گا۔ جب
اخیر والے کی باری آئی۔ تو وہ بگڑ بیٹھا۔ اور باقی سب سے لڑنے لگا۔ کہ تم
سب چھوڑ دو۔ میرے گھر رات کو کھانے کے لئے روٹی نہیں۔ دوسرا
کوئی روزگار نہیں۔ پتھروں میں ہم بیٹھے ہیں۔ اگر اس طرح کریں تو بھوکے
مریں۔ پھر اس نے ملکوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہ تمہارے آنے کا ہم
اتنا لحاظ کرتے ہیں۔ کہ پہلے ہم نے دو ہزار فدیہ طلب کیا تھا اب ہم چار سو
کم کر دیتے ہیں۔ باقی سولہ سو روپے میں جو حصہ میرا ہوتا ہے وہ مجھے دیدو۔
باقی حصہ داروں کی مرضی ہے خواہ وہ بخش دیں۔ خواہ پورا لیں۔ ملکوں کو اس سے
زیادہ رعایت کی توقع تھی۔ انہوں نے دوبارہ التجا کی لیکن فراری کسی طرح
رضامند نہ ہوئے۔ آخر ملکوں نے نا امید ہو کر کہا۔ کہ ہم تمہارے رحم پر بھروسہ

کر کے آئے تھے لیکن اب افسوس کے ساتھ ہم صبح واپس چلے جائینگے۔

مرغ کم حوصلہ را گو سر خود گیر و برو
رحم آنکس کہ نہد دام چہ خواہد بودن

آج رات کاٹھ میں پاؤں ڈال کر میں نے اللہ کا شکر کیا۔ کہ بار خدایا یہ بھی تیرا احسان ہے۔ کہ آج پاؤں میں زنجیریں نہیں ہیں۔ ہر کش بگوتا بہ تب راضی شود چھٹے روز علے الصباح توچی کے ملکوں کو فراریوں نے وداع کیا۔ جب تک وہ ہمارے گاؤں میں مقیم رہے۔ لالہ صاحب ان کے سامنے نہ ہوئے کہ مبادا کہیں پہچان کر فراریوں کو اکسانہ دیں۔ اور کوئی آفت نہ لے آئیں۔ میں نے ملکوں کو رخصت کے وقت ایک خط بنام تحصیلدار صاحب عیدک دیا۔ اور وہ مجھے تسلی دے کر روانہ ہو گئے۔

اس موقع پر ہم تھوڑی سی فراریوں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں گاؤں میں ہمارے پہنچتے ہی مدآمیر تو خوست چلا گیا تھا۔ گل قدم بھی ایک دو روز ٹھہر کر رخصت ہو گیا تھا۔ باقی چار فراریوں کے ہاں باری باری ہماری روٹی کا انتظام ہوتا۔ اور مدآمیر اور گل قدم کی باری بھی آپس میں تقسیم کر لی گئی تھی۔ جو کچھ وہ خود کھاتے۔ وہی ہمیں دیتے۔ بلکہ اپنے ساتھ ہی کھلاتے۔ عموماً مکئی کی خشک روٹی ہوتی کبھی کبھار چھاچھ کا پیالہ دستر خوان کی نعمت سمجھا جاتا۔ اور اسی ایک پیالہ سے ہم باری باری ایک گھونٹ لے کر نوالہ کو حلق سے اتار لیتے کبھی گڑ کو پانی میں گھول کر تھوڑے سے گھی میں تڑکا لیا جاتا۔ اسے "گڑبیا" یعنی "گڑ" اور "آب" کہتے۔ اور یہ بھی زینت دستر خوان سمجھا جاتا۔ سالن کے نام

سے وہ لوگ ناآشنا تھے۔ مرچ اور ہلدی کبھی کسی نے دیکھی تک نہ تھی۔ کبھی جَو کی روٹی پر اکتفا کرنا پڑتا۔ یہ بہت سخت ہوتی۔ اور کبھی کبھی جب نصیب یاور ہوتے تو گندم کی نہایت لذیذ خمیر شدہ روٹی بھی مل جاتی۔ چند ایک دفعہ شروع شروع میں چاول بھی ہمارے ہاں پکے تھے۔ ہمارے گاؤں کے ارد گرد شہتوت کے درخت تھے۔ جب تک وہ پھل دیتے رہے فراری خود بھی اسی پر بسر کرتے اور ہمیں بھی روٹی کی بجائے وہی دیتے۔

ایک روز میں نے ذکر کیا۔ کہ میری عمر تیئیس ۲۳ سال کی ہے۔ تو ایک آدمی بڑا حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ کہ تم اپنی عمر کا کیسے حساب رکھتے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہ ہماری پیدائش کا روز لکھا ہوا ہوتا ہے۔ تو وہ تعجب سے پوچھنے لگا۔ کہ تم ہر روز لکھ لیتے ہو۔ کہ آج ایک روز گذر گیا۔ آج دو روز گذر گئے۔

ایک روز لالہ سندر لال سے میں نے ذکر کیا۔ کہ دھوبی کے پاس میرے کپڑے تھے وہ بھی ضائع گئے۔ تو ایک نے بڑی حیرانی کیساتھ دریافت کیا۔ کہ بالو تمہارے ان کپڑوں کے علاوہ اور بھی پہننے کے کپڑے ہیں؟

تاریخوں اور دنوں کا حساب انہیں بالکل معلوم نہ تھا۔ کئی اشخاص کو دنوں کے نام تک نہ آتے۔ جمعہ کا دن دریافت کرنے کی مجھے بڑی تکلیف ہوتی۔ کیونکہ میں خود شمار بھول جاتا۔ اور اُن کو تو جُمعہ سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔

ہمارے دو چھاتے بھی ان کو غنیمت میں ملے تھے۔ ایک تو خونے کے اور دوسرا مغلم کے حصہ میں آیا تھا۔ مغلم اکثر دھوپ میں تانے بڑا اتراتا صرف اس خیال سے کہ میرے پاس چھاتا ہے۔ اور بارش میں تو خاصکر خونے اور

مُعَلّم چپاتہ لے کر باہر چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ اور بڑے فخر کی نگاہ سے دوسروں کی طرف دیکھتے رہتے۔

لالہ سُندر لال نے آتے ہی اپنی سلامتی اور سہولت اس میں محسوس کی کہ وہ فراریوں کی بے حد چاپلوسی کرتے۔ اور ان کی خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ جہاں دو چار فراری بیٹھے ہوتے لالہ جی جھٹ حقہ تازہ کر تمباکو ڈال۔ آگ سلگا کر زنجیروں کو جھنجھناتے ہوئے ایک ایک کے آگے لے جاتے۔ خوست کا بھائی عمدار ایک بڑا قلاش اور فاقہ مست فراری تھا۔ آجکل وہ بستر مرض پر پڑا تھا۔ لالہ صاحب نے اس کی بے حد خدمت کی۔ اس کو پہر دن دباتے۔ گھی کی مالش کرتے۔ اور علاج کرنیکی کوشش کرتے۔ لیکن وہ ایسا نیک بخت تھا کہ جب کبھی موقع ملتا وہ ہمیشہ لالہ صاحب کے برخلاف دوسروں کو اکسانے اور بھڑکانے میں دریغ نہ کرتا۔

یہ لوگ سرحد پر اسی طرح حاکموں کی آڑمیں بڑے ہاتھ رنگتے رہتے ہیں۔ دوسرے حاکموں سے تو میں بے خبر ہوں لیکن حاکم خوست ان لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ اور وہ ان کی بہت رعایت کرتا ہے۔ اور مال غنیمت سے حصہ لیتا ہے۔ اس حاکم کا لقب شاہ غاشی ہے۔ سارے فراریوں کے حالات سے واقف ہوتا ہے۔ بعض قیدی اس حاکم کی معرفت بھی چھڑائے جاتے ہیں۔ اور اس صورت میں یہ فراریوں سے بہت زیادہ روپیہ مار لیتا ہے۔ اس لئے فراری حتی الوسع فدیہ خوست کے راستے سے نہیں آنے دیتے۔ اور اپنے طور پر بندوبست کر لیتے ہیں۔ اور قیدیوں سے

اُن کے وارثوں کو لکھوا دیتے ہیں کہ روپیہ فلاں شخص کی معرفت ہم کو پہنچے اگر حاکمِ خوست کی معرفت روپیہ آیا۔ تو ہم بہت تکلیف پہنچائیں گے۔ جب میں نے خط لکھا تو مجھے اس امر کی اطلاع نہ دی گئی تھی۔ اور میں بالکل حالات سے ناواقف تھا۔ بلکہ میں نے خط میں اشارہ کیا تھا۔ کہ جناب امیر صاحب کی معرفت کارروائی کی جائے۔ اس خط کے چلے جانے کے دو چار روز بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے منع کیا ہے یا نہیں۔ کہ خوست کی معرفت کارروائی نہ ہو۔ میں نے ان معاملات سے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ وہ مجھے بہت ڈراتے کہ اگر ذرا شک ہمیں پڑا کہ خوست کی معرفت تمہارے وارثوں نے کارروائی کی ہے تو ہم تمہیں سخت تکلیف دیں گے۔ اور تمہیں قومِ محسود کے پاس بیچ دیں گے۔

اس قید میں ابھی ہمیں سات آٹھ روز کا ہی عرصہ ہوا ہوگا۔ کہ دہاڑے سے ایک گروہ اور واپس آیا۔ جو کہ ایک ہندو کو بھی پکڑ لائے تھے۔ یہ خبر سن کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میں نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ کہ کوئی اور انسان بھی اس آفت میں پھنسے۔ ہم نے اس ہندو کو دیکھنے کی خواہش کی عصر کے وقت وہ ہمارے پاس اسے ایک مجمع میں لائے۔ یہ بڑا تنا ور اور قوی جوان تھا۔ اس کے چہرہ سے بیقراری یا غریب الوطنی کے آثار بالکل نمایاں نہ تھے وہ مسکرا رہا تھا۔ پٹھانوں کے درمیان پٹھانوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا لالہ سندر لال نے چلم سلگا کر اس کے آگے رکھی۔ اس نے ہمیں بڑی تسلی دینے کی کوشش کی کہ بالکل نہ گھبراؤ۔ تم یہی سمجھو۔ کہ یہیں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں رہنا

ہے۔ یہی ہمارا وطن اور یہی خویش واقربا ہیں ہنسی خوشی سے گذارہ کرو۔ اگر قسمت میں ہے تو چھوٹ جائیں گے۔ اس کی اس طرزِ گفتگو سے دل کو ڈھارس کیا ہوتی ہے۔ وہ ابھی یہاں کی رسم و رواج سے ناآشنا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ شکار شکاریوں کے مسکن کو اپنا وطن دیر تک نہیں سمجھ سکتا۔ میرے چہرہ پر ایک زہرخند سا ظاہر ہوا اور میں نے اسے جواب دیا۔ ؏

اے آنکہ در نصیحت نالب کشودۂ

معلوم مے شود کہ تو عاشق نبودۂ

ایک ہفتہ کے بعد ہمیں نصیحت کرنا پھر قابلِ قبول ہو گی۔

وہ لوگ اس کے پکڑے جانے کا حال بڑی مسرت سے سناتے رہے انہوں نے کہا کہ ہم بیس پچیس دن غدی پر رہے۔ ان فراریوں کا سرگروہ اڑنگے بھی اس غدی میں تھا۔ ایک جاسوس کی معرفت اٹک میں ایک امیر کو لوٹنے کی خاطر نکلے تھے۔ جس کی بابت خبر ملی تھی کہ سونے کی اینٹیں اس کے گھر میں ہیں۔ (ذرا ہمارے اس ویرانہ سے اٹک کا فاصلہ خیال میں لائیے اور پھر ان خانہ بربادوں کی مار کا اندازہ لگائیے) وہ اٹک تک پہنچے۔ بلکہ ایک کشتی بھی قابو میں کر لی۔ لیکن جاسوس نے کہا کہ موقع نہیں ملتا ہے۔ یہ بات سن کر وہ بہت جھنجھلائے۔ اتنی بڑی مسافت کے بعد ناکام واپس پھرنا بڑا گراں گذرا۔ انہوں نے جاسوس کے قتل کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ وہاں سے پلٹے تو پہاڑوں ہی پہاڑوں میں کوہاٹ کی طرف پہنچے۔ موضع لاچی کے قریب ایک گاؤں ستوڑل نامی تھا۔ اس میں داخل ہوئے سارے گاؤں

میں اعلان کر دیا کہ کوئی مسلمان جگہ سے نہ ہلنے پائے ورنہ مار دیں گے۔ پھر
اسی گاؤں سے ایک آدمی کو ساتھ لیا کہ ہمیں ہندو کا مکان بتاؤ۔ وہ آ کر انہیں مکان
بتا گیا۔ اور کچھ حالات بھی بیان کرتا گیا۔ دوکان کے اندر دو آدمی بیٹھے تھے جنہیں
فراری بالکل تمیز نہ کر سکے کہ پٹھان تھے یا ہندو۔ ایسا ہی دوکانداروں نے بھی
انہیں پہلے معمولی گاہک سمجھا۔ اور کہا کیا خریدنا چاہتے ہو؟ اس پر فراریوں نے
رائفلیں ان کی جانب سیدھی کر دیں۔ اور پھر ان کے سر کو ننگا کر کے چوٹی سے
ان کے ہندو ہونے کی تصدیق کی۔ پھر کیا تھا اک آن کی آن میں دوکان لوٹ لی
اور دونوں ہندوؤں کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ حقیقت میں یہ دونوں بدنصیب ہندو
باپ بیٹا تھے۔ بیٹے کا نام پرس رام تھا۔ اس نے بہت جرأت دکھائی اور
جانے سے انکار کر دیا۔ حتےٰ کہ فراریوں کا مقابلہ بھی کیا۔ لیکن چونکہ وہ لوگ انہیں
زندہ لے جانا چاہتے تھے اس لئے جان سے مار دینے کی بجائے اسے
مار مار کر زخمی کر دیا۔ جب اس کے بازو رہ چکے تب کہیں وہ رام ہوا۔ فراری
پرس رام کی شہ زوری کی بڑی تعریف کرتے اور اس کی کشمکش کو مزے لے
لے کر بیان کرتے۔ راستے میں جا کر دونوں سے علیحدہ علیحدہ دریافت کیا تو
معلوم ہوا کہ باپ بیٹا ہیں۔ باپ کو تو انہوں نے چھوڑ دیا اور کہا کہ ہم درہ کوہاٹ
کے آفریدی ہیں۔ وہاں اس کی رہائی کی سعی کرنا۔ اور لالہ پرس رام کو ساتھ لے
آئے۔ سوڈل سے سات دن کی منزل کے بعد وہ اپنے گاؤں میں پہنچے۔
رات چلتے اور دن چھپے رہتے۔ لالہ پرس رام کی ٹانگ پر ایک اچھا گہرا زخم
تھا۔ جو فراریوں کے ساتھ کشمکش میں اسے پہنچا۔ غرض لالہ پرس رام اپنی بہادری

کی تعریف اپنے دشمنوں کی زبان سے سن کر پھولے نہ سماتے۔ اور حق تو یہ ہے کہ بہادر لوگ دوسروں کی بہادری کی قدر کرتے ہیں اور اسے چھپانا نہیں چاہتے۔ فراری لوگ قدآور نہیں۔ طاقتور نہیں۔ لیکن دلاور ہیں۔ اور بہادری دل سے تعلق رکھتی ہے نہ زور اور قد سے خاصکر آجکل تو اسلحہ آتشیں نے جسمانی تفوّق کو بالکل ہیچ کر دیا ہوا ہے۔ اب تو صرف دلی جرائت اور دلیری درکار ہے یہ لوگ بہادر ہیں اور دوسروں کی بہادری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ حسد کے باعث اس کو چھپانا چاہیں۔

میرے پاؤں کی آزادی کا زمانہ مجھے بہت تھوڑا نظر آتا تھا۔ اور زنجیروں کا خیال کر کے میرا دل کانپ اٹھتا۔ اور قیدِ سلاسل میں زندگی بسر کرنے پر میں موت کو ترجیح دیتا۔ عصر کے وقت جبکہ فراری مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو شام تک وہیں بیٹھے رہتے۔ وسیم گل اپنی بندوق اور کارتوس والا کمربند میرے پاس ہی رکھ جاتا۔ یہ وقت مجھ پر موت وحیات کی ایک مجنونانہ کشمکش میں گذرتا۔ میں اپنا موجودہ واقعہ بابر بادشاہ کے اس تاریخی واقعہ کے عین مطابق خیال کرتا جبکہ وہ انہی پہاڑوں کے سلسلے میں ہمراہیوں کی غداری سے دشمنوں کے پنجے میں گرفتار ہوگیا تھا۔ اور قتل سے پہلے اس نے نماز کی اجازت حاصل کی۔ اور وضو کرتے وقت دیوار پھاند کر عین دشمنوں کے نرغہ میں سے بھاگ نکلا۔ اس حکایت کی یاد مجھے ہمہ تن جرأت بنا دیتی رائفل اور کارتوسوں کو اپنے قابو میں دیکھ کر خون دماغ کو چڑھ جاتا۔ اور بدن پر جوش سے لرزہ آنے لگتا۔ اس وقت میں نہایت خشوع اور خضوع سے نماز عصر ادا کرتا۔ اور دعا مانگتا کہ یاالٰہی اگر

میرے حق میں میرا ارادہ مفید ہے تو مجھے اس کے پورا کرنے کی ہمت اور توفیق بخش۔ پشتو کا ایک دیوان عبدالرحمٰن پاس پڑا ہوتا۔ میں اس میں فال دیکھتا۔ جو اتفاق سے بھاگ نکلنے کی تائید میں ہی نکلتی۔ چھپر کے دروازہ سے باہر نظر دوڑاتا۔ اور دیکھتا کہ زیادہ سے زیادہ میں فلاں جگہ تک پہنچ سکوں گا۔ جبکہ گولیوں کی باڑ شروع ہو جائے گی۔ وہاں پر مورچہ پکڑوں گا۔ اور چند ایک کی جان لے کر وہیں خود بھی ڈھیر ہو جاؤں گا۔ پہاڑوں کے درمیان وہ راستہ جس سے ہمیں پکڑ کر لائے تھے اس دروازہ سے دور تک نظر آتا تھا۔ اس کا نظارہ بھی دل میں ایک خاص امنگ بھاگنے کے لئے پیدا کرتا۔ دو تین دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے بندوق میں کارتوس بھر لیا۔ اور کمر بند کندھے پر ڈال کر موت کے منہ میں بھاگنے کے لئے قدم اٹھایا۔ لیکن قسمت پاس کھڑی ندا دیتی۔

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے اسے آور ابھی کام بہت ہے

پھر اس جنون اور دیوانگی کی حالت پر عقل سلیم غالب آجاتی اور میں نہایت حسرت سے اپنے ارادہ کو کسی بہتر موقع کی انتظار میں ملتوی کر دیتا۔ اگر اس وقت جبکہ میں کارتوس بھری رائفل ہاتھ میں لئے ہوتا کوئی اندر آجاتا تو میرا انجام خدا جانے کیا ہوتا۔

لالہ سندر لال نے شروع سے سوچ سمجھ کر ایسا طریقہ اختیار کیا کہ جہاں وہ بیٹھتے وہیں کے ہو رہتے۔ گویا ان میں جان تک نہیں۔ سوتے تو ایسے غافل کہ کروٹ تک لینا بھول جاتے۔ روتے تو ایسے لگاتار کہ آنکھیں سوج

جاتیں اور لبس نہ ہوتے ۔ ان کی عادت سے دوسروں کو ذرا بھی شک نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کچھ گل بھی کھلائیں گے ۔ میری حالت بالکل برعکس تھی ۔ میں اپنے دل کی بیقراری کو چھپا نہیں سکتا تھا ۔ میں بغیر ذرہ بھر مبالغہ کے بیان کرتا ہوں کہ وہاں پہنچ کر بہت راتیں اور دن میں نے ایک منٹ بھر نیند نہ کی ساری ساری رات آنکھیں کھولے پڑا رہتا ۔ نیند پاس تک نہ پھٹکتی ۔ ع

خواب راحت ہے کہاں نیند بھی آتی نہیں مجھکو
بس اچٹ جانے کو آئی جو ذرا آئی بھی

میرے خیالات جنون کے درجے تک پہنچ چکے تھے ۔ ہر وقت میں بھاگ نکلنے کی فکر میں محو رہتا ۔ اور اس محویت اور بیقراری کی حالت میں مجھے اپنی حرکات پر قابو نہ رہتا ۔ بے تاب ہو کر میں چھپر میں ٹہلنا شروع کر دیتا ۔ بعینہٖ جیسے قفس میں کوئی جانور پھڑک پھڑک کر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہو ۔ میری نگاہوں سے بے انتہا مایوسی میں جان پر کھیل جانے کے آثار نمودار ہو جاتے ۔ وہ چوکنی نظروں سے مجھے اس وقت دیکھتے ۔ مزید براں رات غم و الم کے علاوہ پسّو بھی چین نہ لینے دیتے ۔ اور میں کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہتا ۔ میری یہ سب حرکات ان کی نگاہوں میں بڑی مشتبہ تھیں ۔ میری بیوقوفی سے ان کو میری رفتار کا اندازہ بھی ہو چکا تھا ۔ وہ ایک دوسرے کو محتاط کرنے کے لئے علانیہ اپنے خدشہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے کہ اگر ایک بندوق کی مار یہ تم سے آگے نکل گیا ۔ تو پھر اسے تم کبھی نہ پکڑ سکو گے ۔ اور بعض تو میرے ان حالات کو دیکھ کر زیادہ محتاط بنانے کی خاطر برملا کہتے ۔ کہ اس بابو کو تم شاید ہی قابو میں

رکھ سکو۔ یہ ضرور نکل جائے گا۔ ان کے یہ ریمارک سن کر بھی میں اپنی طبیعت کو نہ سنبھال سکتا۔ اور خلافِ مصلحت حرکات سرزد ہوتی رہتیں۔

ملکوں کے چلے جانے کے تیسرے چوتھے روز عصر کیوقت وسیم گل نے رہزنی پر اکیلے جانے کے لئے تیاری شروع کی۔ ایک گڑ والی بہت بڑی میٹھی روٹی پکوا کر دامن میں باندھ لی۔ اور اسلحہ سے لیس ہو کر اپنی زندگی کے واحد مقصد کی پیروی میں روانہ ہونے لگا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے معلّم اور خوسے کو بلا کر خفیہ طور پر کچھ ہدائتیں کیں۔ جن کا علم گو اسوقت مجھے نہ ہو سکا۔ لیکن مابعد کے واقعات نے بتادیا۔ کہ وہ کیا ہو سکتی تھیں۔ پھر اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور کہا کہ میں تمہاری نسبت کوئی پختہ خبر معلوم کر کے لاؤں گا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ میرے حالات سے پوری طرح واقف تھے اور قید کی مصیبت کا بوجھ جس طرح مجھے کھل رہا ہے۔ آپ پر خوب روشن تھا۔ اب آپ جا رہے ہیں۔ خدا جانے دوسرے لوگ میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھیں گے۔ وسیم گل نے مجھے تسلی دی۔ اور کہا کہ میں نے تمہاری نسبت اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا ہے۔ اور میں خود بھی جلد واپس لوٹونگا۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔ اس کو جانبِ وطن جاتے دیکھ کر مجھ پر حسرت سی چھا گئی۔

اپنی حکمتِ عملی تبدیل شدہ حالات کے مطابق بنانے کے لئے میں دیر تک بحرِ تفکرات میں ڈوبا رہا۔ فریب و مکاری شرارت و غدّاری کا ایک بہت بڑا قافلہ وسیم گل کے ہمرکاب جا چکا تھا۔ اس لئے مجھے قدرتاً مصیبت کے بوجھ میں کچھ تخفیف سی معلوم ہونے لگی۔

اس کے چلے جانے کے بعد اب ہمارے آقاؤں میں سے صرف تین باقی رہ گئے ۔ البتہ گل قدم جو کہ بے خانماں تھا کبھی کبھی آ خبر لیتا ۔ اپنے فرار ہونےکی اب باقاعدہ تجاویز میں نے شروع کر دیں ۔ سب سے پہلے گاؤں کے سب فراریوں اور خاصکر اپنے آقاؤں کے خصائل و عادات کا مطالعہ کرنا ضروری تھا ۔ ان میں سے مدّے ۔ مُعَلّم اور خوت نے صرف باقی رہ گئے ہیں ۔ مدّے کا تھوڑا سا حال پہلے آچکا ہے ۔ اس کے رحمدل ہونے کے ثبوت ہمیں مل چکے ہیں ۔ اس کے حسنِ خُلق سے اس کی فطرت کی پاکیزگی عیاں ہے ہمیں دیکھ کر اس کے چہرہ پر ایک دلکش تبسم نمودار ہوتا ۔ گویا وہ دعوت دیتا کہ " بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں "۔ مجھے آج تک تعجب اس امر پر آتا ہے کہ اس کی ایسی نیک فطرت اس قدر مخالفِ ماحول کے ساتھ وابستگی پر کیسے مطمئن تھی ۔ کبھی کبھی اس کے ضمیر کو بعض واقعات میں عام فراریوں کے معیار کے خلاف بڑی کشمکش کرنی پڑتی ۔ لیکن وہ ہمیشہ ایسے موقع پر شرافت اور انسانیت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ۔ ایسے چند ایک واقعات کا تذکرہ آگے آئے گا ۔ لیکن کیا اس کی یہ تمام خوبیاں میرے بھاگنے کی تجاویز میں ممد ہو سکتی تھیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہانتک اس کی ذات کا تعلق تھا وہ میرے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں حائل نہیں تھا ۔ اس نے ہماری نگہبانی رکھنے میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا تھا ۔ لیکن بدقسمتی سے باقی فراری اس کی اس " کمزوری " سے بخوبی واقف تھے ۔ انہوں نے بھی قیدیوں کے ان معاملات میں اس سے کبھی کوئی توقع نہ رکھی تھی ۔ اور کبھی کوئی کام اسکے بھروسہ پہ نہیں اٹھا رکھا تھا ۔ اس لحاظ سے مجھے اس سے اتنی توقع ہی کافی تھی کہ ع

"مرا ز خیر تو امید نیست بد مرساں"

گویا وہ میری بھاگنے کی سکیم میں ایک ناقابل غور ہستی کی حیثیت رکھتا تھا۔ معلم ایک خوش باش نوجوان تھا۔ اس کی بہن نیک نامے کا مختصر سا ذکر آ چکا ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی تھی جس سے مجھے مدد کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنی پوزیشن مجھ پر یوں واضح کر دی تھی کہ "تمہارے فدیہ سے میرا کیا تعلق اور اس کی وصولی سے مجھے کیا خوشی؟ مجھے تو انہوں نے روپیہ لے کر کسی اور جگہ دھکیل دینا ہے"۔ قدرت نے جہاں حد سے زیادہ بیقراری کے سامان میرے لئے مہیا کئے ہوئے تھے۔ وہاں نیک نامے اور مدتے ایسی ہستیاں کچھ باعث تسکین بھی دی ہوئی تھیں میری حالت دیکھ کر کئی دفعہ نیک نامے چشم پُرنم ہو جاتی۔ وہ میری پشت پر ہاتھ رکھ کر نہایت محبت آمیز اور درد بھرے لہجہ میں کہتی کہ "بابو اتنا غم مت کرو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم جلدی رہا ہو جاؤ گے"۔ حالات نامساعد کے باعث اکثر میرے سر میں درد رہا کرتی۔ وہ گھی بالوں میں لگانے کے لئے دے دیتی۔ ان کے گھر کے بچے کھچے ٹکڑے میں قیدیوں کو دے دیتا۔ لیکن اس نے میری ہمیشہ پردہ پوشی کی۔ بلکہ ان کی سب سے زیادہ قیمتی چیز یعنی گڑ بھی میں نے بانٹ دیا۔ لیکن اس نے اس وقت تک پروانہ کی جب تک لالہ صاحب کو گڑ چراتے خود نہ دیکھ لیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ غرض ہر طرح کے ظاہری لحاظ سے اگر کوئی توقع ہو سکتی تو نیک نامے سے ہو سکتی تھی۔ لیکن میں نے اس پر بھی اپنے راز کا انکشاف یا بھاگنے کے ارادہ کا اشارہ تک کرنا افشا کے خطرہ سے خالی نہ خیال کیا۔ بھاگنے کی وہی سکیم کامیاب اور کم خطرناک ہو سکتی تھی جس میں فراریوں

کے کسی فردِ واحد سے استمداد کا کوئی جزو نہ ہو لہٰذا ان واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے کسی پر بھی توقع رکھنے کا خیال فی الحال ترک کر دیا۔

خو ‌نے متانت اور خاموشی کا پتلا تھا۔ اس کا کیریکٹر میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس کے دل میں گرفتاری کے وقت سے ہی میری جانب سے پستول چھپائے رکھنے کے باعث کینہ سا بیٹھ گیا تھا۔ جو اخیر وقت تک اس کے دل سے دور نہ ہوا۔ لیکن خو نے سے بدرجہا بڑھ کر اس کی دیرینہ سال والدہ ہمارے لئے سوہان روح تھی۔ اور احتیاط اور نگہداشت کے معاملہ میں وسیم گل سے دوسرے درجہ پر یہ پیر زال تھی۔ اسکی حد درجہ احتیاط کا ذکر کئی موقع پہ آئیگا۔ غرض وسیم گل کے جانیکے بعد ایک رات تو معمول کے موافق گذر گئی مغلم میٹھی نیند سو رہا۔ چھپر میں مغلم بیں اور اس کی بہن تھے۔ میری رات آج ذرا زیادہ جوشیلے خیالات میں گذری سونے کو چارپائی بھی مل گئی اور کاٹھ چارپائی پہ رکھ دیا گیا۔ یہ سلوک شاید کسی قیدی سے بھی نہ کیا گیا ہو گا۔

وسیم گل کے جانے کے دوسرے روز خو ‌نے مغلم اور گل قدم تینوں مجھے علیحدہ لے گئے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اور میرے ساتھ ایک فیصلہ کن گفتگو کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک افتتاحیہ تقریر میں میری قسمت اور میری موت و حیات پہ اپنے قادرِ مطلق ہونے کی حیثیت کو مجھ پہ واضح کرنا چاہا۔ آبدار خنجروں کو بار بار میرے گلے کے قریب لا لا کر اپنی اس قدرت کا عملی مظاہرہ کرتے غیض و غضب کی شدت سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ مجھے ڈانٹ

کر کہا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اک آن کی آن میں تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔ بلکہ انہیں خنجروں سے تمہارے اعضاء ایک ایک کر کے کاٹتے رہیں گے۔ اور تمہارے جسم کو داغ دیتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ تم ایک ایسی موت مر جاؤ جو دوسرے قیدیوں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ تم ایک اسلامی سلطنت کے دشمنوں کے ملازم تھے۔ تمہارا قتل ہم پر فرض ہی نہیں بلکہ ثواب ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارا محاسبہ نہیں کر سکتی۔ اپنے اختیارات کے اس تعارف کے بعد وہ اصل مقصد کی طرف آئے۔ اور فرمایا کہ تمہارا زندہ رکھنا صرف دنیاوی طمع کے لئے ہے۔ ہمیں روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ لوانہ ملک کے قاصد کو گئے کتنے روز گذر گئے لیکن تمہاری خبر آج تک کسی نے نہیں لی۔ اپنی ضرورت کی وجہ سے ہم تمہارے مقرر کردہ فدیہ میں ایک ہزار کی رعایت دیتے ہیں بشرطیکہ تم بہت جلد ادائیگی کا بندوبست کر دو۔ اگر ہمیں کہیں ڈاکہ سے مالِ غنیمت ہاتھ آ گیا۔ تو پھر فدیہ دگنا دے کر بھی رہا نہ ہو سکو گے۔ لہٰذا تم فریب و مکاری کو بالائے طاق رکھ کر فوراً فدیہ منگوا دو۔ نہیں تو بہت پچھتاؤ گے۔

اس تقریر کے جواب میں مَیں نے عرض کیا۔ کہ اپنے گھر کا حال مَیں بیان کر چکا ہوں ہم گھر سے کسی طرح اتنی رقم ادا نہیں کر سکتے اور رہا یہ کہ لوگوں پر سرکار نے ہماری خاطر بارہ ہزار جرمانہ کیا ہے۔ یہ لغو ہے۔ میں اپنی حیثیت جانتا ہوں۔ روپے کی چیز کوئی دس پر نہیں خریدتا۔ تیس ۳۰ روپیہ میری تنخواہ ہے۔ بارہ ہزار پر سرکار مجھے کیوں خریدنے لگی — لکھنے کو جتنا روپیہ تم لوگ کہو میں لکھ دیتا ہوں لیکن مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اتنی بھاری رقم دے کر ہمیں کوئی نہیں چھڑائیگا۔

وہ اپنے مطالبہ کو بتدریج ایک ایک ہزار کم کرتے گئے لیکن اس اثنا میں وہ جھنجلاہٹ کی وجہ سے درشت کلامی سے کام لیتے رہے۔ جب رقم مطالبہ چار ہزار تک پہنچی تو ان کا رویہ ایسا ہو گیا۔ کہ اس سے کم ہونا اب ناممکن تھا۔ پھر بھی میں نے جتا دیا۔ کہ ہمارے گھر سے اس رقم کی برآمد مشکل ہے۔ البتہ اگر گورنمنٹ ہمارے حال پر رحم کرے تو ممکن ہے رقم پوری ہو جائے۔

مجھ سے فارغ ہو کر لالہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ گل قدم لالہ سندر لال کے پاس مزدور رہ چکا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ جتنی شہرت انکی پہلے تھی۔ اب ان کی مالی حالت ویسی نہیں رہی۔ اور ان کے معاملہ میں فراریوں کو گورنمنٹ سے کسی امداد کی توقع بھی نہ تھی۔ لہٰذا بحث و تکرار کے بعد انکا فدیہ ڈھائی ہزار مقرر ہوا۔

وہ لوگ تو اس باز کی طرح بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ جس نے ایک رات اپنے پروردہ چکور کو اس بہانے مار کھایا کہ تم دھوپ میں ہو اور میں سائے میں۔ اس لئے فدیہ پر تکرار کا بہانہ بنا کر وسیم گل کی خفیہ ہدایات کو پورا کرنے کے لئے وہ کتے کے گلے سے ایک زنجیر اتار لائے۔ مجھے چھپر میں چارپائی پر بٹھا لیا۔ گل قدم ایک ہتھوڑا اور ڈاکخانہ کا تار لے آیا۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا اٹھا۔ اور میں نے اپنے دل میں بہت پیچ و تاب کھائے۔ عاجزی خوشامد اور چاپلوسی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر ہٹاتا۔ اللہ کا خوف یاد دلاتا۔ لیکن وہ کسی طرح نہ پسیجے۔ میری باتوں کا ایک ذرہ بھر اثر ان پر نہ ہوا۔ دونوں پاؤں کے نیچے ایک بڑا اونی پتھر رکھ دیا۔ اور زنجیر پہنانی شروع کر دی۔

"تاب زنجیر ندارد دل دیوانۂ ما"

میرے حد سے زیادہ جزع وفزع پر انہوں نے مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ ہم تمہیں زنجیریں بذریعہ قفل ڈالیں گے۔ صبح کھول دیا کریں گے۔ اور رات کو لگا دیا کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اسی وقت قفل کا بندوبست کیا۔ تلوارام قیدی کے پاؤں میں زنجیر بذریعہ قفل تھی۔ اس کے پاؤں سے قفل نکالا۔ اور اس کی زنجیر کو بذریعہ تار مضبوط کر دیا۔ جب اس بیچارے سے چند لمحوں کے لئے زنجیروں کو جدا کیا گیا۔ تو اس نے ایک لمبا قدم لے کر خدا جانے کس دل سے اپنی مہینوں کی دلی حسرت پوری کی۔ اور اس آزادی کے لمحے میں نہ جانے کیا کیا امنگیں پیدا ہوئی ہونگی۔ اس کا قفل اتار کر مجھے زنجیریں ڈالنی شروع کیں۔ میں پھر بھی لگاتار احتجاج کرتا اور کہتا رہا۔ ؎

تابِ زنجیر ندارد دلِ دیوانۂ ما

مجھے پُرغضب نظروں سے گھورتے۔ اور میری بے چینی کا لطف لیتے آخر مایوس ہو کر میں نے قرآن شریف ہاتھ میں لے لیا۔ اور سورہ یوسف پڑھنی شروع کر دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب منتظم وغیرہ غیض وغضب کی حالت میں مجھے علیحدہ لے کر بیٹھے تو رحمدل نیک نامے چپکے سے چھپر کے پاس آ کر اس سب کارروائی کو سنتی رہی۔ جب زنجیر سے بچاؤ کے لئے میری منت وزاری اس حد تک پہنچی کہ پتھر بھی پگل جاتا۔ لیکن ان سنگدلوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ تو نیک نامے بے اختیارانہ روتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس کی ہچکیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیر سے رو رہی ہے۔ جب اس نے چہرہ سے کپڑا ہٹایا۔ تو اس کی سُرخ آنکھیں اشکوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز سے بڑے پُرجوش لہجہ

میں مغلم کو کہا۔ کہ بھائی اس عاجز پر اتنا ظلم نہ کرو۔ خدا سے ڈرو۔ مغلم نے اس کو اس حالت میں دیکھا۔ تو کڑک کر ایک ثقیل جملہ استعمال کیا۔ اور کہا جاؤ باہر دفع ہو جاؤ۔ نیک نامے بولی۔ اچھا بھائی یاد رکھو۔ وہ دن ضرور آئے گا۔ جب تم آنکھیں سفید کئے۔ زنجیریں پہنے اسی بابو کے سامنے گڑگڑا کر رحم کی درخواست کر رہے ہوگے۔[1]

نیک نامے کے اس پاک جذبۂ محبت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ میں نے ہر چند میں اس کو تسلی دے کر چھپر سے باہر چلے جانے کو کہا۔ اور مغلم نے بھی ایک پتھر اس کی طرف مارنے کو اٹھایا۔ اور وہ باہر چلی گئی۔

میں صبر و شکر کی حالت میں تلاوت سورہ یوسف میں مشغول رہا۔ اور وہ ایسی بے رحمی سے زنجیر پہناتے رہے کہ میرے پاؤں نے خون کے اشکوں سے ان کی شکایت کی قفل صرف طفل تسلی کیلئے تھا۔ دیا ممکن ہے انہوں نے ارادہ بدل دیا ہو۔ اور ہتھوڑے سے کوٹ کوٹ کر زنجیر مستقل طور پر پہنادی گئی اپنے آپ کو عمر میں پہلی دفعہ اس حالتِ بے لبسی میں زنجیروں میں جکڑے دیکھ کر جو اثر طبیعت پر ہوا۔ اس کا اندازہ رنج نادیدہ آزاد ناظرین تصور میں نہیں لاسکینگے۔

اے فاختہ پرواز کناں بر سر سروے
حالِ دلِ مرغانِ گرفتار چہ دانی

---

[1] میرے کانوں میں آج بھی اس پاک دل نیک نامے کے الفاظ اسی طرح گونج رہے ہیں اور مجھے اندر سے ندا آتی ہے۔ کہ اس کے درد بھرے الفاظ کی پیشگوئی پوری ہو کر رہے گی مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن مغلم ضرور پابزنجیر میرے سامنے پیش ہوگا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

اس روحانی تکلیف کے علاوہ جو مجھے تڑپا رہی تھی۔ زنجیروں کا ایک نہایت رنجدہ پہلو یہ بھی تھا۔ کہ بھاگ نکلنے کی سکیم میں ان کا توڑنا ایک ناقابل حل و شوار مرحلہ معلوم ہوتا تھا۔ ؎

پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیر زنداں میں رہو
دحشتِ دل کا ہے ایمار او صحرا لیجیے

غرض وسیم کل کی خفیہ ہدایات کی اس تکمیل کے بعد انہوں نے فوراً فدیہ کے متعلق خطوط لکھنے کو کہا۔ ضروری سامان لے آئے اور مضمون سمجھا دیا۔ جس پر ہیں نے زورِ قلم صرف کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی طرف اور لالہ جی کی طرف سے خطوط لکھ کر ان کے حوالے کیے۔

قیدیوں سے بیرحمی اور متفرق واقعات

پھر جمع کرتا ہوں جگر لخت لخت کو　　مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

میں ذکر کر چکا ہوں کہ کمال عنایت سے ہمارے فدیہ کو گھٹا کر ہم سے خطوط لکھائے گئے۔ ان کاغذوں کو لے کر چاروں قزاق لوآنا ملک تک پہنچانے

کو روانہ ہوئے۔ اور شام کو واپس آ گئے۔ اُنہوں نے بیان کیا کہ لوآنا نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ کہ پرسوں آ کر وہ بالو سے ملاقات کرے گا۔ یہ خبر سن کر ہمارے دلوں میں طرح طرح کے خوشگوار خیالات پیدا ہوئے ہم اس ملاقات کو اپنے لئے مبارک اور نعمتِ غیر متوقع سمجھتے تھے۔ خدا خدا کر کے پرسوں کا دن آیا بھی اور گذر بھی گیا لیکن لوانا ملک کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ اس سے اگلے روز علی الصباح خوتے نے معلّم۔ گل قدم کچھ خرید و فروخت کرنے خوست چلے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں دوپہر گیارہ بجے کے قریب ملک لوآنا کا قاصد آیا۔ چونکہ ہمارے آقاؤں سے صرف مدّے ہی موجود تھا۔ اس لئے اسی سے بات چیت ہونے لگی۔ اس نے مدّے سے کہا کہ لوآنا ملک سرحد پر فلاں جگہ بیٹھا ہے۔ تم بالو کو وہاں پر لے چلو۔ وہ سیدھا سادہ آدمی بے خطر ہمیں ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا۔ اس قاصد کے آتے ہی خوتے کی بوڑھی والدہ بے تابانہ جستجو میں تھی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مدّے کا ارادہ ہمیں لے جانے کا ہے۔ تو بڑی برافروختہ ہوئی۔ وہ ڈر کر اپنے دوسرے بیٹے علمداد کو بلا لائی۔ اور لوآنہ ملک کے پاس ہمارے لے جانے کی پُرخطر تجویز کی حماقت پر ملامت کرتے ہوئے کہنے لگی کہ اغلب ہے وہاں جا کر قیدی تو آزاد ہو جائیں۔ اور تم دونوں قیدی بن جاؤ۔ اس کم بخت نے یہ گفتگو ایسے تجربہ کارانہ لہجہ میں کی۔ کہ مدّے بھی اپنی حماقت کو محسوس کرنے لگا۔ اس جہاندیدہ پیرزال نے اپنی تجویز پیش کی۔ کہ لوانہ ملک خود آ کر یہاں ملے۔ قاصد نے عذر پیش کیا۔ کہ امیر صاحب کے ذمہ دار افسر اسے جاسوس خیال کرتے ہیں۔ اس لئے وہ علانیہ اس علاقہ میں نہیں آ سکتا۔ آخر

طے پایا کہ ادھر سے لوانہ ملک پہاڑوں میں سے ہوتا ہوا دریائے کیتو میں فلاں جگہ پہنچ جائے۔ اور ادھر سے یہ لوگ ہمیں لے جائیں۔ اور اس طرح ملاقات نالہ کیتو میں ہو جائے۔ ہمارا بہادر مدّے بے خود قاصد کے ہمراہ لوانہ ملک کو لانے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اور علمداد سے کہتا گیا کہ ہماری زنجیریں اُتار دے۔ چنانچہ علمداد ہماری زنجیریں اتارنے لگا۔ تاکہ ہم اس کے ہمراہ چل سکیں۔ لیکن اس بڑھیا نے پھر دخل دیتے ہوئے کہا۔ کہ مبادا اس طرح اندیشہ ہے کہ قیدیوں کو بھگا کر نہ لے جائیں۔ اور اس نے علمداد کو مجبور کیا کہ وہ اسی طرح زنجیروں میں جکڑے ہمیں ملاقات کو لے جائے۔

اس ہوا و ہوس کی دلدادہ کو اس احتیاط پر بھی تسلی نہ ہوئی۔ اور ہم سے دُور اڑھائی سو قدم پیچھے پیچھے ہولی۔ علمداد بھی بستر مرگ سے اٹھ کر ابھی بہت لاغر اور کمزور تھا۔ میں اور لالہ سندر لال دونوں ننگے پاؤں پا بزنجیر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے علمداد کے پیچھے پیچھے بڑھیا کی جان کو روتے جا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ زمین دھوپ سے تپ رہی تھی۔ اور راستہ خاردار تھا۔ کانٹا چبھنے پر جھٹ پاؤں ہاتھ کی طرف اٹھتا۔ مگر زنجیر کے جھٹکے سے رُک کر رہ جاتا۔ بہت دیر آہستہ آہستہ چل کر ہم بندی گلی کے مقابل کیتی نالہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مدّے لوانا ملک اور ایک اور آدمی سامنے پہاڑوں سے نمودار ہوئے۔ ہماری اور لوانہ ملک کی اس جگہ ایک سرسری ملاقات ہوئی۔ اس نے مدّے کی داڑھی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کہ عیدک کے تحصیلدار صاحب نے میری داڑھی پکڑ کر کہا ہے کہ اسی طرح فراریوں کی داڑھی

پکڑ کر میری طرف سے کہنا۔ کہ روپیہ تیار رکھا ہے۔ ساتویں دن تک بندوبست
کر کے ہم بھیج دیں گے۔ اگر ساتویں دن تک روپیہ نہ آیا تو میں اپنی گھوڑی
لے جاؤں گا اور روپیہ لے آؤں گا۔ اتنی دیر تک ان کو میری خاطر کوئی تکلیف نہ
پہنچانا۔ اس کے بعد بصورت وعدہ خلافی تمہاری مرضی۔ اس کے جواب میں گلداد
نے کہا کہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اقرار تک ہم انہیں زیادہ تکلیف نہیں
دینگے۔ لیکن اگر وقت تک روپیہ نہ پہنچا تو پھر ان پر اتنی سختی کریں گے کہ ان کا
جان بر ہونا مشکل ہو جائے گا۔ مجھے ایک حویلی بنوانی ہے۔ رات دن ان سے
پتھر ڈھلواؤں گا۔ گارا بنواؤں گا۔ اور اتنا کام لوں گا کہ یہ تکان سے چور ہو جائیں
گے۔ کھانے کو صرف اسقدر دوں گا کہ جس سے نہ تو مریں اور نہ زندہ رہیں۔
اور محنت و مشقت کی تکلیف سے مضمحل ہو کر ہلاک ہو جائیں۔ خیال کرنیکا مقام
ہے کہ اس بلند پرواز کے ہاں کھانے کو مکی کا آٹا تک نہیں لیکن گفتگو میں
شہنشاہ زماں کا دماغ دکھا رہا ہے۔ اس کے بعد لوانا ملک نے ہم سے
علیحدہ گفتگو کرنے کی اجازت مانگی۔ لوانا ملک پست قد نیلگوں آنکھیں اور
"چگی" داڑھی والا ایک چلتا پرزہ متمول اور بارسوخ ملک تھا۔ اس سے
پہلے وہ بہت سے قیدی اپنی معرفت چھڑا چکا تھا۔ اور فراریوں میں انگریزوں
کا جاسوس مشہور ہو کر بہت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر ہم کُنْتُمْ
الْغَرَضُ مَجْنُوْنُ فراریوں کو بھی ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی۔ جس
کے ذریعہ وہ قیدیوں کے وارثوں یا سرکار انگلشیہ سے پیغام رسانی کا کام لے
سکیں۔ یہ شخص جانبین کے واسطے بہت موزوں تھا۔ بنابریں فراریوں کو

بھی اس پر قدرے اعتماد کرنا پڑتا تھوڑے سے اصرار کے بعد اس کو اجازت مل گئی۔ اور وہ ہمیں چند قدم کے فاصلے پر لے جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی اور باتیں تو ہماری تسلی کے لئے محض تصنع تھیں۔ قابلِ ذکر صرف یہ ہے کہ اس نے ہم سے دریافت کیا۔ کہ اگر وہ کوئی انتظام کر سکے تو کیا ہم بھاگنے کی جرائت کر سکیں گے۔

لوآنا ملک کی نسبت جیسا کہ فراریوں کی عام گفتگو سے ثابت ہوتا تھا ہیں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ سرکار انگلشیہ کا بڑا خیر خواہ اور اپنی کارگذاری دکھانے کا خواہاں ہے۔ اس قید میں ہر ایک شخص پر بے اعتباری کر لینا گویا کسی برقی اتفاقی مدد کا انکار کر دینا تھا۔ میں نے اس پر اعتماد کیا۔ اور اس کو جواب دیا۔ کہ اگر کوئی انتظام کرو تو ہم جرائت کر سکتے ہیں۔ اس نے خدا جانے کس خیال سے پھر دریافت کیا کہ کیا تم ابھی زنجیریں توڑ سکتے ہو؟ جس کا جواب میں نے بڑی مستعدی سے اثبات میں دیا۔ یہ سن کر اس نے ایک لمحہ کی سوچ کے بعد کہا۔ کہ میں چند دن بعد کچھ آدمی فلاں موقع پر چھپاؤں گا۔ اور ایک آدمی تمہارے پاس آکر تمہیں پتھر مارے گا۔ تو تم اسے بھاگنے کی نشانی سمجھنا۔ اور بھاگ کر اس مقررہ جگہ پر آجانا۔ افسوس اس کی باتیں ممکن العمل نہ تھیں۔ اور ان میں بہت کچھ ظاہر داری پائی جاتی تھی۔ اس قرارداد پر وہ ہم سے رخصت ہونے لگا۔ رخصت کے وقت فراریوں کے سامنے میں نے اس ملک سے کچھ روپے کی درخواست کی۔ اس نے دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ فراری لوگوں اور سندر لال نے مجھے منع کیا۔ لیکن میں نے پھر بھی ایک روپیہ کابلی اس سے لے ہی لیا۔ اس روپیہ لینے سے میری صرف یہ غرض تھی کہ ملک صاحب کیساتھ میں اس ذریعے سے اتحاد کی سلسلہ جنبانی

کروں۔ کیونکہ میرے خیال میں قدرتاً دینے والے کے دل میں ہمدردی اور احسان کا ایک خاص خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ روپیہ دے کر وہ ہم سے رخصت ہوئے۔ اور میں بڑے تپاک اور گرم جوشی سے اس کے گلے ملا۔ اور اس کی اس تکلیف اٹھانے کا شکریہ ادا کیا۔ اور خدا حافظ کہتے ہوئے درخواست کی کہ ہمیں بھول نہ جائیے۔ مدّت سے اس کو وداع کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہو لیا۔ اور عملدار پھر ہمارے ہمراہ واپس آگیا۔ آج امیر صاحب کا الاسرحدی قلعہ بالکل تیار ہو گیا۔ اور سپاہی مال و اسباب پہنچاتے ہوئے ہمیں راستہ میں ملے۔ جن کو سنانے کے لئے میں نے فارسی میں یہ شعر دردناک لہجہ میں بآواز بلند پڑھا ع

تو اے کبوترِ بام حرم چہ میدانی
طپیدنِ دلِ مرغاں رشتہ بر پارا

لیکن ان پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ واپس آکر ہم نے دیکھا کہ وہ قصابہ عورت خوتنے کی والدہ ایک ٹیلے پر بیٹھی دھڑکتے ہوئے دل سے ہمارا انتظار کر رہی تھی جب تک ہم واپس گاؤں پہنچ نہیں گئے اس کو چین نہ آیا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن مدّا میر خوست سے ہماری مزاج پرسی کے لئے بلائے ناگہانی کی طرح آدھمکا۔ میرے دل میں انگوٹھی کے واقعہ والی یاد فوراً تازہ ہو گئی۔ اس کی عقابی آنکھوں کے گرد سرمہ کا حلقہ اسی طرح اسے زیادہ مہیب بنائے ہوئے تھا۔ جیسے پہلے دن دیکھا تھا۔ ع

ایک تو نشۂ مے اس پہ نشیلی آنکھیں
ہوش اڑتے ہیں جدھر کو وہ نظر کرتے ہیں

اس کی خوفناک شکل دیکھ کر ہم پر رعشہ طاری ہو جاتا۔

اس دیو صورت شیطان سیرت کو دیکھ کر جو کچھ ہمارے دل پہ گذری اس کے اظہار کے لئے میں لفظ نہیں پاتا۔ وہ بلند آواز سے چلّا کر بولتا۔ اور گفتگو بڑی تیزی سے کرتا۔ اس کی آنکھوں اور چہرہ سے خوف معلوم ہوتا۔ جب اس نے یہ سُنا کہ وسیم گل کے بعد بابو کو چارپائی مل گئی ہے تو وہ بڑا چراغ پا ہوا۔ اور کہنے لگا کہ تم ان سے کبھی روپیہ وصول نہ کر سکو گے۔ ان کو روٹی کھانے کو مل گئی۔ چارپائی سونے کو میسّر آگئی۔ سارا دن بیٹھے گذر گیا۔ یہ کیونکر روپیہ دینے لگے۔ پھر میری اور لالہ سندر لال کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ کہ تم آرام میں ہو۔ اس لئے ابھی تک تمہارا روپیہ نہیں پہنچا۔ بلکہ تم مطلوبہ رقم کا اقرار بھی نہیں کرتے۔ کل جو چار ہزار اور اڑھائی ہزار کی رقم تم سے لکھائی گئی تھی۔ وہ غلط ہے۔ دوسروں کی غیر حاضری میں یہ کیسے فیصلہ کر سکتے تھے۔ وہی بارہ بارہ ہزار کی رقم تم سے لیں گے۔ رات گذرنے دو صبح میں تم سے سمجھ لوں گا۔ مختصر الفاظ میں اس کا یہ وعدہ ہمارے دلوں میں تیر کی طرح بیٹھ گیا۔ غرض رات اس کے وعدہ کی یاد میں بے چینی اور اختر شماری میں کٹی۔ انتہائے یاس میں اگر کوئی بھروسہ تھا تو صرف اس قادرِ مطلق کی ذات کا تھا۔ جو مظلوم کی فریاد سنتا ہے۔ ؎

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

جب دن کا شہنشاہ پُرخون آنکھ سے گھورتا ہوا مشرق سے جلوہ گر ہوا تو

تاروں کی بیقراری اور گھبراہٹ پر اسے ذرا رحم نہ آیا۔ اور اپنے سنہری چمکتے ہوئے نیزوں سے سب کو نیست و نابود کر دیا۔ سچ ہے زبردست ہاتھ زیر دستوں کی ہستی نہیں دیکھ سکتا۔ تاریخ عالم اس حقیقت کو صاف صاف بتا رہی ہے۔ کہ آغاز آفرینش سے اب تک جس قوم نے دوسری پر غلبہ پایا تو جب تک مغلوب کی ہستی کو مٹا نہ دیا آرام نہ لیا۔ آریاؤں نے جب ہندوستان کے قدیم باشندوں پر فتح پائی تو ان سے کیا کیا تعدی نہ کی۔ ان کو یہاں تک رذیل بنایا کہ اپنی غلامی میں لینا عار سمجھتے تھے۔ حتےٰ کہ وہ بیچارے دستِ ظلم سے تنگ آکر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے۔ اور اب ان کی ہستی برائے نام رہ گئی ہے۔ کولمبس نے جب نئی دنیا دریافت کی اور وہاں کے لوگوں کو مطیع کیا تو انھوں نے سپین والوں کے ہاتھوں کون سا ظلم اور بے عزتی باقی رہی جو نہ سہی۔ اور اب ڈھونڈنے سے ان مظلوموں کی کتنی بستیاں اس سارے برِاعظم میں ملیں گی۔ یہودیوں نے عیسائیوں کے دست تطاول سے کیا کیا سختیاں نہ جھیلیں۔ مسلمانوں نے سپین والوں کے ہاتھوں کیا کیا ستم نہ اٹھائے۔ غرض جس نے غلبہ پایا دوسرے کو پیس ڈالا۔

قرونِ وسطیٰ میں مغربی قوموں کی بہیمیت اور بربریت کی کوئی زندہ یادگار باقی ہے۔ تو ہمارے ان خونخوار رزاریوں کی قوم ہے۔ رات بھر وہ بھی قیدیوں کی ایذا رسانی کے وسائل سوچنے کی لذت لیتے رہے ہوں گے۔ صبح اٹھتے ہی ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ خونخوار اژ نگے نے بلند آواز سے پکارا کہ سب قیدیوں کو میرے پاس لے آؤ۔ قیدی حاضر کئے گئے۔ صبح سے ہی دین نے

اور لالہ سندر لال نے مدے کا دامن پکڑا اور اس کے آگے رحم کی درخواست کی خدا کا خوف دلایا۔ لیکن وہ جواب دیتا۔ کہ "اس معاملہ میں میں بالکل بے بس ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں قیدیوں کی ایسے حالات میں مدد کروں۔ اگر میں کوشش بھی کروں تو مجھ پر شبہ ہوگا۔ اور ہمارے آپس کے تعلقات خراب ہو جائیں گے" لیکن آخر ہمارے حکایتیں بیان کرنے۔ اور لگاتار لجاجت اور زاری سے مدے کی پاک فطرت اس کے ماحول کی فضا اور اس کے اپنے مقتضائے وقت کی پستی سے بلند پرواز کر گئی۔ اور اس رحم و انسانیت کے پتلے نے ایک دل لبھانے والے تبسم میں نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ میں آج تم کو ان کے پنجوں سے بچائے رکھوں گا۔

جب سب قیدیوں کو حاضر کئے جانے کا حکم ہوا۔ تو مدے ہم دونوں کو لے کر مغل کے چھپر میں بیٹھا رہا۔ ادھر اٹنگے رعد کی طرح گرج گرج کر قیدیوں کی حاضری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ دو تین فراری اس کے حکم سے ہمیں لینے کے لئے آئے۔ لیکن مدے نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم خود اپنے قیدیوں کے مختار ہیں اس پر مدآمیر غصہ میں بھرا ہوا فوراً ہمیں لینے کے لئے آیا۔ میں اسوقت قرآن شریف ہاتھ میں لئے دو زانو بیٹھا اللہ کے آگے گریہ وزاری کر رہا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اتنی سکت نہ رہی کہ آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا۔ اس کے قہر و غضہ کے پہلے فقرے پتھروں کی طرح مدے پر برسے۔ جس نے نہایت تحمل کے ساتھ خاموشی سے ان کو برداشت کیا۔ مدآمیر نے کڑک کر کہا۔ کہ اگر تم نے ایسا ہی رحم دکھانا ہے۔ تو فدیہ کا روپیہ گھر سے

ادا کر دو۔ تمہاری نازبرداری سے ہماری امیدوں پر پانی پھر رہا ہے۔ اور ہماری سب محنتیں رائیگاں جا رہی ہیں۔ تمہارا کیا حق ہے کہ دوسروں کی مرضی کے خلاف قیدیوں کو چھپائے رکھو۔ پھر میری جانب اشارہ کر کے کہا۔ کہ اس مسلمان پر مجھے خود رحم آتا ہے۔[1] اس کے لئے میں ابھی چندے انتظار کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کافر کی طرف تو خیال کرو۔ (لالہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے) کل میں نے آکر دیکھا کہ بابو تو زمین پر نماز پڑھ رہا ہے اور یہ ......؟ پاس چارپائی پر بیٹھا گپیں ہانک رہا ہے۔ مجھے تمہاری غیرت اور مسلمانی پر تعجب آتا ہے۔ تم نے تو اسلام کا نام ہی ڈبو دیا۔ پھر لالہ سندر لال کی طرف لپکا اور ایسے ناموں سے مخاطب ہوا جن کا اعادہ تہذیب کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ ان کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر لیا مدآمیر کے چہرہ سے اس وقت ایسا جلال ٹپک رہا تھا۔ کہ مدے کے منہ سے بھی کوئی لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ سب خاموشی سے اس کی حرکات کا ملاحظہ کر رہے تھے۔ اور وہ قیصر کی طرح اس وقت حکمرانی کر رہا تھا۔ لالہ صاحب کا رنگ اس وقت ہلدی سا زرد ہو رہا تھا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انہوں نے مدآمیر کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بیان میں نہ آنی والی نظر مجھ پر ڈالی۔ اور مدآمیر کے ہمراہ ہو لئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ مدآمیر انکو اس طرح لے گیا جیسے بلی چوہے کو لے جاتی ہے۔ وقت کی نزاکت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی لفظ زباں سے نہ نکل سکتا تھا۔ میں نے التجاؤں میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے مدے کو دیکھا۔ اور پھر وہی نگاہ لالہ صاحب کی طرف پھرائی۔ نگاہوں کا جواب نگاہیں

[1] میں اس کے اس جملے کو قرآن کریم کی برکت کے طفیل سمجھتا ہوں۔ اور یہ محض اللہ کا فضل تھا۔

دے رہی تھیں۔ مدّے کی نظر سے کسی قسم کی شکست کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ بلکہ اس کے چہرہ سے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے مصمم ارادہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہ صاف کہہ رہی تھی "دیکھو تو کیا ہوتا ہے" نگا ہونکے اس تبادلہ کے بعد مدّے بھی دوسروں کے ہمراہ چلا گیا۔ میں نے جھٹ اٹھ کر چھپر میں پھوس کو ہاتھ سے ہٹا کر سوراخ کیا۔ اور نظارہ دیکھنے لگا۔ گاؤں کے سارے قزاق اڑنگے کے گھر کے سامنے جمع تھے۔ بے بس قیدیوں کے جسموں پر سے کپڑے اتارے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے سونٹے قزاریوں نے لے رکھے تھے۔ پاس آگ کے شعلے نکل رہے تھے جس میں لوہے کی سیخیں گرم کرنے کے لئے رکھی ہوئی تھیں۔ جب مدّا میر لالہ صاحب کو لیکر پہنچا۔ تو ان کے جسم سے بھی کپڑے اتارنے لگے۔ اس وقت مدّے نے قزاریوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے قیدیوں کا معاملہ دوسرے قیدیوں سے مختلف ہے۔ ابھی پرسوں لوانہ ملک آیا تھا۔ اور اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ فدیہ کا روپیہ تیار ہے۔ صرف اس کو پہنچانے کا بندوبست ہو رہا ہے۔ قیدیوں کو ایذا صرف اسی لئے دی جاتی ہے۔ کہ روپیہ کا بندوبست جلدی ہو۔ تو پھر ان حالات میں ہم اپنے قیدیوں پر خواہ مخواہ ظلم کیوں کریں۔ میں نے اور ملدا دنے لوآنہ ملک کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ ایک ہفتہ تک ہم قیدیوں کو کوئی تکلیف نہ دیں گے۔ تو پھر آج ہم کیوں وعدہ خلافی کریں۔ اس پر لالہ سندر لال سے کسی نے تعرض نہ کیا۔ اور دوسرے قیدیوں پہ پل پڑے قیدیوں کے ننگے بدنوں پر سونٹوں۔ مکّوں۔ گھونسوں کی بچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور

عجیب ہنگامہ برپا ہو گیا۔ قیدی چیخنے چلاتے تھے۔ فراری فتحمندانہ شور کرتے تھے۔ مُنہوں پر جھاگ آئی ہوئی تھی۔ اور بد زبانی کر رہے تھے۔ قیدی زمین پر گر گر پڑتے۔ کوئی ٹھوکریں مارتا۔ کوئی لاٹھی چلاتا۔ اور کوئی ہاتھوں سے ہی ارمان نکالتا۔ اس منظر کو دیکھ کر چند ایک عورتوں کا دل تاب نہ لا سکا۔ وہ قیدیوں کو چھڑانے بڑھیں۔ اپنے مردوں کو گالیاں دیتیں۔ رحم کی درخواست کرتیں اور ہاتھوں سے ان کو ہٹاتیں۔ لیکن نقّارخانے میں ان کی کون سنتا تھا۔ البتہ ان کے شامل ہونے سے شور و غل اَور بڑھ کر محشر بپا ہو گیا۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ سیخیں گرم ہو گئی ہیں۔ اس پر طوفان تھما۔ ہانپتے کانپتے قیدیوں کو اکٹھا کیا۔ اور گرم لوہے سے جسموں پر داغ لگانے کا مشغلہ شروع ہوا۔ انسانوں کے جسم کو لوہے سے اس طرح جلتا دیکھنا بڑا دردناک نظارہ تھا۔ ہم تو خیر بعض عورتیں زار زار رو رہی تھیں۔ زردلی بہت سنگدل تھا لیکن اس کی نازک دل بہن سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا۔ اور اس نے دوڑ کر جلانیوالے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور رو کر رحم کی درخواست کی۔ اس پر زردلی نے اپنی بہن کو دھکے دیکر باہر نکال دیا۔ لیکن اس دردناک نظارے نے اس کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اسی روز بخار میں مبتلا ہوئی اور چار پانچ دن کے اندر ہی جان بحق تسلیم ہوئی۔

ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

خداوندکریم ایسی پاک روح کو اپنے ظلِّ مغفرت میں جگہ دے۔ ایسے گلِ رعنا کے عین عالمِ شباب میں یوں برباد ہو جانے سے اس کے بھائی پر گہرا اثر ہوا۔

اور اس کے بعد اس نے ظلم و تعدی میں حصہ نہ لیا۔ بلکہ ساتھیوں کو بھی سمجھایا کہ ان بیچاروں کا کیا قصور ہے بجیب میں تھوڑا ہی رکھا ہے کہ نکال کر دے دیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ایک قیدی کو پکڑ کر درمیان میں کھڑا کیا گیا۔ اور اس دھکتے ہوئے لوہے سے اس کے جسم پر داغ دیا گیا۔ ایک جونک کو تھوڑے سے پانی میں ڈال کر ہاتھ سے چھوئیے۔ یا ایک نیم جان سانپ پر آگ کا کوئلہ رکھ کر دیکھئے۔ جس طرح یہ ایک لمحہ میں کئی پیچ و تاب کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح لوہے کے چھونے سے قیدی کے اعضا تڑپ اٹھے۔ اور ایک دردناک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ع

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

اس کا حظ بار بار اٹھانے کے لئے سات داغ اس کے جسم پر لگائے۔ کہتے ہیں کہ شدتِ رنج سے خون کے آنسو نکل آتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ کیا تو یہاں کیا۔ بلا مبالغہ قیدیوں کی آنکھوں میں خون کے جالے پڑے ہوئے تھے۔ اور سفیدی اور سیاہی یکساں خون کی طرح نظر آتی تھی۔

آہ سات بار کے داغ سے انسانی خون نے لوہے کو ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن انسانی غصہ کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکا۔ سلاخ پھر آگ میں رکھ دی گئی۔ دوسرے قیدی کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ تیسرے قیدی نے بیتابی حد سے زیادہ دکھائی جس سے جلاد کو زیادہ مزا آیا۔ اور اس نے اس کے پہلو میں سلاخ گھونپ دی وہ تو خیر گذری کہ سلاخ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ بیچارا دھم سے گر العضوں

نے شور مچایا کہ مردار ہو گیا یعنی مر گیا۔ اٹھا کر چھپر میں لے گئے۔ اور خدا جانے غریب کو کب ہوش آیا۔ اس اثنا میں لالہ صاحب نے پھر مدّے کے رحم کو جنبش دی۔ انہیں ڈر تھا۔ کہ اس لذت کے لئے کہیں انہیں بھی تختۂ مشق نہ بنا لیں۔ لیکن اصل میں فراری بھی اس منظر سے کافی متاثر ہو چکے تھے چنانچہ لالہ صاحب صحیح و سالم واپس چھپر میں میرے پاس پہنچ گئے۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اگرچہ لالہ صاحب تو بچ کر آ گئے۔ لیکن دوسروں کے پُرزے اُڑنے کا خوب ہی تماشا ہوا۔

مدّا میر بھی فوراً ساتھ ہی چھپر میں پہنچ گیا۔ اس کے ہمراہ چند اور فراری بھی تھے سب آ کر چھپر میں بیٹھ گئے۔ میں جا نماز پر پنجسورہ کھولے بیٹھا تھا۔ لالہ جی پاس ہی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے اور خاص کر لالہ جی کے اس طرح بچ رہنے کا ارمان رہ رہ کر اس کے دل میں اٹھتا۔ اس کا جوش ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ عقابی آنکھوں سے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے شکار کی تلاش میں ہو اس کی زبان قینچی کی طرح ہمارے دل کو کترتی جاتی۔ بجلی کی طرح کڑک کر اس نے لالہ جی کو مخاطب کیا۔ جو کام مدّے نے اسے ہاتھ سے کرنے نہیں دیا تھا۔ وہ اب زبان سے کرنا چاہتا تھا۔ جوش میں آ کر بار بار انکی طرف لپکتا لیکن مدّے

حائل ہو جاتا۔ اس کی بدکلامی اور بدلگامی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بالمقابل لالہ سند لال رنگ فق حیرانی کی صورت بنے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بت کی مانند اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کا بدن کانپ رہا تھا۔ مدآبیر کا استدلال یہ تھا۔ کہ آج تو آنہ ملک کے وعدہ کو مدِنظر رکھ کر تمہیں مہلت دی گئی ہے۔ لیکن اگر وعدہ پُورا نہ ہُوا تو پھر میں آکر ایسا عذاب دوں گا۔ کہ آج کی کسر بھی نکل جائے گی ایسے خرافات بکتا کہ خدا کی پناہ۔ اس کے آواز میں ایک خاص ترنم تھی جو تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی۔ اس کی ہیبت کے خیال میں جو جو فتنے آسکتی تھیں۔ سب کا نقشہ اس نے کھینچ دیا۔ غرض بلند آہنگی میں بے حد زجر و توبیخ کے بعد اس نے لالہ صاحب کو چھوڑ کر میری طرف رخ کیا۔ اس اثنا میں مَیں نے مچھیودہ سے دشمن کو مغلوب کرنے کی اور اس کے ایذا سے بچنے کی دعا کا ورد شروع کیا ہوا تھا۔ جب وہ میری جانب مخاطب ہوا تو میں نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کہ کون ہے اور کیا بکتا ہے۔ میرا یہ خشوع دیکھ کر خدا جانے اس کے غصّے پر کیسا پانی پڑ گیا۔ کہ پہلی آواز بالکل بدل گئی۔ اور ذرا نرم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ کہ بابو اگر تم انگریز کے نوکر نہ ہوتے۔ اور پھر ایسے دیندار ہوتے۔ تو ہم تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے"۔ اس کے جواب میں مَیں نے کوئی لفظ نہیں کہا۔ البتہ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر لیں۔ گویا اس جملہ سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس پشیمانی کی حالت میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتوں کا ان پر بہت اثر ہوتا۔ اسوقت مدا خیل میری طرف مخاطب ہوا۔ اور سوال کیا کہ بابو اگر تم یہاں سے چھوٹ جاؤ۔ تو پھر فرنگی کی نوکری کرو یا نہیں"؟ یہ سوال عین میرے حسب خواہش تھا۔ میں نے

اس سوال پر تھوڑا سا تامل کیا۔ اور پھر ایک ایسے مایوسانہ لہجے میں جس سے ثابت ہو کہ سچائی کے مقابلے میں مَیں ان کے غصّے کی پرواہ نہیں کرتا مَیں نے جواب دیا۔ کہ اس وقت میرے دل کی حالت اور ہے۔ اور آزاد ہو کر اور ہو گی۔ پھر خدا جانے کیا پیش آئے اور کیا نہ آئے۔ اس جواب نے پُورا اثر دکھایا۔ کیونکہ اسی مخاطب نے ایک مسلمان منشی کو پکڑا تھا جس نے اُن سے بہت وعدے کئے تھے۔ کہ میں نے انگریزوں کی نوکری سے توبہ کی ہے۔ اور پھر کبھی کافر کی نوکری نہ کروں گا۔ لیکن آزاد ہونے پر وہ اسی جگہ بدستور ملازم رہا۔ اور یہ لوگ اس کا حال جانتے تھے۔ اس لئے میرے جواب کی سادگی کی اس نے تعریف کی۔ اور فیصلہ دیا۔ کہ اس کے دل میں کوئی دغا یا فریب نہیں۔ چنانچہ مدآمیر بہت نرم ہو گیا۔ اور کہا کہ بابو تمہارا روپیہ خواہ دیر سے کیوں نہ آئے میں تمہیں تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔ لیکن اس کافر کے بارہ میں تم نے ہم سے کبھی سفارش نہ کرنا۔ میں نے کہا کہ قید میں ہم دونوں بھائی ہیں اور اس کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف سمجھتا ہوں۔ ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

کہاں وہ ڈنڈے چلانا اور گرم لوہا لگانے کے لئے لے جانا! اور کہاں یہ خیال پیدا ہو جانا کہ اگر یہ سفارش کرے گا تو شاید ہمیں ماننی پڑے۔ اس قسم کی مثالوں سے میرا یقین ان آوردا[1] پر بہت بڑھتا گیا۔ اور اس قسم کے کرشمے میں نے بہت دیکھے۔

مدآمیر واپس خوست جانے کے لئے تیار تھا۔ اور ایک بڑے پیمانہ پر

[1] جمع ورد

دہاڑے کا بندوبست کر رہا تھا۔ جاتی دفعہ اس نے ہم کو سمجھا دیا کہ چوتھے دن تمہارا روپیہ آنے کا وعدہ ہے۔ میں پانچویں دن آؤں گا۔ اور پھر تم سے سمجھوں گا۔ لیکن خدا نے اس کے ساتھ ایسا سمجھا کہ ہمارے ہوتے پھر اس کی خبر تک نہ آئی۔

ہمارے جلائے جانے کے تیسرے روز صبح کے دس بجے کے قریب تین سپاہی جن کا پہلے بھی ہمارے گاؤں میں گذر تھا۔ آئے اور اڑنگے کے پاس چھپر کے باہر بیٹھ گئے۔ میرے دل میں ابھی تک یہ گمان باقی تھا کہ شاید میں سرکاری ملازموں یا افسروں کی معرفت رہائی پا سکوں۔ اس لئے میں ان تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا۔ ان سپاہیوں کے پیچھے ایک خاصہ دار تشریف لائے اور وہ بھی انہیں کے پاس آ بیٹھے۔ میں نے خط لکھنے کے واسطے کاغذ لینے کے بہانہ عورتوں سے اجازت لی اور اڑنگے کے پاس چلا گیا۔ کاغذ طلب کیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اڑنگے اس وقت چارپائی کے پائے بنا رہا تھا۔ سارے گاؤں میں مَیں نے اڑنگے کو یا خٹکوں کو ہاتھ سے کام کرتے دیکھا۔ ورنہ اس گاؤں کے کسی باشندہ کو میں نے محنت کی طرف رجوع کرتے نہیں پایا۔ سپاہی اور خاصہ دار چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ اُن کی کوئی وردی نہیں تھی۔ البتہ اپنی سفید پوشاک سے دوسری رعیت سے متمیز تھے۔ میں اپنی زنجیر ان کے سامنے کر کے بیٹھ گیا۔ اور بتدریج سلسلۂ سخن اپنی طرف لایا۔ خاصہ دار مجھے کچھ متاثر معلوم ہوا اور اس کی باتوں سے پایا گیا۔ کہ وہ کسی قدر خواندہ ہے۔ اپنے خاندان کی بزرگی جتانے کے لئے میں نے بیان کیا کہ قبلہ گاہی مدرسہ میں لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اب وہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ خاصہ دار حیران ہو کر بولا۔ او ہو! اتنا بڑا گناہ خود گزید!

تو اللہ کا گناہ ہے لیکن اتنی خلقِ خدا کو گمراہ کرنے والا کبھی نہ بخشا جائے گا۔ اس سے بڑھ کر کفر اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے اس بات کو بھی ٹالا۔ اور پھر باتوں میں اسے متاثر پاکر ایک آہ سرد کھینچی۔ اور قرآن مجید کی آیت پڑھی :۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا[1] اور ترجمہ کر کے اسے سنایا۔ اس کے جواب میں تھوڑے سے مراقبہ اور تامل کے بعد وہ بولا کہ کل ہی ایک کتاب میں میں نے پڑھا ہے۔ کہ اگر ایک فرنگی قلم سے لکھ کر اسے میز پر رکھ جائے۔ اور ایک مسلمان جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ اور بالکل معصوم اور قطعی بہشتی ہو۔ اگر اسی قلم سے لکھے تو وہ قطعی کافر ہے۔ اس کا قتل دوسرے مسلمان پر فرض ہے۔ تمہیں جو انہوں نے اب تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ تو محض دنیاوی منفعت کی خاطر۔ ورنہ تمہیں زندہ چھوڑنا گناہِ عظیم ہے۔ اس تقریر پر اڑنگے نے بہت سے حاشیئے چڑھانے شروع کئے۔ میں ڈر گیا۔ کہ کوئی آفت نہ آ جائے۔ اور پیچھا چھڑا کر بھاگا۔

رات کو ایک خوست دال بلیامین نامی بنوں جاتا ہوا ہمارے گاؤں میں فروکش ہوا۔ زروَلی سے اس کی کچھ روشناسی تھی۔ اس نے کچھ طمع دے کر بلیامین کو لالہ لکھمی چند کا خط لے جانے کے لئے کہا۔ بنوں سے پرے وہ ایک گاؤں کو جا رہا تھا۔ اور اس کو واپس بھی جلدی آنا تھا۔ اس لئے اس نے خط کا لیجانا بخوشی منظور کیا۔ رات کا ایک حصّہ گذر چکا تھا۔ چاند اپنی چاندنی سمیٹ کر پہاڑ کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اس وقت لالہ لکھمی چند کا خط لکھنے کے لئے

---

[1] اور جس نے مومن کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور ان پر اللہ کا غضب ہوا۔ اور خدا نے اس کو پھٹکار دیا۔ اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا۔

مجھے بلایا گیا۔ مزرئی جلا کر آگ روشن کی گئی۔ فراری لوگ ہمارے گرد چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اور مندرجہ ذیل مضمون تین قطعات کاغذ پر تحریر کر کے ان کے متعلقین کی طرف بھیجا گیا۔ .... "میری رہائی کے لئے چھ ہزار روپیہ کلدار مقرر ہوا ہے۔ یہ لوگ زیادہ مانگتے تھے۔ چھ ہزار پر میں نے خود فیصلہ کیا ہے۔ اب اگر میری زندگی چاہتے ہو۔ تو چھ ہزار روپیہ کلدار لے کر کیتو کے رستہ جان ملک کی معرفت پہنچو۔ پھر ان فراریوں کے رحم پر منحصر ہوگا۔ کہ خواہ سارا روپیہ لیں۔ خواہ کچھ چھوڑ دیں۔" اس خط میں بہت سی تکالیف کا ذکر کیا گیا۔ اور چونکہ لالہ لچھمی چند کے سامنے فراری لوگ ان کے والد کو سخت زخمی کر آئے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی کا حال بھی پوچھا۔ اگرچہ فراریوں نے یقین بھی دلایا۔ کہ وہ ضرور مر گئے ہونگے۔ انہیں سے ایک مکتوب الیہ لالہ سندر لال کا بھی آشنا تھا۔ چنانچہ اس پرچہ میں لالہ صاحب نے بھی چند سطور اپنے بارے میں لکھائیں۔ اور اپنے ایک اور دوست لدھا رام ٹھیکہ دار کی طرف بھی خط لکھوایا۔ بلیامین کی مزدوری پانچ روپے اور ایک لسبے کا تبر مقرر ہوئی۔ بلیامین یہ خطوط لے کر روانہ ہوا۔ اور ہم اس کی واپسی کے لئے ہمہ تن انتظار ہو گئے۔

آج رات ایک فراری مسمی شاجا میرخوست سے بطور مہمان وارد ہوا۔ وہ مغلم اور مدے سے کچھ رشتہ میں تعلق رکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں اور چہرہ سُرخ تھا۔ زردلی سے شکل میں بہت مشابہ تھا۔ ایک لمبی زرد و زکمربند زیب کمر کئے ہوئے تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ریشمی لنگی اس کے قدرتی وقار اور متانت کو دوبالا کر رہی تھی۔ مغلم اور خونے سے ایک ضروری مشورہ کے لئے

وہ آیا تھا جس کی نوعیت یہ تھی۔ کہ جس گاؤں سے شاتاجا میر فرار ہوا تھا۔ اس گاؤں کا ایک آدمی کسی اور گاؤں کے کسی شخص نے قتل کر دیا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ چلو بدلہ لیں اور اگر کوئی شکار بھی مل گیا تو ایک پنتھ دو کاج۔ خو نے اور معلم بھی جانے پر تیار ہو گئے۔ چنانچہ صبح کو خو نے معلم اور شاتاجا میر تینوں روانہ ہو گئے۔

اُن کے چلے جانے کے دوسرے روز (قریب ۱۴ مئی ۱۹۱۰ء) میں ظہر کی نماز ادا کر کے چار پائی پر بیٹھا تلاوت کر رہا تھا۔ کہ نیک نامے نے کہا وسیم گل آ گیا۔ اس ذاتِ شریف کا نام سن کر لالہ صاحب بھی چوکنے ہو گئے۔ اور میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک عورت بھی گٹھڑی اٹھائے آ رہی تھی۔ مجھے اپنی مصیبت بھول گئی اور سخت بیقراری محسوس ہوئی۔ کہ خدا نہ کرے ایک بے کس عورت اس موذی کا شکار بن گئی ہو لیکن معلوم ہوا کہ عورت مقتول خاوند کا اسباب لینے خود اس کے ہمراہ آ رہی تھی۔

وسیم گل کی تشریف آوری پر میں اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ جیسے مدت کے بچھڑے ہوئے دوست بغلگیر ہوتے ہیں۔ مزاج پرسی کے تھوڑی دیر بعد بڑی بے چینی سے اپنا حال دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا بابو تھوڑی دیر صبر کرو۔ اب تم جلدی انشاء اللہ رہا ہو جاؤ گے۔ صاحب ضلع (یعنی پولیٹیکل ایجنٹ) نے بارہ ہزار کا جرمانہ تین بڑے گاؤں پر تقسیم کر دیا ہے۔ اور ملکوں کو اس کی وصولی کے واسطے سخت ایذائیں دے رہا ہے۔ ان دنوں لاٹ صاحب (چیف کمشنر صاحب) کی آمد تھی۔ توچی کے سرگروہ ملکوں نے دوڑ آبادی کو جمع کیا۔ اور آمد کے روز سپین وام کی سڑک کے کنارے پر کھڑے ہو گئے۔

کئی گاؤں کے لاتعداد لوگ جمع تھے۔ جب لاٹ صاحب آئے تو سب نے یکزباں عرض کی۔ کہ صاحب افراری لوگ خوست سے آکر وارداتیں کرجاتے ہیں۔ ہمارا نقصان بھی کر جاتے ہیں۔ اور آدمی بھی مار جاتے ہیں۔ جس کا کوئی تدارک ہم نہیں کرسکتے۔ اس پر الٹا بھاری جرمانہ ہم پر کیا جاتا ہے۔ یا تو ہماری اس شکایت پر غور کیا جائے۔ یا اجازت دی جائے کہ ہم کسی اور ملک میں جا رہیں اس کے جواب میں لاٹ صاحب نے کہا۔ کہ جب تم نے مدد کی التجا کر کے ٹوچی سرکار کے حوالے کی تھی تو تمہارا اقرار تھا۔ کہ سڑک پر یا اس کے ارد گرد اگر کوئی واردات ہو جائے۔ تو تم اس کے ذمہ وار ہو گے جس طرح ہو سکے بابو کو پیدا کردو۔ ورنہ پندرہ یوم کے اندر جرمانہ ادا کرو۔ تاکہ ہم خود اسے چھڑائیں۔

اس معقول جواب سے ناامید ہو کر ملک اب تُخّی لے کر ہمارے پاس آنے والے ہیں۔ تاکہ ہم تم کو مفت چھوڑ دیں۔ ہم کو چاہیئے کہ ان سے اپنا بدلہ لیں۔ تنگئےؔ[1] کے پاس جا کر مورچہ پکڑ لیں۔ جب گذرنے لگیں تو نصف کو تو وہیں ڈھیر کر دیں۔ اور باقی کو لا کر یہیں قید رکھیں۔ وسیم گل ان ملکوں کو کاٹھ لگا کر قید کرنے اور طرح طرح کی اذیتیں دینے کا خیال کر کے خوب مزے لیتا رہا۔ دوسرے روز مُعَلّم اور خوتے نے بھی واپس آگئے۔ انہوں نے آکر بھی موبمو یہی قصہ بیان کیا۔ اس خبر کو دو مختلف ذرائع سے سُن کر تصدیق ہو گئی۔ کہ واقعی یہ سچ کہہ رہے ہونگے اور ہماری رہائی کی امیدیں تازہ ہو گئیں۔ اب وسیم گل کو یہ خیال ہوا۔ کہ واقعی اگر وہ پہنچ گئے۔ تو ایک تو ہمارے پاس اتنی بڑی جماعت کو کھانا کھلانے کو کچھ نہیں دوسرے ممکن ہے کہ وہ کوئی فساد کھڑا کر دیں۔ اس لئے ان کا روک دینا مناسب

[1] ایک درہ کا نام ہے ۱۲

سے ہے۔ چنانچہ وسیم گل میجر صاحب کے پاس گیا۔ جواب قلعہ میں متمکن ہو گئے تھے
اور ان کو سمجھایا۔ میجر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ملکوں کو بغیر شاغاشی کے پروانہ
راہداری لئے گذرنے کی ہرگز اجازت نہ دیں گے۔ میں نے وسیم گل کو اس تجویز سے باز
رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے نہ مانا۔ اور خوست جاکر شاہ غاشی تک بھی
اپنی درخواست پہنچا آیا۔

خوسے نے اور مغلم کو راستہ میں کوئی شکار نہیں ملا۔ لیکن وہ شاجا میر کا بدلہ لینے
میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے شوق کے ساتھ اپنا قصہ
سنایا۔ کہ ہم گاؤں کے پاس شاہ راہ کے قریب رات کو چھپ گئے۔ حتےٰ کہ
ایک نوجوان ایک بارہ چودہ سالہ لڑکے کے ساتھ فصلوں کو پانی دینے کے
لئے آیا۔ جب وہ ہماری زد پر پہنچا تو ہم نے اکٹھے فائر کئے۔ نوجوان دو گولیوں کا
نشانہ بنا۔ لیکن لڑکا بچ کر بھاگ گیا۔ نوجوان نے ایک چیخ ماری اور تڑپ کر وہیں
ٹھنڈا ہو گیا۔ جان نکلتے وقت جو کراہنے کی آواز اس کے منہ سے نکلتی رہی۔
اس کی نقل نہایت مزے اور مذاق سے کرتے تھے۔ اور اپنی کامیابی پر
پھولے نہ سماتے تھے۔ البتہ لڑکے کے بچ نکلنے کی انہیں بہت حسرت تھی۔

اگلے روز زرولی کی بہن رہ گرائے عالم بقا ہوئی۔ عورتوں نے ہمارے
ملک کی مستورات کی طرح رونا پیٹنا شروع کیا۔ اور گرد کے گاؤں کی مستورات
بھی تعزیت کے لئے آئیں۔ اور بڑا شور برپا رہا۔ ظہر کے وقت اس کا جنازہ
اٹھایا گیا۔ جس میں گاؤں کے سب افراد شریک تھے۔ عورتیں تھوڑی دور
سے واپس آگئیں۔ دھوپ بڑی کڑی تھی۔ اور قبرستان نصف میل سے زیادہ

فاصلہ پر تھا۔ ایک لمحہ بھی دھوپ میں کھڑا ہونا دشوار تھا۔ تجہیز و تکفین کے بعد سب سے پہلے وسیم گل لوٹ آیا۔ وہ دھوپ سے بدحال ہو رہا تھا۔ اس شہیدِ ستم کی وفات کا موجب ہم لکھ چکے ہیں۔ اس لیے جو اثر ہماری طبیعتوں پہ ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ع

ازبرائے سوختن شد ساختہ ایں سازہا

پیرِ گردوں مے کند با نازنیناں نازہا

دوسرے روز عین دوپہر کے وقت خبر ملی۔ کہ ایک دہاڑ اپڑا اور زاریوں کے تمام مویشی ہانک لے گیا۔ اس کی تحقیق کرنے کی کس کو فرصت تھی آناً فاناً برقی رو کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ اور جہاں جہاں اس گاؤں کا کوئی آدمی تھا دوڑتا ہوا چلا آیا۔ ہر ایک جوان اپنے معمولی ہتھیاروں سے آن کی آن میں مسلح ہو گیا۔ کمریں کس لیں۔ کمربندوں میں خنجر لٹکا لیے۔ رائفلوں میں کارتوس ڈال کر نکل پڑے۔ اس وقت انہوں نے یہ انتظار نہیں کیا۔ کہ دو چار کی جمعیت اکٹھی ہو لے تو چلیں۔ بلکہ جو مسلح ہو انکل گیا۔ سب سے پہلا جوان جو میدانِ جانبازی میں نکلا ہمارا خوتنے تھا۔ اس کے پیچھے وسیم گل حتیٰ کہ سارا گاؤں مردوں سے خالی ہو گیا۔ دوپہر کی سخت دھوپ سے گھاٹیاں تپ رہی تھیں۔ اور سایہ میں بیٹھے بیٹھے لب خشک ہو رہے تھے اس دوزخ کی آگ میں وہ بے سروسامان پروانوں کی طرح کود پڑے۔ گویا جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ اگر اس روزِ روشن میں مقابلہ ہو گیا تو جانبین سے بیسیوں کے خون سے زمین لالہ گوں ہو جائے گی۔ ان کی یہ مردانگی اور موت کے

منہ میں کودنا دیکھ کر میرے دل میں عجب ولولہ پیدا ہوا۔ اور جوش اس قدر ابھرا کہ سنبھل نہ سکا۔ بے اختیار ایک رائفل جو خوسنے کے چھپر میں زائد لٹک رہی تھی لے کر ان کے ہمراہ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں یہ کب گوارہ ہو سکتا تھا۔ ایک معمولی سی مسکراہٹ میں جواب تھا۔ کہ تم زنجیروں میں کیونکر جا سکتے ہو۔

مدتے اس وقت غیر حاضر تھا۔ اس کے لئے باقی فراری تاکید کر گئے کہ وہ قیدیوں کی حفاظت کے لئے گاؤں میں رہ جائے۔ یہ عمر رسیدہ ہونیکے علاوہ بھدّی ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اور چالاکی و چستی کے کام کا نہیں رہا تھا۔ فراریوں کے چلے جانے کے بعد یہ بھی مٹکتا مٹکتا پہنچا۔ اور ان کے پیچھے جانے کے لئے آمادہ ہوا۔ عورتوں نے اس سے کہا کہ وہ قیدیوں کی حفاظت کے لئے یہاں رہے۔ اس کی جوان حسین عورت اس سے لپٹ گئی۔ اور کہنے لگی کہ خدا کے واسطے نہ جاؤ۔ بڑھاپے میں جوانی کا جوش نہ دکھاؤ۔ لیکن اس نے کسی طرح عورتوں کا کام اپنے ذمہ لینا گوارہ نہ کیا۔ اس کی رائفل ایک اور آدمی لے گیا تھا۔ یہ شیر افگن بے ہتھیار ہی نکل کھڑا ہوا۔ میں نے بھی التجا کی۔ اس نے جواب دیا کہ میرے ساتھی مجھے بزدل کہیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا وہ تکلیف میں ہوں اور میں اکیلا عورتوں میں بیٹھا رہوں میں نے بھی دل میں کہا چلو مرنے دو۔

مردوں کے چلے جانے کے بعد ادھیڑ عمر عورتوں نے پانی کے مشکیزے بھر لئے اور مردوں کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ مضبوط عورتوں نے قیدیوں کو پا بہ زنجیر ایک چھپر میں لا بٹھایا۔ اور چوکیداروں کی طرح حفاظت کرنے لگیں۔

کسی قیدی کی دلیری دکھانی اس وقت محض حماقت تھی۔ اس لیئے ہم اپنی دلی آرزوؤں کے برخلاف ان کی سلامتی کے لیئے دعائیں مانگنے لگے۔ لیکن انجام بخیر ہوا ایک رائیفل کی آواز آئی۔ اور تلورآم نے نتیجہ نکالا کہ جیغہ واپس ہو گیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خبر بے بنیاد نکلی۔ اور سب کے سب شرمسار واپس لوٹ آئے۔

ہمارے قیام کی پہاڑی کے دامن میں زمین کا ایک سرسبز ٹکڑا تھا جو قریب کے گاؤں کینگی نامی کی ملک تھا۔ فراریوں کے مویشی کبھی کبھی جا کر اسے برباد کر آتے۔ ایک روز گاؤں والوں کو مالک نے آکر گالیاں بکنی شروع کیں۔ انہیں غصہ آگیا۔ دس پندرہ آدمی اکیلے پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے وحشت ناک تہور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ مالک نے ذرا گھبراہٹ ظاہر نہیں کی بھاگ جانا عار سمجھا۔ اور خود پتھر اٹھا کر ان پر حملہ آور ہوا۔ لیکن حملہ کے پہلے پتھر نے اسے گرا دیا۔ اور مل کر سب نے خوب ٹھونکا بیچارا مشکل سے جان بچا کر بڑبڑاتا ہوا اپنے گاؤں پہنچا۔ اور ابھی فراری اس کے پٹنے کا ذکر فاتحانہ طور پر کر ہی رہے تھے۔ کہ ایک مسلح لشکر ہمارے گاؤں پر چڑھ آیا۔ یہ دیکھ کر فراریوں کے ہوش بھی اڑ گئے۔ اور صلح کرتے ہی بنی۔ بے ہتھیار ان کے استقبال کے لیئے گئے۔ اور وہیں بیٹھ کر ان سے صلح کی اس شرط پر کہ رات کو فراری لوگ انکے گاؤں نئوتی سے کر جائیں۔ ان گاؤں والوں سے فراریوں کو بہت دبنا پڑتا کیونکہ خوست کو راستہ گاؤں کے نیچے سے ہو کر گذرتا۔ اور وہ انہیں بہت تنگ کر سکتے تھے۔

اس چمن میں ہے یہ دستور کہ مرغانِ اسیر
قید میں رہ کے ہوا خواہیٔ صیاد کریں۔

چونکہ بستی کے قریباً ہر فرد کے ساتھ ہمارا کچھ نہ کچھ واسطہ پڑتا۔ وہاں کا ہر فرعونِ بے سامان اپنے آپ کو آقا۔ اور ہمیں غلام خیال کرتا۔ اور ہمارے رنج کے اسباب مہیا کرنا فرائضِ زندگی میں سے سمجھتا۔ اس لئے لازمی تھا کہ ہم ہر ایک کی طبیعت اور خصلت کا مطالعہ کر کے اسی رعایت سے اس کے خوش رکھنے کی سعی کرتے۔ چنانچہ ان کی مختلف طبائع کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ہمیشہ ان کی خیر خواہی کا دم بھرتے۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ ہم نے اپنے اردگرد کی قزاقانہ فضائے کی وحشت میں ایک حد تک نرمی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ گاؤں کے چند ایک فراریوں کا تذکرہ یہاں پر مختصراً تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عملداد خونے کا بھائی تھا۔ اس کا ذکر کئی ایک واقعات میں آگے آچکا

ہے۔ وہ مزاج کا بڑا اسٹرل تھا۔ میرے ساتھ خوش نے کے واسطہ سے اس کو بھی بدگمانی اور خصومت تھی۔ اس کی حد درجہ لالچی طبیعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کی مفلسی اور بیماری کا خیال کرتے ہوئے چپکے سے لوانہ ملک والا روپیہ اس کی نذر کر دیا۔ "زر بر سر پولاد نہی نرم شود" چنانچہ اس کی نفرت میری طرف سے بہت کم ہوگئی۔ اپنے فدیہ کے متعلق جو خطوط میں اپنے اقارب کو تحریر کرتا ان میں وہ اپنی بیگم صاحبہ کے لئے ریشمی ساڑھی کی فرمائش بھی لکھوا تا اور وہ توقع رکھتا تھا کہ فدیہ سے پہلے اس کا تحفہ آجانا لازمی ہے۔ اور میں بھی اس کی اس امید کو ہمیشہ تازہ ہی رکھتا۔ لالہ سندر لال نے اس کی تیمارداری۔ اور خدمت گزاری میں سعی بلیغ کی لیکن وہ اس کے باوجود لالہ صاحب کی مخالفت میں دریغ نہ رکھتا۔

خواڑے (بمعنی شیریں یا میٹھا) ایک خوبرو شریف الطبع نوجوان تھا۔ اصل میں وہ ٹوچی کے ایک ملک کا لڑکا تھا۔ اور کسی جرم کی وجہ سے فرار ہو کر قزاقوں کے ساتھ شامل ہوگیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جو تلو رام کو گرفتار کر لایا تھا۔ اور اب اپنے کئے پر پشیمان تھا۔ لالہ سندر لال پہلے سے اس کے آشنا تھے۔ اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ قابلِ اعتبار آدمی ہے۔ دوسرے فراریوں کو علم تھا۔ کہ اس کا باپ سرکارِ انگلشیہ سے اسکے لئے معافی کی کوشش کر رہا ہے۔ اور خود خواڑے بھی موجودہ زندگی سے تنگ آیا ہوا ہے۔ اور کوئی خدمت انجام دے کر وہ معافی خریدنا چاہتا ہے۔ لہذا اس کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے۔ اور اس کا ہمارے پاس بیٹھنا گوارا نہ کرتے

خواڑے کے ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے پوشیدہ طور پر اس سے رابطہ پیدا کیا۔ اور اس کو امید دلائی کہ رہا ہو کر میں اس کی معافی کے لئے کوشش کروں گا۔ چنانچہ ہم پوشیدہ ایک روز کلمہ شہادت پڑھ کر ایک دوسرے کے بھائی بنے۔ اور اس نے حلفیہ وعدہ کیا کہ وہ ہر طرح میری مدد کو تیار رہے گا۔ میں نے احتیاطاً اس کو کہا کہ میں تمہارے بھائیوں کے خلاف تم سے کوئی مدد نہ مانگوں گا۔

خواڑے سچے دل سے اس رشتۂ برادری کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ میرے سر میں اکثر درد رہا کرتا۔ اس نے ایک روز سبب پوچھا۔ میں نے جواب میں ناموافق اور خشک غذا کا ذکر کیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ شام کو وہ چپکے سے ایک گلاس دودھ کا میرے لئے نیک نامے کو دے گیا۔ اگر یقینی طور پر کسی کو میری غمخواری اور ہمدردی تھی تو وہ نیک نامے کو تھی۔ اس نے دوسروں سے پوشیدہ مجھے پینے کو دیا۔ میں نے بے حد کوشش کی کہ وہ نیک بخت بھی اس نعمت میں شریک ہو جائے۔ لیکن اس نے ایک گھونٹ چکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ آخر میں نے آدھا پی لیا۔ اور آدھا لالہ جی کے لئے رکھ چھوڑا قسمت دیکھئے ٹھوکر سے وہ دودھ گر گیا۔ اور راز افشاء ہو گیا۔ خاریوں نے خواڑے سے بازپرس کی اس نے جواب دیا کہ میں نے قیدیوں کو دودھ پلانے کی منّت مانی ہوئی تھی۔ اس لئے آج میں نے وہ پوری کر دی۔

مدّاخیل غالباً اس گاؤں کا متموّل ترین آدمی تھا۔ اور اپنے دو بھائیوں کو ساتھ لے کر فرار ہوا تھا۔ یہ سب اکٹھے رہتے تھے۔ اصل میں مدّاخیل

سزا پا کر بنّوں کے جیلخانہ میں مقید تھا...... اس نے اپنے بھائیوں کو پیغام بھیجا کہ فلاں تاریخ تک تم اپنی زمین جائداد اور فصلیں بیچ کر نقد روپیہ کی صورت میں تبدیل کر لو۔ بھائیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد اس نے اطلاع بھیجی کہ میں فلاں روز اور فلاں وقت جیل خانے سے بھاگوں گا تم نے تیار رہنا۔ چنانچہ مقررہ وقت اور دن پر وہ جیلخانہ سے بھاگ گیا۔ اور سب بھائی ہجرت کر کے خوست میں آباد ہو گئے۔ جہاں زمینیں وغیرہ خرید لیں۔ اس کے بھاگنے کا قصہ اس کا بھائی قربی بڑی تفصیل کے ساتھ سنایا کرتا لیکن یہاں لکھنے کی گنجائش کہاں۔ یہ سارا خاندان سقاؤں کا تھا۔ اور ہمارے فراری اکثر کہا کرتے۔ کہ اگر تمہارا فدیہ نہ پہنچا تو ہم تم کو مدّا خیل کے پاس بیچ دیں گے۔ مدّا خیل بڑا معزز تھا۔ فرار سے پہلے حج بھی کر چکا تھا۔ اسکی لمبی لمبی بھوری مونچھیں اور تراشیدہ داڑھی تھی۔ اسکا مشورہ فراریوں پر بڑا اثر رکھتا۔ اس کا دستور تھا کہ وہ امتحاناً مجھ سے کئی سوال کیا کرتا۔ جن کا مقصد میری صداقت کا پرکھنا ہوتا۔ میرا جواب ہمیشہ اس کے توقع کے خلاف ہوتا۔ چنانچہ وہ بڑی حد تک قائل ہو گیا کہ میں ان سے کوئی فریب کاری نہیں کر رہا۔ اس کی شکل صورت سے میرے دل پر قدرتاً ایک ہیبت چھا جاتی۔ اس لئے حتی الوسع میں اس کے سامنے آنے سے گریز کرتا۔

ایک چھوٹے واقعہ کا ذکر ضروری ہے مغلم اور وسیم گل پر ٹوچی میں جب مقدمہ دائر ہوا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر آخر وہ فرار ہوئے تو دورانِ مقدمہ میں وہ عیدک کی حوالات میں محبوس تھے۔ لالہ سندر لال ٹھیکیدار کی حیثیت میں مرتیں دیکھنے کے لئے وہاں گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ترلوز تھا۔ جسے دیکھ کر مغلم کے

منہ میں پانی بھر آیا۔ اور اس نے لالہ جی سے تربوز مانگا۔ لالہ جی ہاتھ کے سخی اور دل کے بہت نرم ہیں۔ لیکن قسمت کا پھیر یونہی تھا۔ کہ لالہ جی کو اس کا اس طرح کا سوال ناپسند آیا۔ اور انہوں نے معظم کو جھاڑ دیا۔ انہیں کیا علم تھا کہ اسی سائل کے سامنے ایک دن لالہ صاحب کو اس سے بہت ہی بڑی بڑی التجائیں پیش کرنی ہیں۔ اس واقعہ کی وجہ سے معظم کو ان سے دلی نفرت تھی۔ اور انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے حقارت اور انتقام کا جذبہ ٹپکنے لگتا اور ہمیشہ ناشائستہ الفاظ میں ان سے مخاطب ہوتا۔ اس کی بہن نیک نامے بھی اسی لحاظ سے لالہ سندر لال کو بہت بُرا جانتی۔ اور لالہ جی ان دونوں سے بہت گھبراتے۔

معظم کا ایک دوست شیر علی نام قوم وزیر کا فراری خدا جانے کیوں لالہ جی سے کدر رکھتا۔ ایک روز میں چھپر میں بیٹھا ہوا تھا معظم بھی پاس تھا شیر علی باہر سے آگیا۔ اور آتے ہی بولا تمہارا ہندو دڈّس کہاں ہے بلاؤ اس کو۔ معظم ایسے موقع پر کب چوکتا تھا۔ فوراً لالہ صاحب کو پابزنجیر لے آیا شیر علی لالہ صاحب سے پہلے تمسخر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر بڑھ کر کانوں سے پکڑ لیا۔ اور مار کٹائی شروع کر دی۔ لالہ صاحب کی گت بنتے دیکھ کر جو کچھ میرے دل پر گذری وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے ہزار سفارش کی لیکن الٹا موردِ عتاب ہوا۔ اور مجھ پر بھی آبنی۔ پہلے ایک دو دفعہ اُنہوں نے ڈرایا کہ سفارش نہ کرو ورنہ تم کو بھی ساتھ ہی رکھ لیں گے۔ لیکن جب میں باز نہ آیا تو میرے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ کہ باہر گرم پتھروں پہ مجھے لٹا دیا۔ اور میرے پاؤں کے دونوں انگوٹھوں کو

کچے دھاگے سے باندھ کر ایک چارپائی سے وہ دھاگا باندھ دیا گیا۔ اور حکم دیا کہ ہلو مت۔ اگر یہ دھاگا ٹوٹ گیا تو اس سے بدتر سزا تمہارے لئے تجویز کی جائیگی۔

وحشت نے جن کی توڑا زنجیر آہنی کو

اک کچے دھاگے سے وہ باندھے ہوئے پڑے ہیں

غرض میں اس طرح باہر قابو کیا گیا اور سندر لال صاحب کے کان ٹانگوں کے نیچے سے اندر پکڑوا لئے گئے۔ اُن کی پُشت پر پتھر رکھے گئے۔ اور مارے تسموں کے کان سُرخ کبود کر دیئے۔ میرے ساتھ یہ خیر گذری کہ معلم کو رحم آیا اور اس نے جلد مجھے کھول دیا۔ جسمانی تکلیف کے لحاظ سے تو یہ کوئی اتنی بڑی مصیبت نہ تھی۔ لیکن اپنی اس بے بسی کو دیکھ کر دل پر جو اثر ہوتا۔ اس کا اندازہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

یہی شیر علی ایک روز آیا اور لالہ سندر لال کو ستانا شروع کیا۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ معلم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر زور کریں۔ یہ بیچارے جھجکتے اور معلم یوں بھی طاقت و قوت میں بہت زیادہ تھا۔ لالہ جی کے ہاتھ کو دو تین دفعہ اس نے ایسا دبوچا کہ ان کے آنسو نکل آئے۔ لیکن چوں کرنے کی مجال نہ تھی۔ یہ دیکھ کر میری طبیعت میں عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ اور ایسا جوش آیا گویا مہینوں کی طاقت اس وقت جمع ہو گئی ہے۔ میں نے معلم سے کہا کہ ایک کمزور بے کس قیدی کے ساتھ اتنا ظلم اچھا نہیں۔ اگر اتنے ہی شہ زور ہو تو میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالو۔ وہ ہنس پڑا اور میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ مجھ میں اس وقت غیر معمولی جوش اور طاقت آگئی تھی۔ میں نے بڑھ کر پکڑ لیا۔ اور اس کے سنبھلنے سے پہلے دبا

لیگیا۔ اور اتنا زور[1] دیا کہ وہ چلا اٹھا۔ کہ میرا بازو ٹوٹ گیا۔ تب میں نے جا کر گرفت ڈھیلی کی۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اور شیر علی ہنس رہا تھا۔ میں نے معلم سے کہا مجھے معلوم ہے کہ تم ضرور اس کا بدلہ مجھ سے لے کر رہو گے لیکن تمہیں احساس تو ہو گیا ہو گا۔ کہ بیچارے کمزوروں پر تم کیسی سختی کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اگر میں تم پر غالب آتا تو ضرور تم کو اور بھی دکھ دیتا لیکن اب میرے لئے شرم ہے۔ کہ اس کا بدلہ تم سے لوں۔ اور لالہ سندر لال کو بھی اس وقت چھوڑ دیا۔

شاد آمین دوڑ قوم کا ایک فراری تھا۔ جو دیر سے شکار نہ ملنے کے باعث بہت خستہ حال ہو گیا تھا۔ وہ طبیعت کا کمینہ تھا۔ گھر سے روٹی شاذ و نادر ہی کھاتا لیکن کہیں کھانا ہو یہ اس کی بو پر جا پہنچتا۔ اور شریک ہو جاتا۔ بڑا خشک مزاج تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو یہ غدی دوہاڑا پر گیا ہوا تھا لیکن قسمت کی تہی دستی سے ساری غدی ناکام واپس آئی جب گاؤں میں واپس پہنچے اور اس نے سنا کہ لالہ سندر لال کی قسمت کا قرعہ آخر وسیم گل والی غدی کے نام پڑا۔ تو وہ دل میں بہت جلا۔ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور لالہ سندر لال اس کے سامنے تھے۔ مذاقیہ طور پر میرے والا ریوالور اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور لالہ سندر لال کی طرف سیدھا کر دیا۔ اور ایک آن کی آن میں چھ فائر کر دیئے پستول کی نالی سیدھی سینے کی جانب تھی۔ موت میں کوئی کسر باقی نہ رہی لیکن نصیبہ ابھی سر پہ ہاتھ رکھے کھڑا کہتا تھا۔ کہ جس جان کو تو گولی کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس کو ابھی آزاد ہو کر بہت کچھ کرنا ہے۔ وسیم گل نے بڑھ کر شاد آمین کا ہاتھ روک لیا۔ اور ریوالور چھین لیا۔ اور اس کو بہت سخت سست کہنا شروع کیا۔ اس نے جواب دیا۔

[1] میری حماقت کی انتہا۔

مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ ریوالور بھرا ہوا ہے۔ کچھ دیر تک جھگڑا رہا لیکن زیادہ طول نہ کھینچا۔ کیونکہ وسیم گل کو یہ بھی فکر ہو رہی تھی۔ کہ کارتوس کیوں نہیں چلے۔ ریوالور کو مسجد میں لے گیا۔ ٹوچی کے ملک ابھی واپس نہیں گئے تھے۔ ان کے گرداور فراری بھی جمع تھے۔ وہاں کارتوسوں کا ملاحظہ کیا گیا۔ چاروں پر ضرب پہنچ چکی تھی۔ پھر رکھ کر چلائے گئے۔ تو ان میں سے ایک چل گیا۔ اس معاملہ میں شاد امین کی لالہ صاحب سے عداوت ہو گئی۔ دوسرے یا تیسرے روز کہنے لگا کہ لالہ صاحب ننگے سر عورتوں میں بیٹھ کر روٹی کھاتے ہیں۔ اور ان کے سر کے لمبے لمبے بال اور بڑی بڑی مونچھیں ہیں ان کو تراش کر ٹھیک کرنا چاہیئے لالہ صاحب کو اٹھا کر مسجد میں لے گئے۔ شاد امین نے قینچی لے کر ان کے بال کاٹنے شروع کئے۔ باربار بیرحمی سے قینچی کی نوک ان کے سر میں گھونپ دیتا کئی جگہ سے خون ٹپک پڑا۔ اور اخیر میں بیرحم نے کان کو قینچی سے پکڑ لیا۔ لالہ صاحب چلائے۔ کان خون آلود ہو گیا اور بڑی مشکل سے اس بیرحم نے قینچی کو جدا کیا۔[1]

ہمیں معلوم ہوا کہ شاد امین کو ہمارے آقاؤں نے کچھ رقم دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا ہے۔ کہ وہ فدیہ کو جلدی منگوانے کے لئے........ ہمیں مرعوب اور خائف بنانے میں کوشاں رہے۔ ایسے ذلیل کام کیلئے ایسے کمینہ شخص کے انتخاب کی داد دئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ وہ اس مقصد کے لئے عجیب عجیب وسائل اختیار کرتا۔ ایک تو وہ سابقہ اسیروں کے دردناک

---

[1] اس معاملہ سے ڈر کر میں نے کئی دفعہ اپنے بال کٹانے کے لئے التجا کی۔ بلکہ سر درد کا بہانہ بھی کیا۔ لیکن انہوں نے مجھے کہا۔ کہ بال مت ڈرو۔ تمہارے بال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہم نہیں کاٹیں گے۔ اس طرف لمبے بال رکھنے کا رواج ہے۔

افسانے ہر وقت کانوں میں ڈالتا رہتا۔ فدیہ کے دیر سے بھیجنے کے طفیل جو جو ظلم اور جس جس طرح بعض کا انجام ہوا عجب رنگ آمیزیوں سے بیان کرتا۔ اس کی شکل سے ہمیں بے حد نفرت تھی۔ لیکن وہ زبردستی ہمارا ہمنشیں بنا رہتا۔ اور ہمیں اپنے جذبات کو دبا دبا کر اس کی ہمقرینی پر خوشی کا اظہار کرنا پڑتا۔

ایک روز لالہ صاحب پر بہت ناراض ہوا کہنے لگا کہ بابو کے فدیہ پہنچنے کا وعدہ تو ہو گیا ہے لیکن تمہاری کسی نے خبر تک نہیں لی۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ تمہارا پرسان کوئی نہیں۔ ہم ناامید ہو گئے ہیں اور ہم مزید انتظار میں تمہیں روٹیاں نہیں کھلا سکتے۔ آج میں تمہارا خاتمہ کرنے کو آیا ہوں۔ چنانچہ نہایت جوش میں آکر وہ بدکلامی پر اتر آیا۔ اور لالہ جی کو اٹھا کر گاؤں سے کچھ فاصلہ پر لے گیا۔ ایک چھوٹا سا گڑھا خنجر سے کھودا۔ اور لالہ جی کو لٹا کر ان کی گردن اس پر رکھی۔ خنجر آگے لاتا تو لالہ جی ہاتھ سے پکڑ لیتے۔ اور منت وزاری کرتے۔ اور فدیہ کے لئے مہلت مانگتے۔ آخر لالہ جی کے یقین دلانے پر کہ وہ فدیہ دینے کے قابل ہیں اور جلدی بندوبست کریں گے۔ وہ انہیں واپس لایا میں نے لالہ صاحب کا رنگ دیکھ کر ان سے حال پوچھا۔ انہوں نے اشارہ سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ اور بعد میں یہ واقعہ سُنایا۔

ایک روز مدّے کو رحم دلانے کے لئے لالہ جی نے مجھے خنجر دے کر کہا کہ مجھے ذبح کر کے میرا خاتمہ کر دو۔ یہ قصّہ شادا مین تک پہنچا۔ تو وہ سچ مچ خنجر لے کر گرد ہو گیا۔ کہ آدم زاد کو پہنچا دوں خنجر کی نوک سے جب لالہ صاحب کے جسم کے ساتھ اس نے بے تکلفی شروع کی تو لالہ صاحب گھبرا گئے اور چلائے کہ

"اب نہیں مروں گا۔"

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وجفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اڑنگے ان فراریوں کا سرگروہ تھا۔ اور ہمارا گاؤں اسی کے نام سے موسوم تھا۔ وہ بڑا جری اور بہادر تھا۔ عمر بس تیس چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ بڑا بلند قد اور بہادر تھا۔ اس کے اعضا بڑے مضبوط اور سینہ فراخ تھا۔ سرخ چہرہ اور بھوری آنکھیں جن سے رعب اور جلال ٹپک رہا تھا۔ داڑھی "چگی" تھی۔ اس کو شیخ کے لقب سے پکارتے تھے۔ وہ لوگ اس کے چلنے کی بڑی تعریف کرتے کسی مہم پر جن جن لوگوں کو اس کے ہمراہ جانے کا اتفاق ہوا وہ سارے بالاتفاق اس کی سبک رفتاری پر رطب اللسان ہوتے۔ اور کہتے کہ اس کی نرم روی پر بھی دوسروں کو اس سے دوڑ دوڑ کر ملنا پڑتا۔ اور جب وہ چھلانگوں پر آجائے تو پہاڑیوں پر سے اس طرح پھاندتا جاتا جیسے کوئی پہاڑی بارہ سنگا۔ قریم کوہاٹ اور بنوں کے علاقہ میں وہ ایک مشہور ڈاکو تھا۔ اور گردونواح اس کے نام سے کانپتا تھا۔ پرس رام کی گرفتاری کے بعد مجھے ایک سلسلہ میں اڑنگے کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ تو وہاں پر سرکار انگلشیہ کے علاقہ سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے جنہوں نے مجھے دیکھ کر اپنے نصف چہرے کپڑوں سے ڈھانپ لئے۔ لباس سے انہیں سے بعض سربرآوردہ ملک معلوم ہوتے تھے۔ لیکن میں انکے نام اور پتے نہ دریافت کرسکا۔ غالباً وہ دہاڑوں میں فراریوں کے ہمراز تھے۔ اور کسی ایسے ہی کام کیلئے آئے ہونگے۔

بعض فراریوں کے لئے میں خطوط نویسی کی خدمت انجام دیتا۔ وہ اپنے دشمنوں کی طرف دھمکیوں کے خط لکھواتے۔ یا کسی پٹواری وغیرہ کو ہدایات بھجواتے۔ اس خط و کتابت کی وجہ سے چند ایک فراری ظاہراً میرے ممنون نظر آتے۔

ایلاوار مدّے کا داماد تھا۔ اس کی آٹھ نو سالہ لڑکی گلر نگے اس کیساتھ منسوب تھی یعنی قیمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس طرف منگنی کے یہی معنی ہیں۔ کہ قیمت ٹھہرا کر کچھ قیمت پیشگی لے لی جاتی ہے۔ اور داماد کو اجازت ملجاتی ہے کہ بیشک شادی سے پہلے اس کے ساتھ میل ملاپ رکھے۔ مدّے نے ایک روز فخر سے کہنے لگا کہ میں نے اپنی لڑکی کے چھ سو روپے مقرر کئے ہیں۔ ایلاوار بڑا خوش مزاج اور بامذاق نوجوان تھا۔ گاہ گاہ اپنی منسوبہ کو ملنے آیا کرتا۔ اور مدّے کے ساتھ رہتا۔ وہ بڑا دوست پرور اور طبیعت کا بے پرواہ تھا۔ ہماری نگہبانی بہت دفعہ اس کے سپرد ہوئی لیکن حفاظت میں بہت احتیاط سے کام نہ لیتا۔ چنانچہ ہماری وہاں کی آخری رات لالہ صاحب اسی کی حفاظت میں اسی کی چارپائی سے بندھے پڑے تھے۔ دوپہر کے وقت اکثر اسے ہمارے پاس چھوڑ جایا کرتے۔ یہ چھپر کے آگے چارپائی ڈال لیتا۔ ہمیں حکایتیں سناتا یا بے تکلفانہ گپیں مارتا! اور پھر نہایت بے پروائی سے میٹھی نیند سو جاتا۔

میں نے اس کی طبیعت کو پا کر بے حد فائدہ اٹھایا۔ ایک تو ہر قسم کی معلومات جن کا دوسرے فراریوں سے دریافت کرنا ممکن نہ تھا اس سے

بے تکلفانہ گفتگو میں حاصل ہو جاتیں۔ دوسرے اس کے ساتھ ایسا سلوک رکھا
کہ وہ ہماری احتیاط کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا تھا۔

غرض میں نے دو مقصدوں کو مدنظر رکھ کر فراریوں کے ساتھ اپنے سلوک
کی بنیاد رکھی۔ اول یہ کہ ان کے آزار سے حتی الامکان ہم بچے رہیں اور دوسرے
بھاگنے کی سکیم میں ان سے معلومات بہم پہنچ سکیں۔ اور خداوند کریم نے ان ہر دو
مقصدوں میں مجھے بہت حد تک کامیابی بخشی۔

جوں جوں دن گذرتے جاتے ہمارے حالات میں تیزی سے تبدیلی
پیدا ہوتی جاتی۔ لوآنہ ملک کا وعدہ ایک ہفتہ کا گذر گیا۔ تو ہمارے آقاؤں نے
آنکھیں نکالنی شروع کیں۔ ادھر ان کی بے صبری بڑھ رہی تھی۔ ادھر ہمارے

دلوں پر یاس وغم کی گھٹائیں چھائی جارہی تھیں۔ ابھی تک اتنا علم ہمیں نہ ہوسکا۔ کہ ہمارے اعزا میں سے کوئی ہمارا پرسان حال ہوا بھی یا نہیں۔ سارا دن ہم چشم براہ رہتے کہ شاید کوئی قاصد آرہا ہو۔ اور ساری رات اس امید پر سحر ہو جاتی کہ شاید صبح کوئی پیام بر پہنچ جائے۔ ع

همه شب دریں امیدم که نسیم صبح گاهی
به پیام آشنائے بنوازد آشنارا

لیکن ہر روز کی مایوسی سے دل کی بیقراری میں اضافہ ہوتا جاتا! دھر فراریوں کا تقاضا اس حد تک پہنچ چکا تھا جہاں "تیل نکالنے کے لئے تلوں کو کولہو میں پڑا جاتا ہے"۔ یہ تو خیر گذری کہ ملک لوآنہ نے اپنے چچازاد بھائی کے ذریعہ پیغام بھیج دیا۔ کہ ایک خون کے مقدمہ میں مجھے سدا خیل جانا پڑ گیا۔ اس لئے فدیہ میں توقف ہوگیا ہے۔ فکر نہ کرنا میں جلدی فارغ ہو کر پہنچوں گا۔ اس اطلاع نے ان کو قدرے تسکین دی۔ لیکن وہ یہ بھی خیال کرتے کہ لوآنہ ملک ان سے کوئی مکاری نہ کر رہا ہو۔

اس حالتِ کشمکش میں ایک روز دوپہر کے وقت خوست کی طرف سے ایک فراری پیر گل نام ہمارے گاؤں میں آیا۔ مجھے مطلع کیا گیا کہ تمہارے لئے ایک خط لایا ہے۔ پہلے تو میں تمسخر سمجھا۔ لیکن اس نے جھٹ ایک چھوٹا سا پرزہ کاغذ کا اپنی دستار سے نکالا۔ جس کی طرزِ خط کو پہچان کر میرے ہر رگ و ریشہ میں محبت کی برقی رو دوڑنے لگی۔ مندرجہ ذیل دو سطور اس چھوٹے سے پرزے پر لکھی تھیں۔

Inform me about your health and condition, be satisfied everything is being done. M. S.

ترجمہ:۔ مجھے اپنی صحت اور حالت کی بابت تحریر کرو۔ تسلی سے رہو۔ ہر ایک طرح بندوبست ہو رہا ہے۔ م۔ص (یعنی محمد صالح)

اس پرزے کو دیکھ کر سر آنکھوں پر رکھا۔ مدّت کا بھرا بیٹھا تھا پھوٹ پڑا وہ رقّت طاری ہوئی کہ اپنا آپ بھول گیا! اور بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اور در و دیوار اور ہر شے روتی نظر آنے لگی۔ ع

چناں در جانِ من سوزش اثر کرد
کہ بے رقت ندیدم ہیچ شئے را

وسیم گل نے مجھے زور سے ہلا کر کہا کہ تم تو اپنا رونا رونے لگے۔ ہمیں بھی تو بتاؤ کہ روپیہ تمہارا پہنچتا ہے یا نہیں۔ ع

سیل سرشک از دلِ او کین بدر نبرد
در سنگِ خارا قطرۂ باراں اثر نکرد

بڑی دیر کے بعد میں نے اپنی طبیعت کو سنبھالا۔ وسیم گل کو خط دکھایا اور کہا۔ کہ میرے بھائی جان کا خط ہے لیکن اس میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی ہیں۔ میری طبیعت کا حال پوچھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ تم تسلی رکھو روپے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ اب مجھے یقین ہے کہ ہم جلدی چھوٹ جائیں گے۔ کیونکہ میرے بھائی میری رہائی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو نگے

لیکن اس مختصر الفاظ سے میری ہی تسلّی نہ ہوئی تھی تو ان کی کیا ہوتی۔ ساتھ ہی قاصد نے ایک اور اطلاع دی جس سے فراری لوگ بہت برافروختہ ہوئے۔ اس نے کہا کہ تمہارے قیدی کا بھائی بنّوں کے ایک رئیس کی سفارش لے کر خوست شاہ غازی کو ملنے کے لیئے آیا ہوا ہے۔ اور آجکل خوست کے ایک رئیس کے ہاں جو کہ پہلے بنّوں میں رہتا تھا مقیم ہے۔ اس خبر کے سُننے سے فراریوں کو آگ سی لگ گئی۔ اور انہوں نے مجھ سے دریافت کیا میں نے جواب دیا۔ کہ مجھے اس کا علم کیسے ہو سکتا ہے لیکن میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے بھائی خوست نہیں آئیں گے۔ اور دوسری اخبار کی طرح یہ خبر بھی جھوٹی ثابت ہوگی۔ چنانچہ فراریوں نے دو چار روز کے اندر تحقیقات کر کے معلوم کر لیا کہ جھوٹ تھا۔

بھائی صاحب کے خط کو میں نے قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ اور تنہا بیٹھ کر اسے الفاظ میں نہ ادا ہو سکنے والے جذبات سے پڑھتا اور محو ہو جاتا اپنے پیارے بھائی صاحب کی صورت تصور میں لا کر ان کی اس مختصر نویسی پر کہ "ہر طرح کا بندوبست ہو رہا ہے" ان سے شکایت کرتا۔ اور اتنی مدّت میری خبر نہ لینے پر کہتا۔ کہ ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پھر یہ خیال کر کے کہ آج وہ خود کس طرح میری مصیبت کی وجہ بیتاب اور بیقرار ہوں گے۔ اور گھر بھر پر کیا قیامت آ رہی ہوگی طبیعت کی بے چینی اور بڑھ

جاتی۔ اور انہی خیالات کے سلسلہ میں بچپن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا وہ والدین کے سایۂ عاطفت میں رنج و غم سے نا آشنا آرام و عیش کا زمانہ بسر کرنا۔ بھائیوں کی سچی محبت و الفت کا لطف اب ایک خواب و خیال معلوم ہوتا۔ اور اپنے اس تصور کو ہٹانے کی کوشش کرتا۔ اور کہتا۔

دور ہو جاؤ تصور بیبر و ساماں ہوں میں
سامنے آنکھوں کے کیوں لاتا ہے سامانِ وطن

لوانہ ملک کو اپنے مقدمہ میں خوست ہی دیر لگ گئی۔ اور اس نے مزید کوئی اطلاع بھی نہ دی۔ اس پر وسیم گل وغیرہ اس سے بدظن ہونے لگے اور کہنے لگے کہ یہ بڑا بے ایمان ہے۔ ہم لوگوں سے علیحدہ کھا جاتا ہے۔ قیدیوں کے وارثوں سے الگ مار لیتا ہے۔ اور سرکار سے جُدا انعام حاصل کرتا ہے۔ ہم اس کی معرفت سودا نہ کریں گے۔ کسی اور کو تجویز کرنا چاہیئے۔

لیکن لوانہ ملک نے ہمارے ساتھ ملاقات کے وقت مدّے سے حلفیہ وعدہ لیا تھا کہ وہ ہماری رہائی کا بندوبست صرف اسی کی معرفت کریں گے۔ کیونکہ اس میں علاوہ معقول منافع کے اس کو سرکار کے ہاں نیک نامی کی توقع بھی تھی۔ میرا نظریہ اس معاملہ میں یہ تھا۔ کہ جس شخص کی فراری مذمت کریں وہ شخص ضرور ہمارے لئے مفید ہوگا۔ اس واسطے ہم نے کوشش کی کہ ہمارا معاملہ کسی نہ کسی طرح اسی کے ہاتھ میں رہے۔ چنانچہ میں نے مدّے سے اس کا حلفیہ وعدہ یاد دلا کر استصواب کیا۔ اور نیز اس کو یہ بھی جتایا کہ ہمارے معاملہ میں بڑی حد تک وہ سعی اور محنت کر چکا ہے۔ اور ہم نے بھی اسے خوش

کرنے کے وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ اب اس کی محنت کو رایئگاں کرنا ٹھیک نہیں۔ تو شجاعت و نجابت کے اس پتلے نے جواب دیا کہ تم خاطر جمع رکھو۔ میں ہرگز کسی دوسرے شخص کو لوآنہ کی جگہ مقرر کرنے نہ دوں گا۔ چنانچہ اس نے وسیم گل اور دوسروں کی مخالفت کی۔ اور ناچار ان کو لوآنہ ملک کی بازآمد کا انتظار کرنا پڑا۔

اس عرصہ میں ایک روز نمازِ ظہر کے بعد بہت سے فراری جمع ہوئے۔ میں چھپر میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا۔ کہ سُند رلال کی طلبی ہوئی۔ اور مجھے بھی بلایا گیا۔ وسیم گل چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھے اور لالہ صاحب کو قیدیوں کی طرح پیش کیا گیا۔ لالہ صاحب پر یہ جرم لگایا گیا۔ کہ انہوں نے وسیم گل اور مغلم کا مشترکہ گڑ چوری چوری کھا لیا ہے۔

لالہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ ان کی چیزیں چوری چوری کھا لیا کرتے۔ جب کبھی موقعہ ملتا تو ان کا گھی کھا جاتے یا ٹکڑا اٹھا لیتے۔ یا کوئی اور چیز غائب کر دیتے مثلاً ایک روز لالہ صاحب نے بڑی کوشش سے چھاچھ کا ایک پیالہ مہیا کیا اور ہم روٹی کھانے کے لئے اکٹھے بیٹھے۔ خوسنے کی ماں پاس تھی لالہ صاحب نے ظاہرداری سے اس کی چھاچھ سے تواضع کی۔ خوسنے کی ماں نے جھٹ ایک برتن آگے کر دیا۔ کہ اس میں ڈال دو۔ اس برتن میں پہلے بھی چھاچھ پڑی ہوئی تھی۔ مجبوراً لالہ صاحب نے آدھا پیالہ اس میں الٹ دیا۔ مجھے ہنسی آگئی لالہ صاحب کہنے لگے کہ ہنسو مت میں ابھی اس کا بدلہ لے لیتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد آپ نے خوسنے کی ماں کو برتن دیا کہ نیک تامے کے ہاں سے ٹھنڈا پانی لا دو وہ باہر نکلی آپ نے جتنی چھاچھ دی تھی اس سے دوگنی الٹ لی۔ خوسنے کی ماں

پانی لے کر آئی۔ اب مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ دیکھ کر دریافت کرے گی۔ کہ چھاچھ کہاں گئی۔ تھوڑی دیر بعد لالہ صاحب نے ایک اور بہانے سے اُسے باہر ٹالا۔ اور وہی برتن پانی کا بھرا اس کی چھاچھ میں الٹ دیا۔ یہ دیکھ کر مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ ان چالاکیوں سے وہ اپنی چوری کا پتہ نہ لگنے دیتے تھے۔ اور کسی پر اُن کو شک نہ گذرتا۔ اور اس چالاکی سے خوشتنے کی ماں کو اس کی بہو کے ساتھ ہمیشہ جنگ و جدل میں رکھتے کبھی ساس بہو پر الزام لگاتی اور کبھی بہو ساس پر بہتان رکھتی۔ ایک دفعہ لالہ صاحب نے وسیم گل کے گھر سے پدّن کو گُڑ دیا جو نیک نامے نے دیکھ لیا۔ اور وسیم گل اور مغلم کو بتا دیا اب لالہ صاحب ہزار اپنی صفائی پیش کرتے ہیں لیکن کون مانے۔ مَیں نے بار بار کہا کہ گڑ مَیں نے کھایا ہے۔ لالہ صاحب نے تو شاید کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اور مَیں نے نیک نامے اور مغلم سے اجازت لے رکھی ہے۔ کہ جب چاہوں لے لوں۔ مغلم نے مجھے اشارہ سے سمجھایا۔ کہ ایسی باتیں نہ کرو۔ ورنہ پھنس جاؤ گے۔ تم اَوروں کی سفارش نہ کرو اپنا آپ بچاؤ۔ لیکن مجھ سے جہاں تک ہو سکا سفارش کرتا رہا۔ اور الزام اپنے اُوپر لیتا رہا۔ آخر وسیم گل نے دو چار گالیوں کی تمہید کے بعد لالہ صاحب کو اپنا فیصلہ سُنایا۔ کہ دیکھو انگریز کرسیوں پر بیٹھ کر کچہری کرتے ہیں۔ اور ہم چارپائیوں پر۔ اُن کے مقدمہ کی اپیل تم دوسرے کے پاس لے جا سکتے ہو لیکن ہمارا فیصلہ قطعی ہے۔ میں تمہارے لئے پندرہ روپے جرمانہ اور پچیس ضرب بید تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کی کوئی اپیل نہیں ہے۔ یہ سُن کر لالہ صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ وہاں کے تازیانے برداشت کرنے معمولی

مردانگی نہیں تھی ۔ گرگرے (ایک درخت کا نام) کی خاردار اور سبز لمبی شاخیں ننگے جسموں پر اس زور سے ماری جاتیں کہ کانٹے بدن میں دھس جاتے اور پھر زور سے انہیں گھسیٹ کر نکالا جاتا۔ لالہ صاحب کا نازپروردہ اور رنج نادیدہ جسم بھلا کب سہنے لگا، سُن کر ہی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے میں نے نہایت زاری سے وسیم گل سے درخواست کی کہ میری بھی ایک عرض سُن لی جائے۔ اگر قابلِ قبول ہو تو اس پر عمل کیجیے۔ ورنہ تمہاری مرضی۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جرمانہ تو آپ بہر حال وصول کر ہی لیں گے۔ لیکن پچیس ضرب بید لگانے سے آپ لوگوں کو کیا فائدہ ہو گا۔ میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ تازیانہ کی جگہ دس روپے مزید جرمانہ کر دو۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور وہ بچارا بھی تکلیف سے بچ جائے گا۔ وسیم گل کو یہ بات پسند آئی۔ اس جرمانے پر میری ضمانت لی گئی کہ تمہارا روپیہ اگر پہلے آگیا تو اس سے جرمانہ وصول کر لیا جائے گا۔
اس فیصلہ کے بعد میں پھر چھپر میں آگیا اور تلاوت میں مشغول ہوا۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے لالہ صاحب کی مزاج پرسی کی ٹھانی ہوئی تھی۔ وسیم گل نے دو آدمیوں کو حکم دیا کہ لالہ صاحب کو نالے میں لے جائیں اور نہلا لائیں۔ ایک خوتے نے اور دوسرا اقری نہلانے کی ڈیوٹی پہ مقرر ہوئے۔ دو بڑے بڑے موٹے سونٹے لے لئے۔ اور لالہ صاحب کو آگے رکھ لیا۔ لالہ صاحب کی یہ حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ خونخواروں کے پنجے میں اس طرح گرفتار تھے جیسے بلی کے منہ میں چوہا۔ بہتیری منت زاری کی لیکن نہ سُنی گئی۔ میں چھپر سے ان کی رحم کی درخواست

کرتی ہوئی صورت دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ باہر نکلا۔ نیک نامے نے مجھے روکا کہ خبردار تم بھی پھنس جاؤ گے لیکن میں نہ رُکا۔ وسیم گل کے پاس زمین پر جا بیٹھا اور رحم کی التجا کرنے لگا۔ وسیم گل نے خوتے کو آواز دی۔ کہ بابو کہتا ہے سُندر کو چھوڑ دو۔ نہ نہلاؤ۔ خوتے نے جواب دیا۔ کہ یہ دونوں ہمارے برتنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور روٹیوں کو چھوتے ہیں اور اتنے گندے ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کو ضرور نہلانا چاہیئے۔ اسے بھی بھیج دو۔ وسیم گل نے کہا بابو باز آجاؤ ان سفارشوں سے کیوں اپنے سر پر خواہ مخواہ بلا لیتے ہو۔ ادھر خوتے نے اصرار کرنا شروع کیا۔ کہ بابو کو بھی بھیج دو۔ آخر وہ خود مجھے لینے کے لیئے لوٹا آکر مجھے ہاتھ سے پکڑ لیا کہ اٹھو ہمارے ساتھ چلو۔ خوتے کی ماں اور نیک نامے آگئیں۔ خوتے کو اس کی والدہ گالیاں دینے لگی۔ اور کہا تم بڑے احمق ہو۔ غریبوں مسکینوں کو مارنے کے لیئے تم ہی رہ گئے ہو۔ خود جا کر نہلائیں تمہیں کیا پڑی ہے۔ اس کشمکش میں لالہ صاحب نے قری کی منت خوشامد کی اور اللہ کی عنایت اور میری انتہائی کوشش سے لالہ جی صحیح سالم واپس لائے گئے۔ ؏

داغ آشفتہ کو ہم آج تیرے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

۱۹ ریا ۲۰ مئی کا ذکر ہے کہ عملداد اور خوازتے میں تکرار ہو گیا۔ عملداد کہتا تھا کہ خوازتے تلو رام کی رعایت کرتا ہے۔ اور روپیہ کم لینا چاہتا ہے! اس لیئے میں اس سے روپیہ کی وصولی خود کروں گا۔ اور اس کو سخت عذاب دوں گا۔ اور خط کی بجائے اس کے خون آلود دانت کاغذ میں لپیٹ کر اس کے باپ کو

بھیجوں گا۔ خواڑے نے کہا۔ میری طرف سے ابھی اس کا سر جدا کر دو۔ اسی
تکرار پر تلورام کو بلایا گیا۔ عملداد نے کہا میں اسی وقت اس کے دانت نکالتا
ہوں۔ چنانچہ ایک زنبور اڑنگے کے ہاں سے منگوایا گیا۔ مجمع میں بہت سے
فراری جمع تھے اور ایک غوغا برپا تھا۔ بہت سے فراری تلورام کو بچانا چاہتے
تھے۔ عملداد نے تلورام کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اور اس کے منہ میں زنبور ڈالا
میں اس وقت نمازِ ظہر کے بعد خوستے اور خٹک والے چھپروں کے درمیان
یعنی بالکل مجمع کے قریب چارپائی پر بیٹھا تلاوتِ قرآن شریف پندرہویں سپارہ میں
کر رہا تھا۔ اس ظلم کو میں دزدیدہ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور کانپ رہا تھا۔ اور
جس خلوصِ دل سے اس کے بچاؤ کے لئے میں نے اللہ سے دعائیں مانگیں
وہ مجھے ہی معلوم ہے۔ جب زنبور منہ میں ڈال دیا گیا۔ تو میرے رونگٹے کھڑے
ہو گئے۔ لیکن اللہ نے اسے بچانا تھا دو چار فراریوں نے زنبور چھین لیا جو عملداد
کی ماں گھر لے گئی۔ خواڑے نے کہا کہ اگر عملداد اسے چھوڑتا ہے۔ تو میں اس
دوسرے کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ ایک موٹی لکڑی لے کر اسے نالے میں مارنے
کے لئے چلا۔ اس پر عملداد کو اور ضد چڑھ گئی۔ اور سمجھا کہ خواڑے دھوکا دینا چاہتا
ہے۔ وہ پھر بڑے زور سے لپکا اور ماں سے زنبور لے آیا۔ اس وقت مجھ
سے ایک نہایت جرأت سرزد ہوئی۔ جس کا موجب وہ عزت تھی۔ جو ان لوگوں
کے دلوں میں میری نسبت تلاوتِ قرآن مجید کے باعث پیدا ہو گئی تھی میں اٹھ کر
عملداد سے لپٹ گیا۔ اور قرآن شریف اس کے ہاتھ پر رکھ کر اللہ کا واسطہ دیا۔ پہلے وہ
جھنجلایا لیکن جب میں نے نہ ہی چھوڑا تو وہ رک گیا۔ اور اس طرح تلورام آج کے دن کیلئے بچ گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد فراری حسب معمول خوتے نے کے چھپر کے سامنے قزاقی کی باتوں میں مشغول تھے۔ یکایک بندوق کے چلنے کی آواز آئی ساتھ ہی تلورام زنجیروں میں ہرن کی طرح چھلانگیں مارتا ہوا اور عجب آوازیں نکالتا ہوا ہماری طرف دوڑا آیا۔ میں نے اٹھ کر اس کو سینہ سے لگایا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور خود بید کی طرح لرزاں تھا۔ سارے فراریوں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ تلورام نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ کہ میرے معاملہ میں خواڑے نے اپنی عورت کو مار دیا ہے۔ فراریوں نے اس پر کچھ تعجب یا سراسیگی ظاہر نہیں کی۔ بلکہ ایک نہایت اونٰے بات سمجھ کر اپنی خرافات میں مشغول ہو گئے۔ البتہ خوتے نے کی سراغ رساں والدہ دیکھنے کے لئے گئی اور خبر لائی کہ خواڑے نے صرف بندوق آزمائی کیلئے ایک کارتوس چلایا تھا۔[1]

بلیا مین کو جو لالہ صاحب اور لکھمی چند کا خط لے کر گیا تھا۔ ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ گذر گیا۔ بڑی انتظار اور ناامیدی کے بعد آج صبح کے نو بجے کے قریب وہ لوٹا۔ لالہ سندر لال کے دوست لدہا رام ٹھیکہ دار کا ایک خط آیا۔ جس کا مطلب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

تمہارا[2] بھائی نہیں آیا۔ ہم نے اس کو اطلاع دی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں آسکتا۔ والدہ سخت بیمار ہے۔ سندر لال اپنا حصہ کھا چکا ہے۔ اب مرے کرے۔ ہم روپیہ کہاں سے دیں۔ سمجھیں گے ایک بھائی پہلے مر گیا

---

[1] رات کے اندھیرے میں بندوق آزمائی کرنا مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا۔ غالباً معاملہ ہم سے اخفا میں رکھا گیا۔

[2] اصل میں یہ خط لالہ سندر لال کے بھائی نے لکھوایا تھا۔

تھا۔ اب دوسرا بھی مرگیا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ تمہاری والدہ مرگئی ہے تمہارے دوستوں نے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ جو بہ تفصیل ذیل تین سو روپیہ بندرامی ہے (قریب ڈیڑھ سو روپیہ مروج ہند) اگر اتنے میں تمہاری رہائی ہوسکتی ہے تو ہم بھیج دیتے ہیں۔ بالو کا بھائی بھی آیا تھا۔ اور اتنی بھاری رقم سُن کر وہ بھی واپس چلا گیا ہے کہ اتنا روپیہ ہم کہاں سے لائیں۔

یہ خط پہلے میں نے دل میں پڑھا۔ پھر لالہ صاحب کو سمجھایا کہ جس صورت میں مناسب ہے ان کو سمجھا دو۔ لالہ صاحب نے مجھے کئی بات میں سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ اس طرح اُن کو سُنا دو۔ وہ لوگ سخت انتظار میں تھے۔ کہ دیکھئے ہماری کوششوں اور جانفشانیوں کا صلہ کیا ملتا ہے۔

میں نے لالہ صاحب کو سمجھایا کہ جو کچھ الٹ پلٹ کرنا ہے میں اردو پڑھتا جاتا ہوں۔ تم پشتو میں انہیں سمجھاتے جاؤ۔ غرض لالہ صاحب نے اسی مطلب کو نرم الفاظ میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ادا کیا۔ وہ تو سنتے ہی آگ بگولا ہوگئے لالہ صاحب نے سمجھایا کہ یہ خط میرے بھائی کا نہیں ہے۔ کسی دوست کا لکھا ہے اور غلط ہے۔ جب تک اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہ پہنچے میرے ساتھ سختی نہ کرو۔ پھر ہمارے دوستوں کا روئے سخن میری طرف ہوا۔ اور کہا سناؤ بابو! تمہارا بھائی بھی تمہیں چھوڑ گیا۔ اب کیا مرضی ہے کچھ عذر ہے تو پیش کرو میں نے جواب دیا۔ کہ مجھے اپنے بھائیوں اور جناب قبلہ گاہی سے اتنی امید ہے کہ وہ میری رہائی کے لئے اپنے تن کے کپڑے تک بیچ دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ میرے عوض اپنے آپ کو قید میں ڈالنے کے لئے رضامند

ہوں گے۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ میرے بھائی آتے ہوں۔ اور اس خیال سے واپس چلے گئے ہوں۔ کہ رقم مطلوبہ ان کی ہمت سے بڑھ کر ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ خواہ مکان اور جائداد بیچیں یا قرض لیں مگر ایک دفعہ روپیہ لے کر یہاں ضرور پہنچیں گے۔ اس قسم کی تقریروں سے ان کی آتشِ غضب پر تسکین کا پانی ڈال کر ذرا ٹھنڈا کیا۔

لالہ لکھمی چند کا خط تلورام سے پڑھوایا گیا۔ ہم بھی پاس ہی بیٹھے تھے۔ لالہ لکھمی چند نے پنجابی زبان میں تلورام کو سمجھا دیا۔ کہ خط کا مضمون اس پیرایہ میں بیان نہ کرنا کہ میری شامت آجائے۔ چنانچہ فراریوں کو خط کا مضمون اس طرح سمجھا دیا گیا۔ کہ تمہارا بڈھا باپ اگرچہ بہت زخمی ہو گیا تھا لیکن پرمیشر نے بچا لیا ہے۔ تمہارے لیے ہم نے چار ہزار روپے کا بندوبست کر لیا ہے۔ باقی رقم کا انتظام جس وقت ہو جاتا ہے ہم جان ملک کی معرفت لے آئیں گے تسلی رکھو۔ لکھمی چند کے آقا اس مضمون سے بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے قیدی کو عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

اب ہم دونوں علیحدہ بیٹھ کر معاملہ کو سوچنے لگے۔ لالہ سُندر لال فرمانے لگے۔ کہ مجھے اپنے بھائیوں سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ وہ روپیہ کے بہت دلدادہ ہیں اور اپنی گرہ سے ایک روپیہ بھی میری خاطر خرچ کرنا گوارا نہ کریں گے۔ اس لئے مجھے مضمون مکتوب صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میں نے لالہ صاحب کو یقین دلایا۔ کہ جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ محض اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے مطالبہ میں تخفیف کریں۔ اس چال سے ہم بیشک تکالیف اور صعوبتیں

زیادہ جھیلیں گے۔ لیکن بلاشبہ یہ لوگ بھی مطالبہ میں کمی کریں گے۔ لالہ صاحب کو میں نے اپنے بھائیوں کی الفت کا یقین دلایا! اور کہا کہ یہ مضمون مجھے بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے اگر لالہ صاحب کے بھائی واقعی انکار کردیں اور میں پہلے رہا ہو جاؤں تو اپنی جان تک سے بھی دریغ نہ کروں گا۔ لالہ صاحب کو چونکہ میرے ہر ایک کلام کا پورا یقین ہو جاتا۔ ان کو قدرے تسلی ہوئی اور اپنی والدہ کی وفات کی خبر ان کے دل پر اثر کرنے لگی۔ اور وہ زار زار رونے لگے۔ میں ہزار تشفی دیتا۔ لیکن مصیبتوں پر مصیبتیں دکھوں پر دکھ کوئی کہاں تک ضبط کرے۔ رونے کے لئے ایک بہانہ چاہیئے تھا۔ ایسے پھوٹے کر ہزار رُو کا لیکن نہ رُکے عورتیں گرد جمع ہو کر تشفی دینے لگیں۔ ان کی ایسی آہ و فریاد نے میرے دل پر جو اثر کیا طاقتِ اظہار سے باہر ہے۔

لالہ سندر لال کی حالت ان کے خط کی وجہ سے بہت قابلِ رحم ہو گئی سزاری محسوس کرنے لگے کہ اب لالہ صاحب کو عذاب دئے بغیر چارہ نہیں۔ رات کو بہت سارے قزاق جمع ہوئے! اور عذاب کی نوعیت پر تجاویز پیش ہونے لگیں۔ اڑ بنگے نے اس امر پر زور دیا۔ کہ صبح قیدیوں کو میرے سامنے حاضر کرو۔ اور ان کو پھر داغ دئے جائیں۔ ع

ان کو پھر حسرت ہے کہ دیکھیں اپنے بسمل کی تڑپ

عملداد نے دانت توڑنے کو داغوں کو پر ترجیح دی۔ اور کہا کہ تم دانتوں کو لپیٹ کر ان کے وارثوں کو بھیج سکتے ہو۔ جو تحریر سے زیادہ مؤثر ہوں گے۔ آخر فیصلہ اسی پر ہوا۔ کہ لالہ جی کے دو دانت سامنے کے علی الصباح توڑے جائیں

اس فیصلہ کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔ اور ہماری تمام رات بیم و رجا کی حالت میں گذری کہ دیکھئے مقدر صبح ہمیں کیا رنگ دکھاتا ہے۔

دوسرے دن حسب وعدہ فراری جمع ہوئے۔ دوسرے قیدیوں کو بھی عبرت دلانے کے لیے بلایا گیا۔ میں بھی ان کی طبیعت کی افتاد کو بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ لالہ سندر لال اور پرس رام کو اکٹھے دیکھ کر ایک نے نیا شگوفہ پیدا کیا۔ کہنے لگا کہ دانت توڑنے سے پہلے ان کی آپس میں جنگ کرا لو۔ چنانچہ سب نے اس تماشہ کو دیکھنے کے لیے شوق کا اظہار کیا۔ لالہ پرس رام کے پاؤں میں زنجیریں نہیں تھیں۔ کیونکہ وہ کاٹھ میں رات دن پڑے رہتے تھے۔ اس اس لیے لالہ سندر لال کے ساتھ مساوات کے لیے پرس رام کے پاؤں رسّیوں سے عارضی طور پر باندھے گئے۔ اور دونوں کو سمجھایا گیا۔ کہ اگر کسی نے دوسرے کی رعایت کی تو اس کی اچھی طرح گت بنائی جائے گی۔ پرس رام کو ایک مضبوط لٹھ دیا گیا۔ اور لالہ صاحب کو ایک کمزور شاخ لکڑی کی پکڑائی گئی۔ کہ گتکا بازی کریں۔ سبقت پرس رام نے کی اور بڑھ کر ایک لٹھ لالہ صاحب کے کندھے پر رسید کیا۔ لالہ صاحب نے وار اپنی لکڑی پر لیا۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ ڈنڈا بازی کی نسبت ہاتھا پائی زیادہ آسان ہے۔ ہاتھ سے لکڑی پھینک کر پرس رام سے دست و گریباں ہو گئے۔ اس نے بھی ہاتھ سے لکڑی پھینک دی اور دونوں کشتی لڑنے لگے۔ پرس رام نے لالہ صاحب کو نیچے لے لیا۔ اور خوب دبوچا۔ ہمارے آقا لالہ صاحب کو بہت ابھارتے اور گالیاں دیتے تا کہ کسی طرح نیچے سے نکلیں۔ آخر لالہ صاحب کو چھڑا کر وسیم گل نے چار پانچ

نکڑیاں رسید کیں۔ اور کہا کہ تم بڑے بے غیرت ہو۔ہم کو بھی شرم دلاتے ہو۔
کیا تم جسم میں اس سے کم ہو۔یا روٹی کھانے کو نہیں ملتی۔اگر اب کے نیچے
آ گئے تو یاد رکھو تم کو بھوکا ماریں گے۔باقی دوڑ قزاریوں نے بھی لعنت ملامت
کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔اور پھر جوش دلا کر لڑایا۔میں چھپر میں سے
سوراخ کر کے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ایک دو دفعہ میں نے نکلنے کی کوشش
کی لیکن نیک نامے نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ تم بھی نکلے اور پھنسے۔اِس
دفعہ لالہ صاحب نے بھی بہت جوش دکھایا لیکن پرس رام نے بلا تکلف
نیچے دبا لیا۔وزیریوں کے نعرے تحسین کے بلند ہوئے۔لالہ صاحب کی حالت
بڑی قابلِ رحم تھی۔یہ کشتی ایک راکھ کے ڈھیر پر ہوئی تھی۔جو سارا گاؤں ایک
جگہ پھینکتا تھا۔لالہ صاحب کا منہ راکھ میں دھسا ہوا تھا۔منہ اور ناک میں
سانس کے ساتھ راکھ جا رہی تھی۔وزیری لوگ دوڑوں کو شرمندہ کرتے
اور پھبتیاں اڑاتے۔کہ جیسے تم ہو ویسے لومڑ قیدی پکڑ لائے ہو۔ہماری طرف
خیال کرو۔کہ بہادر پٹھان پکڑ لائے ہیں۔گاؤں کے تقریباً سارے مرد عورت
جمع تھے۔اور لالہ صاحب کو نفریں کر رہے تھے۔بڑی دیر کے بعد لالہ صاحب
کو نیچے سے نکالا۔وزیری لوگ کہتے اگر کوئی اور ہے تو لاؤ ہمارا پہلوان کھڑا
ہے معظم نے کہا میں بالو کو لاتا ہوں۔چنانچہ معظم اور وسیم گل میرے پاس
آئے۔میں جھٹ جا نماز پر جا بیٹھا۔اور پنجسورہ نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔
معظم نے آ کر مجھ سے کہا کہ بالو آج سندر نے ہمیں بہت بے عزت کیا ہے
اگر تم اتنی طاقت سمجھتے ہو کہ پرس رام کو گرا سکو۔تو آؤ اس سے لڑو میں نے

جواب دیا کہ میں تمہارا قیدی ہوں۔ خواہ ہاتھی سے لڑاؤ خواہ بھینسے سے ٹکراؤ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اس پر مغلم اور وسیم گل نے یکزبان ہو کر کہا کہ ہم تم سے زبردستی نہیں کرتے۔ اگر ہمت سمجھتے ہو تو لڑو۔ ورنہ مزید بے عزتی کا باعث نہ بنو۔ نیکیا مے اور لالی میری نے مجھے کہا کہ تمہیں کوئی ضرورت لڑنے کی نہیں لیکن میں نے باآواز بلند کہا کہ انشاء اللہ میں کلمہ اور ایمان کی برکت سے ضرور اسے گراؤں گا لیکن میرے ساتھ ایک شرط کرو کہ سندرلال کو مجھے بخش دو۔ اور وعدہ کرو۔ کہ میری اجازت کے بغیر اُسے دُکھ نہ دو گے۔ وسیم گل اور مغلم نے بخوشی اسے قبول کیا۔ میں جب چھپر سے باہر نکلا۔ تو کئی ایک نے محض ہمدردی سے کہا۔ بابو بیچارہ کو مت لڑاؤ لیکن میں نے پھر باآواز بلند کہا۔ کہ انشاء اللہ میں کلمہ کی برکت سے ہندو کو گراؤں گا۔ کیونکہ وسیم گل اور مغلم نے میرے ساتھ یہ شرط کی ہے۔ کہ اگر میں نے گرا لیا تو وہ بغیر میری اجازت کے لالہ سندرلال کو تکلیف نہ دینگے میں نے دوبارہ لوگوں کے روبرو ان سے قسمیں لیں۔ وہ اس قدر جوش میں تھے۔ کہ انہوں نے مطلق پرواہ نہ کی اور سب کے سامنے حلفیہ وعدہ کیا۔ نوجوان ایلاآدار میری اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ بلکہ میں نے بہت سے وزیریوں کو بھی کلمہ اور ایمان کی برکت کا نام لے کر اپنا طرفدار بنا لیا۔ ایلاآدار نے زور دیا کہ بابو کی زنجیریں بھی اتاری جائیں۔ لیکن چونکہ یہ زنجیریں کمزور تھیں اور میں نے بہت محنت اِن پر کر رکھی تھی۔ اس لئے ان کو ہاتھ لگانے نہ دیا۔ چنانچہ ایلاآدار نے خود پرس رام کی ٹانگوں کو رسّی سے باندھا اور مرغوں کی طرح ہمیں میدان میں چھوڑ دیا۔

ہیں لالہ صاحب کا حال راکھ میں ملاحظہ کر ہی چکا تھا اسلئے کوٹے کرکٹ میں کپڑوں کے ناپاک ہو جانے کا بہانہ کر کے پتھریلی زمین منتخب کی۔ میری اس شیخی سے پرس رام بھی جھجکنے لگا اور بے ڈر ہو کر مجھ پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ قریب دس منٹ کے ہم انگلیوں سے زور آزمائی کرتے رہے۔ لیکن پرس رام کا ہاتھ میری نسبت سخت پڑتا تھا۔ بات بگڑتی دیکھ کر اور کلمہ اور ایمان کی برکت کی بے حرمتی کے خوف سے ہمارے فراریوں نے کہا کہ برابر زور کے ہیں اس لئے برابر چھوڑ ادو۔ لیکن میں نے کہا کہ خدا کی قسم جب تک فیصلہ نہ ہو جائے میں نہیں چھوڑ نیکا۔ اس وقت لالہ سندر لال کو اور مجھ کو یہ خوف دامنگیر تھا۔ کہ ایک لوہے کا قفل جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا میرے آزار بند سے بندھا ہوا پاجامہ کے اندر لٹک رہا تھا جس کے ظاہر ہو جانے کا اندیشہ تھا غرض پرس رام نے پیش دستی کی اور میری گردن میں دونوں ہاتھ ڈال کر ایسا دبوچا کہ میرا سر جھک گیا میں نے اپنے ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اپنے بائیں ہاتھ کی طاقت سے اسے اُٹھاتا رہا۔ اگرچہ پرس رام ایک آدمی سے پہلے بھی لڑ چکا تھا اور میں تازہ دم تھا۔ لیکن پھر بھی میں اس سے کمزور تھا۔ اور میرا سر اس طرح شکنجہ میں آیا۔ کہ فراری سمجھے کہ میں گھبرا کر بے حس ہو گیا ہوں۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ پرس رام نے اپنا سارا بوجھ بچاؤ کے لئے میرے بائیں ہاتھ پر ڈال دیا ہے تو ایک ہی وار میں دائیں ہاتھ کا جھٹکا دے کر اسی کے بوجھ سے میں نے اُسے چت گرا دیا۔ فراریوں نے اس کے اوپر سے مجھے اٹھا لیا۔ اور اسلام کی فتح کا شور بلند کیا۔ سارے کہتے تھے کہ اس نے محض طاقت سے

گرایا ہے۔ اور اپنے ساتھی کو عذاب سے بچایا ہے۔ کئی گھروں سے میرے لئے چھاچھ کے پیالے آگئے۔ وسیم گل نے سندر لال سے کہا کہ تم کو آج اس نے بچایا ہے۔ اس لئے تمہارا یہ فرض ہے کہ دوپہر کو تم اسے پنکھا کیا کرو۔ اور میں دیکھوں گا کہ تم تعمیل حکم کرتے ہو یا نہیں۔ کتنے فراری مجھے بیٹھے دباتے رہے۔ اور کئی روز تک اس امر کا چرچا مردوں اور عورتوں میں رہا۔

اگلے روز اٹھے نگے کے مہمان رخصت ہوئے۔ مسجد میں بیٹھ کر انکے اعزاز میں چاندماری کی گئی۔ جنوبی خشک نالے کے کنارے ایک جھاڑی پر سفید چادر ڈالی گئی۔ دوسرے فراری رائفلوں سے اور مداخیل اپنے جرمن رائفل نما ریوالور سے (جو اپنے بکس کے آگے لگ کر بالکل ایک چھوٹی سی رائفل بن جاتا ہے۔ اور اس کی سائیٹ بھی ہوتی ہے) نشانہ زنی کرتے رہے۔ فاصلہ نصف میل سے کم تھا۔ صرف دو نشانے چادر میں لگے۔ باقی سب خطا گئے۔ ان دو میں سے ایک نشانہ عملداد کا تھا (اس سے مجھے ثابت ہوا کہ نشانہ بازی میں یہ لوگ آفریدیوں سے بہت پیچھے ہیں)۔ اِدھر چاندماری ہو رہی تھی! اور اُدھر پرس رام کے لئے میں خط لکھ رہا تھا۔ جو یہ مہمان لیجا کر اس کے باپ کے نام بذریعہ ڈاک بھیجیں گے۔ اس خط کا مضمون بھی تقریباً پہلے خط کی مانند تھا۔ اُن کے خط لکھانے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ملک نذر محمد ولد رضا دین اور اس کے رشتہ دار بیت نامی سے فراریوں کا خفیہ ساز باز تھا۔

مسعود قوم میں ایک مُلا صاحب بہوینڈا نامی نے بہت رسوخ پیدا کر رکھا ہے ہزارہا لوگ اس کے اشارہ پر جان دینے کو تیار ہیں۔ کئی لڑائیاں لڑ چکا ہے۔

اس علاقہ میں اسے ایک بزرگ ولی مانا جاتا ہے۔ اور اس کے ہر حکم کی وحی کی طرح تعمیل کی جاتی ہے۔ علاقہ کی سب اقوام جو مسلمان کہلاتی ہیں۔ اُس کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ ان دنوں یہ خبر گرم ہوئی کہ ملّا پیوندا خوست میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اور حاکم خوست سے کچھ جہاد کے متعلق عہد و پیمان ہو رہا ہے گرد و نواح کے ملک جوق در جوق آتے اور ہمارے گاؤں سے ہو کر گذرتے ان ملکوں میں سے بہت سے انگریزی علاقے کے ہوتے جو حاکم خوست کے پاس جا کر اقرار کرتے کہ ہم انگریزی حکومت سے بہت تنگ ہیں۔ اور مسلمان بادشاہ کی سلطنت کے خیر خواہ ہیں۔ وہاں ان سے اقرار ناموں پر مہریں لگوائی جاتیں اور انعام و اکرام دے کر رخصت کئے جاتے۔ یہ سلسلہ آمد و رفت بہت دنوں تک جاری رہا۔ حتےٰ کہ ہمارے گاؤں کے لوگ خیال کرنے لگے کہ ضرور ملّا پیوندا جہاد کا بندوبست کرنا چاہتا ہے۔ اور وادیٔ ٹوچی کو عنقریب انگریزوں کے ہاتھ سے چھین لے گا۔ ان خبروں پر ہمارے فراری لوگ بہت خوش ہوتے اور اپنی زمینوں اور مکانوں پر دوبارہ قابض ہونے کے تصوّر سے حظ اٹھاتے۔ اور دشمنوں کو یاد کر کے عالمِ خیال میں ان سے سخت قسم کے بدلے لیتے۔ اور اپنے ڈیرے محلوں اور باغوں میں لگاتے۔ یہ لوگ انہی خیالی پلاؤ پکانے میں تھے۔ کہ اچانک عین نصف شب کے وقت مئی کی بائیسویں تیئسویں تاریخ ملّا پیوندا کا ایک نامہ بر پہنچا۔ اور ملّا صاحب کی طرف سے فراریوں کو پیغام دیا کہ اسی وقت تیار ہو کر ان کے پاس چھاؤنی پہنچ جاؤ۔ یہ کہہ کر قاصد دوسرے لوگوں کو خبر کرنے کے لئے آگے روانہ ہوا۔ اور ہمارے گاؤں میں اس پیغام

سے عجب برقی لہر پیدا کر گیا۔ اور

آگ سی گویا لگا دی تودۂ بارود میں

سوائے لالہ سندر لال کے سب لوگ اٹھ بیٹھے اور جانے کی تیاریاں شروع کرنے لگے۔ آپس میں کھچڑی پک رہی تھی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں لیکن اس پر سب کا اتفاق تھا۔ کہ ملّا صاحب نے جہاد کے لئے ہمیں بلایا ہے۔ اور ہم اب جلدی انگریزوں کو نکال باہر کریں گے۔ بعض جوشیلے جوان خیال کرتے تھے کہ انگریز لڑیں گے نہیں۔ اور توپچی ان کے حوالے کر کے چلے جائیں گے۔ عورتیں اٹھ بیٹھیں اور ان کے لئے زادِ راہ کا مختصر سامان کرنے لگیں۔ دھوپ کے بچاؤ کے لئے ان کے لمبے لمبے بالوں میں کنگھی لگا دیا گیا۔ چیلیاں جو کہ دھاڑا مارنے کے واسطے اکٹھی بنائی جاتی تھیں۔ آپس میں تقسیم کر لی گئی۔ اگر کسی کے پاس کارتوسوں کی کمی تھی تو زیادہ کارتوسوں والے نے اسے اپنے پاس سے دے دئے۔ کمریں پٹکوں کے کمربندوں سے خوب کس لی گئیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا گیا۔ تاکہ دوربینوں کا مقابلہ اپنی تیز آنکھوں سے کر سکیں۔ خنجر تیز کر لئے گئے رائفلیں صاف کی گئیں۔ اور آخر اپنے سردار کے پیچھے گاؤں سے باہر نکل کر جمع ہو گئے۔ اپنے وطن اور ملک کی خاطر قربان ہونے کے خیال سے جو مسرّت ان کے چہروں پر برس رہی تھی۔ اور جس طرح وہ پروانہ وار جنگ کی آگ میں کودنے کے لئے آمادہ ہو رہے تھے اس سے میرے دل میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ کہ کاش میں بھی اپنی ناچیز جان ان کے شریف مقصد پر قربان کر سکتا خیر یہ تو محض جذبہ ہی جذبہ تھا جب میں ان مشِ افتادہ

واقعات کے سب تاریک پہلوؤں پر غور کرتا تو دل کانپ جاتا۔ اگر واقعی جنگ چھڑ گئی تو فراریوں کو ہمارے فدیہ کے پہنچنے کا کوئی امکان نہ رہیگا۔ ایسی حالت میں فراری ایک تو فدیہ سے مایوسی کے باعث اور دوسرا ہمیں دشمنوں کے آدمی سمجھ کر جنگ سے پہلے ذلّت و خواری کے ساتھ قتل کر دیں گے قتل کے خیال کو تصور میں لاکر والدین اور حقیقی بھائیوں اور عزیزوں کے صدمہ اور بیقراری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ اور گھر میں ایک قیامت صغریٰ برپا نظر آنے لگتی۔ سب مجھے عافیت اسی میں نظر آتی کہ میں اپنے آقاؤں کے دشمنوں کا دشمن بن جاؤں۔ اور اُن کا ہمنوا ہو کر ان کے مقصد کے حصول کے لیئے جان قربان کرنے کی تمنّا کا اظہار کروں۔ چنانچہ میں نے ان کے جہاد میں شریک ہو کر جامِ شہادت پینے کے لیئے اپنے آپ کو سراسر تمنّا ہی تمنّا ظاہر کیا۔ ملاّ پیوندا کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کا حد سے زیادہ اشتیاق جتایا۔ بار بار شوق سے ان کا حلیہ پُوچھتا۔ اور ہمراہ لے چلنے کی التجا کرتا۔ وہ بھی اس وقت وجد میں آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہتے کہ بابو اگر یقینی جہاد ہوا۔ تو ہم تم کو ضرور اپنا شوق پورا کرنے کا موقع دیں گے۔ میں ان سے قسمیں لیتا۔ اور وہ حلفیہ وعدہ کرتے۔ لیکن میرا دل باور نہ کر سکتا۔ کہ یہ زنجیروں کو کبھی میرے پاؤں سے علیحدہ کر کے مجھے بھاگنے کا موقع بہم پہنچائیں گے۔ اس وقت گاؤں کے بچے بوڑھے عورتیں مرد سب جاگ رہے تھے۔ اور کسی نہ کسی کام میں مشغول تھے ہاں اگر کوئی متنفس اس وقت بے خبر سو رہا تھا تو وہ لالہ صاحب تھے۔ جب فراری باہر جمع ہو رہے تھے۔ تو میرا دل اس جستجو میں بیقرار تھا کہ وہ اپنی غیر حاضری

میں ہماری حفاظت کا کیا انتظام کر کے جائیں گے۔ اور کیا ان سب کے چلے جانے کے بعد بھاگنے کا کوئی موقع دستیاب ہو سکے گا۔ آخر فراری خود اس مسئلہ کو زیر بحث لائے۔ اور سب نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ مدّے کو قیدیوں کی حفاظت کے لئے پیچھے چھوڑ جائیں۔ میں اس تجویز کو سن کر نہایت ہی مطمئن ہوا۔ لیکن ابھی ایک بڑا مرحلہ باقی تھا۔ کہ کیا مدّے مان لیگا۔

غرض جب سب فراری تیار ہو گئے تو انہوں نے مدّے سے درخواست کی کہ تم قیدیوں اور عورتوں کی حفاظت کے لئے پیچھے رہ جاؤ۔ شجاعت اور شرافت کا جو نمونہ مدّے نے اس وقت پیش کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اس عمر کے بوڑھے لیکن ہمت کے جوان نے ان کی درخواست کو جیسا کہ مجھے اندیشہ تھا ٹھکرا دیا۔ فراریوں نے اسکے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر اس کو مائل کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اس کی "نہ" "ہاں" میں تبدیل نہ ہو سکی۔

مجھے مدّے کی ایسے امور میں ضد کا خوب اندازہ تھا۔ چنانچہ میں اس کی بیوی کے پاس گیا۔ اور اس کو سمجھایا۔ کہ جس طرح ہو سکے وہ اسے جانے سے باز رکھے۔ وہ پہلے ہی رو رہی تھی۔ اس نے خوشامد اور منت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن اس نے نہ ماننا پر نہ مانا۔ بات بگڑتی دیکھ کر میں وسیم گل کے پاس گیا۔ اور اس سے پوشیدہ کہا۔ کہ لالی میرے (مدّے کی بیوی) نے بڑی عاجزی سے تم سے یہ التجا کی ہے۔ کہ اس کا لڑکا بیمار ہے اور تم جس طرح ہو سکے مدّے کو چھوڑ جاؤ۔ وسیم گل نے بہتیرا زور لگایا۔ لیکن یہ اپنی ہٹ سے نہ ٹلا۔ مغلم کے پاس بندوق نہ تھی اور وہ صرف پستول لے کر جا رہا تھا۔ میں نے

اسے پٹّی پڑھائی کہ اگر مدّے رہ جائے تو اس کی بندوق تم لیجا سکو گے۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھی اور اس نے بھی بہتیرا ہی مغز مارا۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ سب طرف سے مایوس ہو کر میں نے خود ایک پُر اثر تقریر کی۔ اور کہا کہ تم اپنی جوان بیوی پر رحم نہ کرو۔ اپنے ننھے بیمار بچے پر ترس نہ کھاؤ۔ اپنی کم سن لڑکی کا خیال نہ کرو۔ صرف میری بے بسی پر نظر ترحم فرماؤ۔ اگر میں کسی اور ظالم کے پالے پڑ گیا تو مجھ پر کیا کیا گذرے گی۔ اگر تم رہ جاؤ گے تو گویا تم نے ایک بے یارو مددگار قیدی پر ترس کھایا۔ اور خدا تم کو اس کا اجر دیگا۔ مدّے میری درخواست کو بہت کم رد کیا کرتا تھا۔ اور صاف انکار تو شاید کبھی بھی نہیں کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ اچھا میں اپنے سردار سے پوچھ آؤں۔ اگر اس نے اجازت دیدی تو میں رہ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے سردار کے پاس گیا۔ اور واپس آکر کہا کہ اس نے اجازت نہیں دی۔ میاں بیوی کے درمیان جو اس وقت گفتگو ہوئی بڑی پُر لطف تھی۔ بیوی بڑے طعنے دے دے کر اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی۔ بار بار کہتی کہ تم لنگڑے اندھے جا کر جوانوں کیساتھ کیا کرو گے۔ ایک آنکھ سے تم معذور ہو۔ اگر اسی طرف کوئی کھڈ ہوئی۔ تو گر کر ہمیشہ کے لئے سُور ہو گے۔ جسم میں تمہارے طاقت نام تک نہیں بوڑھے ہو کر جوانوں کی ریس کرتے ہو۔

ایں پیر نگر کہ میچشانش ازیاد نمے رود جوانی

وہ آگے چلے جائیں گے تم ایڑیاں رگڑتے رہ جاؤ گے۔ اپنی کانی آنکھ کی طرف تو دیکھو۔ سچ ہے یک چشم بیوقوف اور ضدی ہوتے ہیں طرح طرح کی سوختیں لگاتی لیکن وہ ان سب کا جواب ایک محبت بھری مسکراہٹ میں دے دیتا۔

آخر میں نے اخیری طریقہ سوچا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ اس کو کمربند سے پکڑ لیا۔ اور کہا ضد ہے تو ضد ہی سہی۔ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاؤ تو چلے جانا۔ وہ بہت جھنجلایا۔ اور بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن مَیں نے پروانہ کی میری اس درجہ کی ضد دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ کام بن گیا۔ اور اس وقت چھوڑا جب سب روانہ ہو گئے۔

ہمیں آئے ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ راتیں خوب چاندنی تھیں۔ یہ چھوٹا سا لشکر چاند کی سُہانی روشنی میں روانہ ہو گیا۔ اور مَیں نے اور مدّے نے باقی رات ملّا پیوندا کے تذکرہ میں گذاری۔

صبح اٹھ کر لالہ صاحب گاؤں کو مردوں سے خالی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انکی نیند بھی ایک عجائبات سے تھی۔ وہ خود فرمایا کرتے کہ جتنی نیند ساری دُنیا کے حصّہ میں آئی ہے۔ اتنی ہی میرے اکیلے کو ملی ہوئی ہے۔ اور جیسا کہ آگے ذکر آئیگا ایسے ایسے خطرناک موقعوں پر سوتے تھے۔ کہ عقلِ انسانی باور کرنے سے قاصر ہے۔ غرض لالہ جی کی حیرانی کو میں نے رات کی سرگذشت بیان کرکے دُور کیا۔ اور اپنی کارگذاری مدّے کو رکھ لینے کی نسبت بیان کرکے ان سے خراج تحسین حاصل کیا۔

آج کا دن ہمارے لئے ایک خوش نصیبی کا دن تھا۔ اور جو کوششیں آج بھاگ نکلنے کی ہم نے کیں اس کا ذکر باب۶ میں آئے گا۔

مدّے ہماری درخواست پر ہمیں نہانے کے لئے نالا پر لے گیا۔ وہاں پر میں نے اس راستہ کو خوب ذہن نشین کیا جس سے عورتیں چشمے پر جایا کرتی تھیں۔ واپسی پر مدّے نے ذکر کیا کہ لالہ جی کو اس کے ساتھی زردلی وغیرہ کے

پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ یہ افواہ ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ لالہ صاحب کے اوسان
خطا ہو گئے۔ اور ہم نے مدّے سے وعدہ لیا کہ ایسا نہیں کرنے دے گا۔
زردلی اور اس کا سارا کنبہ نہایت ہی بے رحم واقع ہوئے تھے۔

رات بھاگنے میں جو ناکامی ہوئی اس کا تذکرہ اگلے باب کے لئے اٹھا
رکھتا ہوں۔ دوسرے دن ہم نے پھر نہانے کی درخواست کی۔ وہ بھی منظور ہو
گئی۔ مدّے کا داماد ایلادار آیا ہوا تھا۔ اس کی حفاظت میں مدّے نے نالے
پر ہمیں بھیجا۔ عجب آزاد مرد تھا۔ ہم نہاتے اور وہ بندوق تھامے خوش گپیوں میں مشغول
تھا۔ پاجامہ زنجیروں کی وجہ سے اتر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے نہانے میں بڑی
دقت ہوتی تھی۔ میں نے ذرا غور کیا تو زنجیریں پہنے پہنائے پاجامہ کو اتار لینے
کی صورت سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ میں نے پاجامہ اتار لیا۔ نہایا۔ پاجامہ کو دھویا اور
چادر بطور تہ بند باندھ لی۔ پاجامہ اترا ہوا دیکھ کر ایلادار حیران رہ گیا۔ وہ زنجیروں
کو بار بار دیکھتا اور حیرانگی سے پوچھتا کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکا۔ میں نے عرض
کیا جب پہنوں گا دیکھ لینا۔ چنانچہ یہ ماجرا اس نے واپس آکر بیان کیا۔ جونے
کی والدہ اور لالہ بے بیتاب تھیں کہ یہ کس طرح ممکن ہوا۔ ان کو یہی فکر تھی کہ زنجیریں
اتر سکتی ہیں تب ہی پاجامہ اتر سکا۔ چنانچہ پاجامہ کے خشک ہونے پر مدّے
اور ایلادار میرے پاس بیٹھے۔ اور میں نے وہ پاجامہ پہن کر انہیں دکھایا۔ اس
ترکیب کی اختراع پر جو حیرت ان کو ہوئی وہ پہلی حیرت سے کم نہ تھی۔ ایلادار نے
ہنس کر کہا۔ بابو تم کسی ایسی ہی ترکیب سے کسی روز زنجیریں بھی اتار لوگے۔ چنانچہ
اس واقعہ کا چرچا سب فراریوں میں ہوا۔ اور وہ سب حیرانی سے اسکے حل کو دیکھتے۔

اس ترکیب کو بیان کرنے کی بجائے میں ناظرین پر اس کا حل کرنا چھوڑتا ہوں۔
غرض جب ایلا داراس طرح ہمیں نہلا کر پاجامے کی تجارت کو سوچتا ہوا واپس
آرہا تھا تو مسجد کے قریب ہمیں اجنبیوں کا ایک مجمع نظر آیا۔ دو تین گھوڑیاں کھڑی
تھیں اور دس بارہ معتبر سے آدمی سر پر تنی لنگیاں باندھے مزے سے گپیں ہانک
رہے تھے۔ جب گاؤں میں آئے تو ان میں سے ایک ملک ہٹ نامی مدرے
سے باتیں کر رہا تھا۔ اس سے گفتگو کا موقع مجھے مل گیا۔ اس سے میں نے
پوچھا۔ کہ تم خوست جاکر کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ مسلمان حاکم کی زیارت کے
لئے کار ثواب ہے۔ میرے دل میں اس حاکم کی نسبت فوراً یہ شعر گذر گیا۔ ع

گر مسلمانی ہمیں است کہ حاکم دارد

آہ گر از پے امروز بود فردائے

اگر ایسے حاکموں کا دیکھنا مسلمانوں کے لئے ثواب ہے۔ تو مسلمانی بھی چند روزہ کی
مہمان ہے۔ پھر اس نے بیان کیا۔ کہ وہاں جاکر ہم دولت افغانستان کی وفاداری
کی مہر لگاتے ہیں۔ اور حلفیہ اظہار کرتے ہیں۔ کہ ہم سلطنت انگلشیہ سے بیزار
ہیں۔ اور مسلمان بادشاہ کی عملداری چاہتے ہیں۔ حاکم خوست سے ہمیں دعوت ملتی
ہے۔ اور خلعت اور انعام دے کر ہمیں رخصت کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ دستور
ہے۔ ادھر انگریزی افسروں کے پاس قسمیں اور قول و قرار کر کے اپنی خیر خواہی کا ثبوت
دیتے ہیں۔ اور اُدھر حاکم خوست سے جا ملتے ہیں۔ انہی ملکوں میں سے ایک
کا عملدار (خوتے کا بھائی) کے ساتھ ایک رائفل کے متعلق کچھ تنازعہ تھا۔ اور
اس میں قصور ملک کا تھا۔ وہ ایک دُنبہ لے کر ننوتی کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ

آج رات دُنبہ ذبح کیا گیا۔ اسی روز شہید رستم زردلی کی بہنؒ کا دسواں تھا۔ اس لئے رات دو دعوتوں کا جشن رہا۔

تیسرے دن خوست سے فراری واپس آ گئے۔ انہوں نے آکر بیان کیا کہ ملّا پیوندا صاحب کو خبر ملی تھی۔ کہ انگریزوں نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ اور مقابلہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہ ان لوگوں کو بطور باڈی گارڈ لے جانا چاہتے تھے۔

فراریوں کی واپسی کے اگلے روز ایلاآدار کے چند ہم قوم دوست مُلّا پیوندا کی زیارت کر کے خوست واپس آتے ہوئے ہمارے گاؤں میں ٹھہر گئے ایلاآدار نے عین بارش اور آندھی میں بعد مغرب کے ان کے لئے دُنبہ ذبح کیا۔ میرا ان کی قید میں ہونا وہ باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اور مہمانوں کے ساتھ خود بیٹھنے کی بجائے ایلاآدار نے مجھے ان کے ہم دسترخوان ہونے کا فخر بخشا۔

وسیم گُل کی بابت پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کی شکل سے ہم ہیبت زدہ ہو جاتے تھے۔ اور واقعی اگر اسکی ہدایات پر عمل ہوتا۔ تو آج یہ سلامتی کا دن ہمیں کبھی نصیب نہ ہوتا۔ وہ شروع ہی سے اس امر کے خلاف رہا۔ کہ میں اور لالہ صاحب آپس میں آزادی سے مل جُل سکیں۔ کہا کرتا تھا کہ اس کا نتیجہ ضرور خراب نکلے گا۔ اسکی خواہش تھی کہ مزید احتیاط کی خاطر رات کو ہمیں علاوہ زنجیروں کے کاٹھ لگایا جائے وہ نہیں چاہتا تھا کہ عام آدمیوں خاصکر سرکاری ملازمان سے ہمارا کچھ بھی تعلق ہو۔ یا ہم کبھی ان کے سامنے بھی ہوں۔ اس کا حکم تھا کہ میں کبھی چھپر سے باہر نہ نکلوں۔

لے اس کا ذکر صفحہ ۱۲۶ پر آ چکا ہے۔

اور لالہ سندر لال سے قطعاً بات چیت نہ کروں۔ وسیم گل نے ہمیں کتوں کو ٹکڑا ڈالنے سے منع کیا ہوا تھا۔ تاکہ وہ ہم سے ہل نہ جائیں۔ اور اگر واقعی ان احکام کی سختی کے ساتھ دوسرے فراری بھی تعمیل کراتے۔ تو ہمارا بھاگ کر نکل آنا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن اس کے دوسرے ہم پیشہ اتنی سختی کو چنداں ضروری خیال نہ کرتے۔ اور وسیم گل کی غیر حاضری میں ہم ان جکڑ بندوں سے آزاد رہتے۔ اس ظالم کو ہمارا یہاں تک خیال تھا۔ کہ ہمارے کپڑے جب بہت میلے ہو گئے۔ تو اس نے حکم دیا کہ ہم دھولیں۔ نہ اس لئے کہ اسے ہماری حفظ صحت یا پاس وضعداری کا خیال تھا بلکہ ہمارے بھاگ نکلنے کے امکان پر غور کر کے ہمارے میلے کچیلے کپڑوں کو پہاڑوں کا ہمرنگ ہونے کی وجہ سے چھپ جانے کا باعث سمجھتا تھا۔ اللہ کی بڑی عنایت یہ تھی۔ کہ یہ موذی اکثر حرص و ہوا میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ اور دیر تک گاؤں میں نہ ٹھہرتا۔ اس کی موجودگی میں جب ہم ایک دوسرے سے بات چیت نہ کر سکتے اور کسی ضروری امر کی بابت ایک دوسرے کو اطلاع دینی ہوتی یا دل کی تڑپ ہمزبان ہونے کے لئے مجبور کرتی۔ تو اس کے لئے ہم نے نرالا ڈھنگ نکالا۔ ہم میں سے ایک اپنے مطلب کو شعروں کی طرح بلند آواز سے گاتا۔ اور دوسرا اسی طریق سے اپنی جگہ سے جواب دیتا۔ وہ لوگ سمجھتے کہ ہم درد دل سے کچھ گا رہے ہیں۔

وسیم گل کی غیر حاضری میں علداد کی اجازت سے تلو بھی ہمارے پاس آنے جانے لگا۔ اسے اکثر کوئی کام کرنے کے لئے دیدیتے مثلاً مزری کوٹنا۔ بان بٹنا یا چپلیوں کے لئے مزری تیار کرنا۔ تلو رام ا... ... مجھے نہایت افسوس اس امر کا ہے کہ آج کل فصل کاٹنے کے موسم میں کم از کم میں ڈیڑھ سو روپیہ کما لیتا۔ جو کچھ

تکالیف میں برداشت کر رہا ہوں۔ یہ گذر جائیں گی لیکن روپیہ کا افسوس ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔ اس کی اس مجنونانہ گفتگو سے ہم متعجب ہوتے۔ اور دولت کے ساتھ اس کی اتنی محبت، ہمیں حیران کر دیتی۔

ایک دفعہ ہم تینوں اکٹھے بیٹھے خط لکھ رہے تھے۔ میں نے تجویز کیا کہ ایک خط خون سے لکھا جائے۔ تاکہ دیکھنے والوں پہ زیادہ اثر ہو۔ چنانچہ لالہ صاحب نے وسیم گل والا خنجر مانگ کر لیا۔ پہلے تلو رام نے کہا کہ میں اپنے خط پر خون سے انگوٹھا لگاؤں گا۔ اور پاؤں میں انگلی کی گھائی کو کاٹنا شروع کیا۔ اس کا بہت سا گوشت کٹ گیا۔ لیکن ہم حیران ہوئے کہ ایک قطرہ خون کا بھی نہ ٹپکا۔ یا تو وہ گوشت ہی مردہ ہو چکا تھا۔ یا قلتِ خون کے باعث نہ نکلا۔ لالہ صاحب نے خنجر اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے پاؤں میں زخم کرنے لگے۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور ان کے ہاتھ سے خنجر لے کر اپنے بائیں ہاتھ میں تھوڑا سا زخم کیا اور ایک تنکے سے نائب تحصیلدار صاحب عیدک کی خدمت میں مختصر سا شکریہ کا خط خون میں لکھا۔

ایک دن موسم کے بدل جانے کے باعث عملدآد نے اپنے چھپر کو ہوادار بنانے کے لئے اس کی ہیئت کو بدلنا چاہا۔ لالہ صاحب بھی اسے مدد دے رہے تھے۔ عصر کا وقت تھا۔ دور سے چند آدمی گاؤں کی طرف آتے نظر آئے۔ فراریوں کا دستور تھا۔ کہ کوئی آدمی بغیر پہچاننے کے گذرنے نہ دیتے اسلئے سب غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے قریب آنے سے معلوم ہوا۔ کہ وہ بھی فراری ہیں۔ اور دھاڑے سے واپس آ رہے ہیں۔ اور ایک فلک زدہ ہندو شکار کر لائے ہیں۔ ایک فراری گلاجان نامی ساکن کیشکی ہمارے گاؤں میں ٹھہر گیا۔ باقی خوست وال"

ہمارے پاس سے گذر کر اسے موضع کٹیکی کی جانب لے گئے۔ لیکن ہمیں گلاجان سے بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا۔ لالہ صاحب کو شوق ہوا کہ وہ دریافت کریں کہ کس کی قسمت نے غریب دبی کی ہے۔ اگلے روز انہوں نے خوتے کی والدہ کو کٹیکی جانے کے لئے آمادہ کیا۔ یہ پیرزال ہستی ایسے کاموں کو بڑے شوق سے کرتی۔ چنانچہ وہ گئی اور مفصل حالات دریافت کر کے واپس آئی۔ کہنے لگی کوہاٹ کے رستہ سے دو آدمی پکڑے گئے تھے۔ ایک کی قسمت نے یاوری کی رات کو سو گئے اس کو موقع مل گیا اور بھاگ گیا۔ دوسرے نے آنے سے انکار کیا۔ اور اس کو سخت تکلیفیں دی گئیں۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو خنجروں سے اتنا کاٹ دیا کہ صرف گوشت سے لٹک رہی ہیں۔ غرض بڑی مشکل سے اسے سیدھا کیا۔ اور لائے ہیں۔ وہ قوم کا برہمن ہے اور اس نے کسی مسلمان کے ہاتھ کا پکا کھانے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک دن رات بھوکا رہا۔ آج تھوڑے گیہوں بھون کر اس نے چبائے ہیں۔ اگر اسی طرح ضد کرتا رہا تو جلدی مرجائے گا۔ ہماری نسبت بیان کیا کہ گلاجان نے دریافت کیا ہے کہ سندر واقعی غریب ہے لیکن بالو کا روپیہ بہت تھوڑا مانگا گیا ہے۔ بارہ ہزار کیا تیس ہزار مانگو تو بھی تھوڑا ہے۔ سرکار نے خزانہ سے بارہ ہزار روپیہ علیحدہ کر دیا ہے۔ اور یہاں پہنچانے کے لئے کسی معتبر آدمی کی تجویز ہو رہی ہے۔ اپنی نسبت یہ خبر سن کر بڑا رنج ہوا۔ ممکن ہے یہ لوگ فدیہ کی رقم کو بڑھا دیں۔ اور ہماری رہائی ناممکن ہو جائے۔

اب لالہ صاحب ساعی ہوئے کہ کسی طرح وہ اس نگون بخت برہمن سے ملیں۔ تیسرے چوتھے روز گلاجان میرے پاس خط لکھوانے کے لئے آیا۔

ایک بہت لمبا منقش کاغذ اسکے ہاتھ میں تھا جس پر سنسکرت میں منتر لکھے ہوئے تھے۔ اور اہلِ ہنود کے دیوتاؤں اور مذہبی بزرگوں کی رنگین تصاویر منقوش تھیں پٹھان لوگ تعجب سے دیکھتے اور لالہ سُندر لال سے پوچھتے کہ یہ کیا ہے۔ گلّا جان نے ایک اَور حیرت انگیز قصہ بیان کیا کہ برھمن کہتا ہے۔ اگر اُسے گائے کا چمڑا، سیندور اور ہلدی مِل جائے تو اسے ایک ایسا منتر یاد ہے جس کے ذریعہ وہ خود یا کسی دوسرے کو ہوا میں پرند کی طرح اڑا سکتا ہے۔ لالہ صاحب نے اس کی تصدیق کی اور کہا کہ جس کے پاس اس قسم کے ملفوظات ہیں اس کے پاس ضرور ایسا منتر بھی ہوگا۔ اس خبر کے سننے سے لالہ صاحب کا شوقِ ملاقات اور تیز ہوا۔ اور خوشے نے اور اس کی والدہ سے التجا کرنے لگے کہ کسی طرح اس سے ملاقات کا انتظام کر دیں۔ خوشے نے "نہ" ماننے کے لئے جواب دیا کہ کل پرسوں تمہیں لے چلوں گا۔ اور ادھر سے اُسے بلوالیں گے۔ اور دونوں گاؤں کے درمیان تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔

برہمن کی خوراک کی نسبت گُلّا جان نے بیان کیا کہ اس نے بڑی تکلیف برداشت کی ہے۔ لیکن ابھی تک کسی کا چھوا نہیں کھایا۔ کل سے ہندو ہمارے گاؤں میں آیا ہے۔ (افغانستان میں ہندو دوکاندار اشیائے فروختنی لے کر دیہات میں دورہ لگاتے ہیں) اور اس کے ہاتھ کی روٹی اس نے کھائی ہے۔ ہاں تھوڑی سی تمہیدی باتوں کے بعد اس نے خط لکھوایا اور روانہ ہوا۔

برہمن کی اس لاف زنی نے لالہ صاحب کے خیالات کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ وہ اسی دُھن میں محو ہو گئے۔ کہ اس سے کوئی ایسا منتر مل جائے جس کے ذریعہ

اڑ کر نکل جائیں۔ چنانچہ ان دنوں وہ اکثر کہا کرتے کہ مجھے یہی خیال رہتا ہے کہ جب میں رفع حاجت کے لئے باہر جاؤں۔ تو ایک دیوتا ہنس کی شکل میں آکر مجھے سوار کر کے اڑا لے جائے۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ ؎

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

اگر اس کے پاس کوئی منتر ہے تو خود کیوں گرفتار ہے۔ لالہ صاحب کہتے تم ان باتوں کو نہ جانتے ہو نہ مانتے ہو۔ میں ان کی دل شکنی کے خیال سے چپ ہو رہتا۔

اپنے قویٰ کو قائم رکھنے کے لئے میں نے لالہ صاحب سے مشورہ کیا کہ کوئی طاقت کا کام کریں لیکن لالہ صاحب نے مخالفت کی! اور فرمایا کہ اگر ایک دفعہ کام کرنے کی رسم شروع کر دی تو ہم سے ایسی مشقتیں لیں گے۔ کہ جینا دوبھر ہو جائے گا چنانچہ اگر کسی کام میں ہاتھ ڈال بھی دیتا تو لالہ صاحب جھٹ روک دیتے۔ لوگوں کو مسخر کرنے کے لئے لالہ صاحب نے طبابت میں لفاظی کے کمالات دکھانے شروع کئے۔ جب کوئی بیمار ہوتا تو آپ اسے نسخہ بتاتے۔ پرہیزوں کا ذکر کرتے بیماری کے اسباب پر بحث کرتے اور آخیر میں افسوس سے کہتے کہ یہاں کوئی دوا نہیں ملتی ورنہ میں کسی کو بیمار نہ رہنے دیتا۔ پہلے دنوں میں قبرستان کی طرف رات کو کبھی کبھی آگ نظر آیا کرتی۔ جسے لوگ تعجب سے دیکھا کرتے۔ لالہ صاحب دست حسرت ملتے اور کہتے کہ اگر یہ روشن بوٹی دستیاب ہو جائے۔ تو میرا ایک دوست اس سے اکسیر بنانا جانتا ہے۔ میں نے عرض کی کہ یہ بوٹی نہیں بلکہ ہڈیوں کا فاسفورس جلتا ہے۔ لیکن لالہ صاحب نے فراریوں کو یقین دلایا۔ کہ یہ واقعی اکسیر ہے۔ اور وہ بوٹی کی تلاش کرنے لگے۔

ایک روز خوتنے کی والدہ نے کہا کہ بابو تم اتنا پڑھتے ہو اور عبادت کرتے ہو۔ ایک عورت یہاں بڑی تکلیف میں ہے۔ تم اسے تعویذ لکھ دو۔ اور اگر اس کی شکایت رفع ہوگئی تو تمہاری خدمت کرے گی۔ مَیں نے جواب دیا کہ اگر میں کسی کو فائدہ پہنچا سکتا۔ تو پہلے اپنے آپ کو پہنچاتا۔ جب کہ مَیں اپنی تکلیف ہی رفع نہیں کر سکتا۔ تو دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ میرے اس قسم کے انکار سے اس کا اعتقاد اور مضبوط ہوا۔ اور زیادہ اصرار کرنے لگی لیکن میں نے بالکل نہ مانا۔ ایک روز لالہ صاحب نے مجھے کہا۔ کہ اگر میں کچھ بھی لکھ پڑھ جانتا اور ان کا میری نسبت تمہارے ایسا اعتقاد ہوتا۔ تو تمام عورتوں کو آڑے ہاتھوں لیتا۔ تم ضرور تعویذ دینا شروع کر دو۔ چنانچہ لالہ صاحب نے "پیراں نمے پرند و مریداں میپرانند" پر عمل کر کے میری خوبیاں خوتنے کی والدہ کے آگے بیان کیں بلکہ ایک دو واقعات بھی میری کرامت کے گھڑ سنائے ہوں گے۔ غرض بڑھیا کے بہت اصرار کے بعد میں نے پہلے اس عورت کے یقین کو پختہ کیا۔ یہاں تک کہ اسے کامل یقین ہو گیا کہ میرا تعویذ کبھی خطا نہ جائے گا۔ پھر میں نے مجبورہ سے ایک تعویذ لکھ کر حوالے کیا۔ خدا کی قدرت ہے اس عورت کی شکایت دُور ہوگئی۔ ایک روز خوتنے کی والدہ موضع کنگی میں گئی۔ جب واپس آئی تو وہاں کی ایک عورت (جسے وہ پنجابن بتاتی تھی) کی حالت بڑی قابلِ رحم بتائی۔ اس کا خاوند مر چکا تھا اور وہ اس کے بھائیوں کے پاس بطور ورثہ کے تقسیم تھی یعنی وہ اُسے دوسروں پر بیچنے کا حق رکھتے تھے۔ وہ عورت چاہتی تھی کہ ان میں سے ایک بھائی اس کے ساتھ نکاح کر لے۔ اور اس کو بیگانوں کے پاس بیچا نہ جائے۔ چنانچہ اس کے لئے خوتنے کی ماں نے مجھ سے محبت کا تعویذ کرایا۔

اس کی بھولا سےبنے کو جب خبر ہوئی تو وہ میرے گرد ہوئی اور کہنے لگی کہ مجھے بھی ایسا تعویز لکھ دو جس سے خوتے نے مجھ پر عاشق ہو جائے۔ میں نے اس کی بڑی تشفی کی اور کہا کہ مجھے ایک ایسا عمل یاد ہے کہ اگر ایک کارڈ پر کیا جائے تو جانو راُس پر عاشق ہو کر نثار ہونے کے لئے گرد گھومنے لگے گا۔ اس کو دیکھ کر تمہیں بھی یقین ہو جائے گا کہ کتنا بڑا اثر اس عمل کا ہے لیکن اس عمل کے لئے ذرا میری نحوست کا ستارہ بدل لے۔ میرا مطلب تھا کہ شاید مسمریزم کے اصول پر عورت کا یقین اور توجہ ہی تعویذ کے اثر میں مدد دے۔ یا ٹال مٹول میں کوئی مطلب نکل آئے۔ اصل میں خوتے نے اس کی شکل سے متنفر تھا۔ اور بڑی بدسلوکی کا برتاؤ کرتا۔ میرے اس وعدہ کے بعد پوچھا کرتی کہ بابو کب تعویز لکھ دو گے۔ لیکن اللہ کی عنایت سے ہماری نحوست کا اختر پستی سے آناً فاناً اتنی بلندی پر پہنچ گیا۔ کہ لا بنے ہماری نظروں سے بہت دُور نیچے رہ گئی۔

فراری جب کبھی مُربیانہ رنگ میں ہوتے تو زنجیریں پہنانے کی معذرت یوں کرتے۔" بابو اگر تمہارے پاس دس بارہ ہزار روپیہ نقد ہو تو تم اسے لوہے کے صندوقوں میں محفوظ کر کے رکھو یا نہیں۔ اسی طرح تم ہماری نقدی ہو اور زنجیریں لوہے کا صندوق ہیں" اس معذرت کی تلخی کو وہ میرے چہرہ سے معلوم کر کے مغرورانہ انداز میں ایک ایسی ہنسی ہنستے جو میرے دل کے پار ہو جاتی۔

اسی طرح میں کبھی کبھی خوتے نے کی والدہ سے استدعا کرتا کہ اماں جان دُعا کرو خداوند کریم مجھے جلدی خلاصی دے۔ تو وہ بھی ستم ظریفانہ انداز میں دونوں ہاتھ پُورے پھیلا دیتی اور یوں گویا ہوتا۔" یارب بہت جلد اتنے روپے بابو کے فدیہ

سے پہنچ جائیں تاکہ یہ جلدی چھوٹ جائے" میں کھڑا اس کا منہ دیکھتا رہتا۔ اور وہ مُسکراتی جاتی۔

مدّتے نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ جب تم رہا ہو جاؤ گے تو اپنی فراری پر تمہیں سارے علاقے کی سیر کراؤں گا۔ اور پھر چند اشیاء منگوانے کے لئے تمہیں کچھ روپے دُوں گا۔ ان چیزوں میں سے وہ اپنی بیوی کے لئے ریشمی ساڑھی منگوانا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی اتنی مذمت کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مدّتے بیشک ہمیں پکڑ لایا! اور اخلاقاً ہر قسم کی بیرحمیوں میں اپنے ساتھیوں کا شریک تھا لیکن فی نفسہٖ ظالم نہیں تھا۔ اُس کی کریم النفسی کا ادنےٰ نمونہ یہ ہے۔ کہ متمول ہونے کے لحاظ سے اکثر اس کے ہاں کھانے کی کوئی اچھی چیز آجاتی تو جب فراری اکٹھے بیٹھے ہوتے۔ وہ دامن میں لیکر میرے ساتھ والے آدمی سے بانٹنا شروع کرتا۔ اور دورہ ختم کر کے میرے پاس بیٹھ جاتا۔ اور ان سے پوشیدہ میری چادر میں ہاتھ ڈال کر میرا حصّہ مجھے پہنچا دیتا۔ اور دوسروں کو خبر تک نہ ہونے دیتا۔ ایک دفعہ ایک بڑا درویش صفت مسافر ہمارے گاؤں میں آیا۔ اس کو دینے کے لئے میں نے نصف روپیہ (چار آنہ) مدّے سے قرض مانگا۔ کوئی اور فراری ہوتا تو میرے اس سوال پر ہی تمسخر سے مجھے شرمسار کر دیتا لیکن اس "رحمدل قزاق" نے خندہ پیشانی سے میرا سوال پُورا کر دیا۔ اس کی فیاضی مجھ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس کی فطرت ہی ایسی تھی۔

فراری لوگوں سے ہم پوچھا کرتے کہ کیا رہائی کے بعد بھی ہم آپ سے تعلق رکھ سکیں گے یا نہیں؟ وہ جواب دیتے کیوں نہیں۔ اگر تم پر ہمارا اعتبار ہو گیا۔ تو تم کو

ایک ایسا آدمی بتائیں گے جس کے ذریعہ تم نامہ و پیام کر سکو۔ بلکہ ملاقات بھی کر سکو۔ اور اگر تمہاری کوشش سے ہم کوئی شکار پکڑ سکیں گے تو برابر تمہیں حصہ پہنچائیں گے ہم نے اس آدمی کا نام دریافت کرنے کے لئے گفتگو کے کئی پہلو بدلے لیکن انہوں نے نہ بتایا۔

اگرچہ ملاکنڈ سوات سے لے کر خیبر۔ تیراہ۔ کرم۔ کوہاٹ۔ بنوں اور ڈیرہ جات کی سرحد سے کوئٹہ تک سب پٹھان کہلاتے ہیں لیکن ان کی ہر قوم کی صورت و سیرت۔ لب و لہجہ اور زبان میں بہت فرق ہے۔ پشتو کے ایک ایک لفظ کے مختلف اقوام میں الگ الگ تلفظ ہیں۔ جن اقوام سے میرا واسطہ رہا۔ اُن سب میں سے آفریدی شائستگی کے زیادہ نزدیک ہیں۔ تیراہ کے افریدی عموماً بلند قد جسیم اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کے بیضوی چہرے۔ لمبی ناک۔ موٹی گردن منڈا سر سوائے چند زلفوں کے بالوں کے۔ فراخ اور پُر گوشت سینہ۔ سُرخ و سپید رنگ ہوتے ہیں۔ وہ بہادر اور دانا ہوتے ہیں۔ بہت جلدی شیخی میں آکر اپنا نقصان نہیں کر لیتے سیّدوں اور عالموں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ شہیدوں کی مزاروں کی اتنی قدر کرتے ہیں۔ جو شرک تک پہنچا دے۔ مہمان نوازی میں مشہور ہیں۔ خودداری ان میں بہت پائی جاتی ہے۔ مطلب براری کے لئے کمینہ حیلہ استعمال کر لینے میں دریغ نہیں کرتے لیکن دوسری قوموں کی طرح بہت زیادہ خوشامد و تملق نہیں جانتے۔ اپنے ارادوں کے پکّے ہوتے ہیں لیکن وعدوں کے جھوٹے۔ وہ ظاہر آرائش زیادہ نہیں جانتے ان کی عام آرائش کی دو چیزیں ہیں۔ ایک تمباکو کی زریں یا ریشم دوز تھیلی ہاتھ میں لٹک رہی ہو۔ اور سیاہ رنگ کی ڈوری دار پگڑی سر پر ہو۔

ڈوڑ قوم جس سے کہ ہمارے آقا تعلق رکھتے ہیں۔ ٹوچی کے باشندے ہیں اپنی ہمسایہ قوموں سے بودے اور کمزور خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کی شکل پنجاب کے شمالی حصہ کے لوگوں سے ملتی ہے۔ وہ جسیم اور قوی ہیکل نہیں ہوتے۔ ان کی صورت سے وحشت آمیز زنانہ پن ٹپکتا ہے۔ وہ بہت خود آرا ہوتے ہیں۔ انکے لمبے لمبے بال جن میں گھی لگا رہنے کے باعث بُو آتی ہے چھوٹا سر پتلی گردن اور بھوری آنکھیں ہوتی ہیں۔ اکثر سُرخ اور قرمزی رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں۔ اور چاندی کے زیورات مثل گوشوارے ہیکل اور کڑوں کے پہنے رہتے ہیں کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیکار پڑے رہنا ان کی راحت ہے۔ سُرمہ کے بہت عادی ہوتے ہیں نسوار اور تمباکو کھانا بہت عام ہے۔ اخلاقی کمزوریوں میں سے ان کی ایک بچوں پر عاشق ہونا ہے۔ اور تعجب یہ ہے کہ اخلاق کے اس نازیبا پہلو پر وہ علانیہ فخر کرتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اگر ایک ہی محبوب کے دو عاشقوں میں مقابلہ ہو جائے تو ایک دوسرے سے بڑھ کر قربانیاں کرتے ہیں۔ اور محبوب کے خوش کرنے کے لئے بہت خرچ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہاں ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک عاشق نے علاوہ رسمی کارروائی کے دُنبہ ذبح کیا دوسرے نے مقابلہ میں گائے ذبح کی۔ پہلے نے اپنی سواری کی گھوڑی کو قربان کیا۔ معشوق نے کہا سچا عاشق وہ ہے جو اپنی ماں کا سر اتار لائے۔ ایک کی ماں زندہ تھی وہ تو سر کاٹ لایا۔ اور دوسرا دستِ حسرت ملتا رہا۔ کہ ہائے آج ہماری ماں زندہ ہوتی تو مشکل میں کام آتی۔ یہ حکایت اگر فرضی بھی ہو تو بھی ان کی قومی خصائل اور عادات پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس اسلحہ بھی عموماً پرانے ہیں۔ دوڑ لوگ

مستقل مزاج نہیں رکھتے۔ اور بڑے خوشامدی اور خودغرض ہوتے ہیں۔ وزیری لوگ قوت وجسم میں دوڑوں سے برتر اور افریدیوں سے کمتر ہوتے ہیں۔ البتہ وحشت سفاکی اور بیرحمی میں دوسری سب اقوام پر سبقت لے گئے ہوئے ہیں۔ ان کا تہور اور شجاعت بدرجہ غایت بے باکانہ ہے جس کی وجہ سے وہ جنگ میں بے دریغ اور بے سود جانی نقصان اٹھاتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے افریدی بھائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ جو فنون جنگ میں ماہر ہونے کے باعث کم سے کم جانی نقصان کے بدلے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس علاقہ کے اکثر زرخیز قطعات وزیر قوم کے قبضہ میں ہیں۔ جہاں سے وہ اونٹوں کے ذریعہ تجارت کرتے ہیں۔ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ البتہ سرکار عالیہ سے انہیں پولیٹکل اور مذہبی دونوں لحاظ سے سخت دشمنی اور نفرت ہے۔ اور سرکاری ملازمین کے ساتھ بے رحمی کا سلوک وہ ثوابِ دارین سمجھتے ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فراری لوگ اپنے متعلقہ امور کی نسبت بہت باخبر رہتے ہیں۔ اور انہوں نے جاسوسی کا جال بچھا رکھا ہے۔ میری رائے میں اکثر خبریں انہیں غلط پہنچتی ہیں۔ اور اگر ایسی غلط اطلاعیں ان کے حسب منشا ہوں تو وہ ان پر فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ مثلاً۔ انہیں خبر ملی کہ صاحب پولیٹکل ایجنٹ رخصت پر جا رہے تھے۔ بابو کی گرفتاری سنتے ہی رخصت منسوخ کرالی۔ اور پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا کہ افسوس میرا بابو پکڑا گیا۔ پھر خبر آئی کہ بارہ ۱۲ ہزار روپیہ بہت تھوڑا مانگا گیا ہے۔ عیدک کے نائب تحصیلدار صاحب نے بابو کے پکڑے جانے کی خبر سنکر فرمایا خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اسے پکڑ لے گئے۔ جو مانگیں گے مل جائے گا۔ پھر خبر آئی کہ بابو

نے اپنے خط میں پولیٹکل ایجنٹ کو اطلاع دی ہے کہ ہمیں فلاں فلاں راستہ سے لائے تھے۔ اس لئے صاحب موصوف نے اس راستے پر کے تمام ملکوں کو قید میں ڈال دیا ہے۔ اور بارہ ہزار روپلے ان پر جرمانہ کر دیا ہے۔ یہ خبر ایسے وثوق سے بیان کی جاتی کہ ہمارے گاؤں کے وزیر فراری مجھے آ آ کر کو سنے لگے۔ کہ ان کی قوم پہ یہ بلا میری وجہ سے آرہی ہے۔ پھر اس خبر کی تردید ہو کر ٹوچی کے ملکوں کو قید میں ڈالے جانے کی اطلاع ملی۔ اور ساتھ ہی بارہ ہزار کا جرمانہ ٹوچی کی تین مختلف آبادیوں پہ کئے جانے کی افواہ اڑی۔ اس خبر کی تردید نہ ہوئی بلکہ بعد میں اس کی تائید ہی ہوتی رہی۔ اور سچ پوچھئے تو ان افواہوں کی طفیل ہم ان مختلف عذابوں سے بچے رہے جو مایوسی کی حالت میں فراری ہم کو پہنچاتے۔ لیکن ان افواہوں میں کہاں تک صداقت تھی۔ ناظرین خود ہی قیاس فرمالیں۔

البتہ وہاں کے حالات مطالعہ کرنے سے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے جاسوس ضرور رکھتے ہیں جن کی معرفت وہ اپنے "شکار" مقرر کرتے ہیں۔ ان کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ راستے میں چُھپ چُھپ کر جاسوس کی بدولت گرفتاری سے بچے رہتے ہیں۔ وہی خوراک بہم پہنچاتے ہیں۔ اور پھر وارثوں سے سودا کراتے ہیں۔ ایک خبر جو نہایت سرعت کے ساتھ وہاں پہنچی اور صحیح طور پر پہنچی وہ ملک معظم شاہ ایڈورڈ ہشتم کی وفات کی تھی جسکو سنکر میرے دلکو قلق ہوا۔

اب ہم اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک لطیفہ بیان کریں گے۔ جس کے بعد ہم اپنی ان تدابیر کا ذکر کریں گے جو وہاں سے بھاگنے کے لئے ہم سوچتے رہے اور ساتھ ہی ان کے متعلق مختصر واقعات کا مزید ذکر بھی آجائے گا۔

ایک روز لالہ صاحب اور مَیں مغلم والے چھپر میں کچھ سرگوشی کر رہے تھے۔ باہر مغربی دیوار کے ساتھ فزاری آ بیٹھے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ ہم بھی سننے کے لئے خاموش ہو گئے۔ باہر سے آواز آئی "سندر لال کوئی گیت گاؤ"۔

لالہ صاحب :۔ "مجھے گیت تو کوئی نہیں آتا"

آواز :۔ (درشتی سے) "دیوث بہانہ نہ بناؤ حکم کی تعمیل کرو"۔ لالہ صاحب نے اپنے مرغوب پنجابی ڈہرے شروع کر دیئے۔

آواز :۔ "اونچی سُر میں گاؤ۔ ہاں ذرا اور اونچی بس اب ٹھیک ہے"۔

لالہ صاحب گانے لگے تو وہ اپنی باتوں میں پھر مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد لالہ صاحب سمجھے کہ ڈیوٹی ہو چکی خاموش ہو گئے۔ آواز آئی "چپ کیوں ہو گیا"۔

لالہ صاحب :۔ "تم اپنی باتوں میں لگ گئے ہو اس لئے میں نے سمجھا تعمیل ہو گئی"۔

آواز :۔ "احمق تمہیں اس سے کیا کہ ہم باتوں میں لگ گئے۔ تم اپنا اسی آواز سے گاتے رہو"۔

چنانچہ لالہ صاحب پھر گانا شروع ہو گئے۔

آواز :۔ "سُر کو اور اونچا کرو۔ ہاں اب ٹھیک ہے"۔

لالہ صاحب کے گراموفون کو چابی دے کر فزاری پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے اصل میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کی گفتگو کو نہ سُن سکیں۔ اس لئے انہوں نے یہ سہل لیکن عجیب طریقہ اختیار کیا۔ اب لالہ صاحب کے اس طرح بیہودہ اور مجبوری گانے سے مجھے ہنسی آتی۔ لالہ صاحب مجھے کوستے، غصہ کا منہ بناتے لیکن میری ہنسی نہ تھمتی۔ لالہ صاحب نے تنگ آکر فزاریوں کو مغلظات گانی شروع کر دیں۔ اس ادا نے میرے لئے ایک اور لطف پیدا کیا۔ اور مجھے ہنسی اور زیادہ آئی جب تک

فراریوں کی مجلس رہی۔ لالہ جی کو برابر تانیں اڑانی پڑیں اور حلق بیٹھ گیا۔ جب محفل برخواست ہونے لگی تو انہوں نے یہ گراموفون بھی بند کر دیا۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

پاؤں میں لوہے کی زنجیریں۔ سر پہ ہر وقت کڑی نگرانی۔ پہاڑ اور جنگل بیچ میں حائل۔ صیاد اس درجہ بے رحم۔ ایسی حالت میں میری بھاگنے کی کوششیں کس قدر فضول اور بے سود تھیں۔ لیکن مرغِ اسیر کے قفس میں آشیانہ بنانے کو تنکے جمع کرنے کی طرح انہی بے حقیقت اور بے سود کوششوں کی لذت پر زندگی کا مدار تھا۔ اصل میں تو گرفتاری کے وقت سے ہی میری اس لذت کا آغاز شروع ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ راستہ میں فراریوں کو غافل کر کے فرار کا موقع نکالنے کی سعی۔ راہ کی سمت کو ذہن نشین کرنے کی کوششیں۔ اور

اس کے پیچ وخم کو حافظہ میں محفوظ رکھنے کی تمنا۔ یہ سب اسی لذت کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد کے حالات سے بھی ناظرین پر میری ان بے معنی مگر مسلسل کوششوں کا حال عیاں ہو چکا ہے۔ میری ان تدابیر کا دوسرے واقعات سے علیحدہ کر کے ایک باب میں جمع کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ وہ انہی واقعات کا ایک جزو ہیں۔ اور بہت حد تک گذشتہ ابواب میں ضرورتاً ان کا تذکرہ آتا رہا ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ یہاں خالص ان تجاویز کا ذکر کردوں جو فدیہ کے سوال سے بے نیاز ہو کر رہائی کے متعلق میں نے سوچیں۔ یا صرف وہ سوانح بیان کروں جنکا تذکرہ میری سکیم کی وضاحت کے لیئے ضروری ہو۔ نیز بعض بیان شدہ واقعات کا اشارتاً ذکر بھی لازمی ہوگا۔ تاکہ ناظرین کے تصور میں حالات کا سلسلہ قائم رہے۔

گرفتاری کے پہلے ایام میں عجب وحشت مجھ پر سوار رہتی۔ اور اس قفس سے بغیر کسی تجویز کیئے اڑ کر نکل جانے کو دل پھڑک اٹھتا۔ اور اس قید پر موت کو ترجیح دیتے ہوئے کئی دفعہ یقینی ہلاکت کے منہ میں کود پڑنے کو بالکل تیار ہو گیا۔ باب ۵ حصّہ ۱ میں ان کی تفصیل آچکی ہے۔ یہ محض مذبوحی حرکات تھیں اور انکا جلد خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد نکلنے کی باقاعدہ تدبیروں کا آغاز ہوا۔ جب تک پاؤں آزاد تھے تب تک تو صرف مناسب موقع کا پیدا کرنا ہی زیر غور تھا۔ لیکن یہ زمانہ بہت مختصر رہا۔ اور جلدی مجھے زنجیریں پہنادی گئیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ زنجیریں مجھے دل شکستہ بنادیتیں اور عالم یاس میں میں فدیہ کے پہنچنے کا انتظار کرتے ہوئے اپنی حالت پر قانع ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ان زنجیروں نے میرے بھاگ نکلنے کے ارادہ کو اور تقویت بخشی اور میں عالم تصور میں ارد گرد کے نادیدہ پہاڑوں

اور جنگلوں کو طے کرتا رہنے لگا۔ ع

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ یہی دشت نوردی کا خیال تھا جس کے طفیل میرے جسم اور روح کا تعلق قائم تھا۔ اس سے اگلی منزل یعنی بچھڑ اپنے وطن میں خویش و اقارب سے ملنے کی مسرت میرے دامن تصور میں کبھی نہ سما سکی۔ اور میرے خیال کی آنکھوں نے کبھی یہ نقشہ میرے سامنے پیش نہ کیا۔ بس وہ ہی منزلوں تک میرے تخیل کی جولانی محدود تھی۔ ایک تو زنجیروں کے کھولنے یا توڑنے کی پیچ در پیچ وادی۔ دوسری راستہ کی تلاش میں پہاڑوں اور جنگلوں میں گمشدگی و سرگشتگی۔ اور انہی دو کے طے کرنے کی مصروفیت میں میرا دل و دماغ لذت اندوز رہتا۔ میں اسی محویت کی وجہ سے اپنے آزادی کے زمانہ اور رفقت خویش و اقربا کی حسرت انگیز یاد کو اپنے دل و دماغ پر حاوی نہ ہونے دیتا۔ اور گذشتہ عیش و تنعم کا موجودہ مصیبتوں سے رنجدہ مقابلہ نہ کرتا۔ اگر طبیعت کا رجحان کبھی اس طرف ہو بھی جاتا۔ تو میں کہتا۔ ع

کر نہ غربت میں مجھے بے چین ارمان وطن

اب کہاں میں اور کہاں وہ میرے یاران وطن

اور طبیعت میرا کہا مان کر اس دلگداز تصور کو اکثر مجھ سے دور ہی رکھتی۔

برخلاف اس کے لالہ صاحب کو لذت ہی اسی تذکرہ اور اسی مقابلہ میں آتی تھیں ان کی یہ داستان سننے سے انکار کر دیتا۔ اور چونکہ میں نے ابھی تک

لالہ صاحب کو اپنی سکیم کا ہمراز نہیں بنایا تھا۔ اس لیے ان کو اپنی لذت کا شریک کرنے سے قاصر تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ شریک ہو کر بھی اس لذت سے محروم ہی رہے۔

زنجیروں کی رفاقت کے پہلے ایام میں جب کبھی چھپر میں تنہائی کا موقع ملتا۔ تو زنجیروں پر نظر ڈال کر میں اپنے دل کو جوش میں لاتا۔ اور قوتِ ارادی کو اُبھارتا۔ اپنے دل میں یقین کر لیتا۔ کہ زنجیریں بہت کمزور ہیں۔ اور ایک قوی جھٹکے سے میں انہیں توڑ سکتا ہوں۔ اس امر پر یقین کر کے میں پوری قوت سے اپنے پاؤں کے ذریعے زنجیر کو جھٹکا دیتا۔ دو چار دفعہ اس طرح کرنے سے میں نے معلوم کیا۔ کہ زنجیر کے حلقوں میں جو دوسرا تار ڈال کر کوٹ دیا گیا ہے وہ کھینچ کر لمبا ہو گیا ہے جسے دیکھ زاریوں کو شبہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور میں نے ان کی امانت میں خیانت کی ہے۔ اس لئے اس حرکت کو میں نے چھوڑ دیا۔

میرے دائیں پاؤں کے قریب کا تار لمبائی میں چھوٹا تھا۔ اور اسکے صرف چار پیچ تھے۔ جو کنڈلیوں کے اندر سے ہو کر گذرتے تھے۔ اس تار کو میں نے آہستہ آہستہ گولائی پر لانا شروع کیا۔ اور لگاتار کوشش سے میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ چابیوں کے رکھنے کا جو چھلا ہوتا ہے۔ وہی حالت میں نے اس تار کی بنا لی یعنی صرف اس تار کو پھرائے جانے سے یہ زنجیر کے حلقوں میں سے نکل آتا۔ بعینہٖ جیسے چھلا چابی میں سے نکل آتا ہے۔ اور اس طرح زنجیر کا وہ حلقہ جو میری پنڈلی کے گرد تھا۔ زیادہ کھل جاتا۔ اور ایڑی کے نیچے سے اُتر آتا۔ زنجیر کے اُتر جانے کی تسلی کر کے میں نے پھر احتیاط سے اس کے سروں کو دبا کر اسی طرح ملا دیا جس سے

ان لوگوں کو کوئی شبہ نہ ہو سکے۔ اور اپنے زنجیروں کا ہر روز اُن سے ملاحظہ کراتا رہتا۔ تاکہ ان کی آنکھیں مانوس رہ کر کوئی فوری تبدیلی نہ محسوس کریں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے راستے کا نقشہ بنانا شروع کیا۔ جہاں ان لوگوں نے خٹک کو چھوڑا تھا۔ اس جگہ سے لے کر ہمارے گاؤں تک کا راستہ بہت پیچ و تاب کھا کر آتا تھا۔ فاصلہ کل آٹھ نو میل تھا لیکن راستے میں دو گاؤں اور ایک امیر صاحب کا قلعہ پڑتا۔ اگر میرے نکلنے کے بعد ان لوگوں کو جلدی خبر ہو جائے۔ تو ان کا سارا زور سیلاب کی طرح اسی طرف ٹوٹ پڑے گا جس طرف سے وہ ہم کو پکڑ کر لائے تھے۔ ان خیالات سے طبیعت گھبرا اُٹھتی اور کچھ بن نہ پڑتا میں سوچتا کہ کسی طرح پہاڑوں کے اُوپر اُوپر سے ہو کر اس راستہ تک پہنچ سکوں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا اور انجام میں موت ہی موت دکھائی دیتی۔ آخر مجھے یہ سوجھا کہ جس طرح ممکن ہو اس راستہ بلکہ اس سمت کا خیال تک بھی دل میں نہ لانا چاہیئے۔ اور حتی الوسع کسی دوسری طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے تمام کوششیں اب کسی نئے راستہ کی دریافت پر مرکوز کر دیں۔

راستے کی خوراک کے لئے میں نے روٹی کے ٹکڑے چھپانے شروع کئے اور اپنی بنیان پاجامہ کے نیچے دبا کر اس کے اندر یہ ٹکڑے ڈال دیتا۔ بہار ابھی بیٹھی تھی۔ اور پیاس کا چنداں خیال نہ تھا۔ لیکن موسم جلدی جلدی بدل رہا تھا۔ اور ہوا کے گرم جھونکے شروع ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں یہ فکر خاص طور پر دامنگیر تھی کہ راستہ کی وزیری قوموں کی چڑھائی کا وقت شروع ہے۔ اور چند روز میں راستہ کے پہاڑ بالکل ویران اور غیر آباد رہ جائیں گے۔ اور ہر طرف ان خانہ ویرانوں کی

بادشاہت ہو جائے گی۔ ابھی تک طبیعت میں یہ بڑی دلیری تھی۔ کہ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہم ان قوموں میں پہنچ سکتے ہیں۔ جو سرکار انگلشیہ سے ہمدردی رکھتی ہیں اور انعام و اکرام کی امید میں ہماری رہائی کا ذریعہ ہونا اپنا فخر سمجھتی ہیں لیکن جب وہ گرمی سے تنگ آکر سرد پہاڑوں پر چلی جائیں گی۔ اور سب علاقہ پر مختلف اطراف سے درندوں کی طرح ڈاکو چھا جائیں گے تو پھر اللہ ہی ہے۔ جو ان حالات میں سے زندہ بچا نکالے۔ یہ خیال آ آکر طبیعت گھبرا اٹھتی۔ اور جی چاہتا کہ جس طرح بن پڑے بھاگ نکلوں۔ ان خیالات کی آگ میرے اندر بے طرح بھڑک اٹھتی۔ اور ایسا جوش پیدا ہوتا۔ کہ میں اسے دبا نہ سکتا۔ اور قدرتاً کسی ہمراز کی تلاش ہوتی۔ جو علاوہ مددگار ہونے کے میرے لئے ڈھارس بنے۔ اس ارادہ سے میں نے سندر لال جی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ گرفتاری سے پہلے ہماری صرف آپس میں شناسائی تھی۔ لیکن واقعات کی نوعیت اور مشترکہ مصیبت نے ہم میں گہری الفت پیدا کر دی تھی جب ہم اسیر ہو کر پہنچے تو سب سے پہلے ہم میں کچھ عہد و پیمان ہوئے۔ جو یہ تھے۔

ا۔ ان لوگوں کا یہ طریقہ ہو گا۔ کہ ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے ہمارے راز دریافت کریں گے۔ اور خواہ مخواہ کہیں گے۔ کہ میں لالہ جی کے برخلاف اس طرح کہتا ہوں یا سندر لال جی میرے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں۔ سو ان باتوں میں ہرگز نہ آنا چاہیئے۔ ورنہ دونوں نقصان اٹھائیں گے نیز ہم نے پہلے عہد و پیماں کر لئے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے دوسرے کی بھلائی اور رہائی کے واسطے کوشش کرنا چاہیئے۔ اور اس بارہ میں میں نے لالہ صاحب کو انوار سہیلی کا قصہ کبوتروں کے پھنس جانے اور ایک دوسرے کی مدد کی وجہ سے بچ نکلنے

کا سنایا۔ اور اس طرح یہ اقرار ہم میں پکا ہو گیا۔ اور کبھی بھی ایک دوسرے کے برخلاف لفظ نہ نکلا۔ حالانکہ وہ ہم کو بہت بھڑکاتے رہے۔

۲۔ میں دیکھتا تھا۔ کہ بعض اوقات شیخی میں آ کر یا سہو اور بھول سے لالہ صاحب کی زبان سے ان لوگوں کے سامنے ایسے کلمات نکل جاتے جو میرے یا خود ان کے حق میں مضر ہوتے۔ اور مجھے یقین تھا۔ کہ میرا بھی ایسا ہی حال ہو گا جو لالہ شنکر لال محسوس کرتے ہونگے پس آپس میں یہ فیصلہ ہو گیا۔ کہ جب ہم میں ایک اپنے ساتھی کو ایسی غلطی کرتے دیکھے۔ تو جھٹ اشارہ سے روک دے۔ اس ترکیب سے ہمیں بے حد فائدہ ہوا۔ اور ایسی مشق ہو گئی کہ ذرا سا اشارہ پاتے ہی بات کا پہلو اس طرح بدل لیتے کہ شروع کئے ہوئے مطلب کے بالکل برعکس نتیجہ نکال لیتے۔

۳۔ جب ایک ساتھی کسی بات پر اصرار کرے۔ تو دوسرا طبیعت پر جبر کر کے بھی اس پر عمل کرے۔ کیونکہ اصرار کرنے والا شاید اس کی مصلحت اسوقت نہ ظاہر کر سکتا ہو۔ یعنی ایک نے کہی دوسرے مانی۔ نانک جانو دونوں گیانی۔

۴۔ اگر ایک کی رہائی ہو جائے تو اس پر اچھا کھانا یا پہننا حرام ہے۔ تاوقتیکہ دوسرے کو نہ چھڑا لے۔

ان اقرار ناموں کی تہ دل سے ہم دونوں نے پابندی کی کبھی کسی کو ایکدوسرے سے شکایت کا موقعہ نہ ملا۔ ہم ایک مشترکہ مصیبت میں گرفتار تھے۔ اس لئے موقعہ ملتا بھی کیوں۔ اور اگر تعلی نہ سمجھی جائے تو ایک امر واقعہ یہ بھی تھا۔ کہ کئی موقعوں پر میں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر لالہ صاحب کو مصیبت سے بچایا۔ اس طرح ہماری

الفت سطحی حد سے گذر کر دل کی گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے لالہ صاحب سے یہاں تک محبت ہو گئی تھی کہ جب وسیم گل نے یہ احکام جاری کر دیئے کہ ہم ایک دوسرے سے نہ ملا کریں۔ تو میرا دل ان کے دیکھنے کے لئے بیقرار ہو جاتا۔

غرض جب ہماری محبت کامل اعتماد اور اعتبار کی حد کو پہنچ گئی۔ اس وقت میں نے لالہ صاحب کو آہستہ آہستہ اپنے راز پر مطلع کرنا شروع کیا۔ لیکن جب کبھی میں بھاگ نکلنے کے امکان کا ذکر لالہ جی سے کرتا تو وہ میرے ساتھ متفق نہ ہوتے اور جواب دیتے کہ بابو صاحب ہم سن رہے ہیں۔ کہ سرکار ہمیں چھڑانا چاہتی ہے اور امید ہے ہم جلدی چھوٹ جائیں گے۔ یہ چند روز کی سختی اور برداشت کر لو۔ جس جس نے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ وہ بہت بری طرح قتل کیا گیا۔ اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ لہٰذا اس خیال کو چندے اور دبائے رکھو۔

حقیقت میں جو اخبار اس وقت مشہور تھے۔ اس سے یہی یقین ہوتا تھا۔ کہ سرکارِ عالی مدار ہمیں ضرور جلد رہائی دلا دے گی۔ فراری لوگوں کا بھی ایسا ہی خیال تھا اور یہی راز تھا۔ کہ ہم اس وحشیانہ سلوک سے بچے رہے۔ جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ لیکن ان خبروں کے باوجود میں اپنی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے کسی قسم کا تساہل نہ ہونے دیتا۔

تلو رام سے ہم اپنے متعلق جاسوسی کا کام لیتے۔ اور جو باتیں فراری ہمارے سامنے نہ کرتے۔ وہ کوشش کر کے سنتا اور ہمیں آگاہ کرتا۔

پہلی دفعہ جب وسیم گل دس بارہ روز غائب رہ کر واپس آیا۔ اور اس نے اور معلم اور خو ستے نے جیسا کہ ہم باب ۴ میں ذکر کر آتے ہیں متفق اللسان ہو کر

کہا۔ کہ چیف کمشنر صاحب نے ملکوں کو پندرہ یوم کی مہلت دی ہے۔ کہ بابو کو چھڑا لائیں۔ ایسی خبروں کو سن کر اگرچہ کچھ تسلی ہوتی لیکن میں اپنے مُلک کی رعیت کے تعلقات گورنمنٹ کے ساتھ جانتا تھا۔ اس لیئے ان خبروں کے جلدی بے بنیاد ثابت ہونے سے غافل نہ تھا۔

اپنے قصّے کے سلسلہ کو ذرا یہاں چھوڑ کر میں ان خبروں کی تصویر کا دوسرا رُخ بھی اپنے معزز ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور تھوڑی دیر کے لیئے ان کی توجہ خوست کے واقعات سے ہٹا کر لوچی اور بنوں کی سرگرمیوں کیطرف مبذول کراتا ہوں۔ تا کہ وہاں کے واقعات کی رفتار کی روشنی میں ناظرین ان افواہوں کی حقیقت کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ درحقیقت جو کوششیں ہماری رہائی کی نسبت ہمارے ورثا کر رہے تھے۔ اور جو روش پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نے اختیار کر رکھی تھی ان دونوں میں بڑا اختلاف تھا۔ گورنمنٹ کی پوزیشن اس معاملہ میں یہ تھی۔ کہ ایک تو سرکاری ملازم کو اس طرح گرفتار کر کے لے جانے کا واقعہ ہی اس کے رعب وداب کے منافی تھا۔ مزید براں اسیری سے رہائی نہ دلا سکنا گورنمنٹ کے مفاد کے اور بھی خلاف تھا کیونکہ اس سے سرکاری ملازمین میں بددلی اور بے اطمینانی پھیلنے کا اندیشہ تھا لیکن اس کے مقابل یہ امر بھی غور طلب اور اہم تھا۔ کہ وزیریوں نے رعیت کے افراد کو اٹھا لے جانا ذریعہ تجارت بنا رکھا ہے۔ اور اگر ان کو فدیہ کی گراں قدر رقمیں ملتی رہیں تو ان کی تجارت کو فروغ ہوگا۔ اور وارداتیں بڑھتی جائیں گی۔ اس لیئے اگر وہ قیدیوں کو عذاب دے دے کر مار بھی ڈالیں اور زرِ فدیہ نہ لے سکیں تو ان کی تجارت ماند پڑ جائے گی۔ اور وارداتیں کم ہو جائیں گی۔

دوسرے میری ذات پر فدیہ کی گراں قدر رقم صرف اس لئے طلب کی جا رہی تھی کہ سرکار مجھے ضرور ہی چھڑائے گی۔ اگر وہ میرے معاملہ میں اس قدر رقم وصول کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ تو نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ سرکاری ملازموں کو گرفتار کرنے کے لئے انہیں بہت زیادہ ترغیب اور تحریص پیدا ہو گی۔ اس لحاظ سے بھی فراریوں کی حوصلہ شکنی ضروری تھی۔ بنا بریں ایک سرکاری ملازم کی حیثیت میں میرا فدیہ ادا ہونا حکام کو گوارا نہ تھا۔ باقی رہا یہ امر کہ فراری مجھے کس قدر عذاب سے قتل کریں گے۔ یا میرے والدین پر کیا گذر رہی ہو گی۔ یا بیوی بچے۔ بیوہ اور یتیم ہو جائیں گے۔ سو اس کا جواب ایک ایسی المناک حقیقت ہے کہ جس پر جتنی کم خامہ فرسائی کی جائے اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ ناظرین کرام کے تجربہ کار دماغ اس حقیقت کی تلخی کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں ÷

پس ان حالات میں گورنمنٹ کی تمام تر کوشش اسی پر مرکوز ہو گی کہ افغان گورنمنٹ پر سخت دباؤ ڈال کر مجھے مفت رہائی دلوائی جائے۔ اور اگر کامیابی نہ ہو تو پولیٹکل نظریہ سے میرا قتل ہو جانا فدیہ دے کر چھڑانے سے بہتر تھا۔

ان واقعات کو مدنظر رکھ کر غور فرمائیں کہ ادھر میرے وارثوں کی فدیہ پہنچا کر مجھے رہائی دلانے کی جان و دل سے تمنا اور گورنمنٹ سے مدد کی استدعا اور ادھر حکام کی یہ خواہش کہ نتیجہ کچھ بھی ہو سرکار کے دشمنوں کو زر فدیہ نہیں پہنچنا چاہیئے۔ ادھر کسی بھی قیمت پر مجھے واپس خریدنے کی تمنا اور ادھر پولیٹکل مفاد کی قربانگاہ پر میری بھینٹ کا جواز

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اپنے مذکورہ بالا خیالات کے سلسلہ میں میں ایک نہایت اہم خط کی نقل ذیل میں درج کرتا ہوں

جسکے مطالعہ سے ناظرین پر پوری طرح روشن ہو جائیگا۔ کہ میری رہائی کے سلسلہ میں گورنمنٹ عالیہ کو کس نوعیت کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اور نیز میرے ورثا کو کامیابی حاصل کرنے میں کس قدر اور کس قسم کی رکاوٹیں درپیش تھیں۔ یہ مکتوب جیسا کہ اس کی تحریر سے ہی عیاں ہے۔ ایک بڑے ذمّہ دار افسر کی جانب سے سرحد کی ایک نہایت ہی مقتدر ہستی کی طرف لکھا گیا ہے اور سوائے چند بالکل غیر اہم واقعات کے جن میں غالباً راقم الخط کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور جن کا ازالہ میں نے بذریعہ فٹ نوٹ کر دیا ہے صحیح صحیح حالات کا مرقع پیش کرتا ہے۔

از میران شاہ۔ مورخہ ۹ مئی ۱۹۱۰ء

بحضور آقائے نامدار جناب والاشان . . . . . . دام اقبالہٗ

بعد از سلام و تسلیمات و کورنشات پیغامات گذارش ہے کہ حضور کا نوازشنامہ شرف صدور لا کر باعثِ افتخار ہوا۔ حالات بابو محمد اکرم خاں اس طور پر ہیں۔ کہ بتاریخ ۲۵ اپریل ۱۹۱۰ء وہ معہ ایک ٹھیکہ دار سُندر داس نامی کے تقریباً بوقت دو بجے شام میران شاہ سے سیدگی کو جو یہاں بجانب بنوں ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بہ سواری ٹُم روانہ ہوئے۔ پوسٹ عیدک تک تو صحیح سلامت پہنچے اور وہاں ایک بنیا جو خوش قسمت تھا۔ اُتر گیا۔ مگر بابو محمد اکرم اور سُندر داس باوجودیکہ دیر ہو گئی تھی اور بارش بھی جاری تھی اپنی قسمت کے قصور سے ٹُم کو ہانکتے گئے جب ۶ بجے شام[1]

---

[1] راقم موصوف نے غالباً مصلحتاً یا غلط فہمی سے ۶ بجے لکھا ہے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ہم دو بجے روانہ ہوئے تھے۔ تو بھی دو اسپہ سواری میں ۱۴ میل کا سفر جا کر خطرناک رستہ میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں لے سکتا میران شاہ سے ہمارے پکڑے جانیکا مقام ۱۴ میل تھا۔ اس لحاظ سے بھی گرفتاری کا وقت ۴ بجے ہو گا۔

کے قریب پوسٹ کھوری سے دو میل کے فاصلہ پر پہنچے تو آٹھ کسان[1] دو مزدور جو علاقہ خوست سے اپنے گھروں کو آئے تھے۔ اور شام کے وقت بارش میں جب انہوں نے خیال کیا کہ کوئی آدمی باہر ان کو دیکھنے اور پکڑنے والا نہ ہوگا۔ اپنے موضع متوسکی سے غالباً آتے ہوئے سڑک شاہی پر آئے۔ تو ٹمٹم دیکھ کر ان کا جی للچایا۔ اور خالی ہاتھ خوست واپس جانے سے انہوں نے یہی غنیمت جانی کہ کوئی شکار بھی ساتھ لے جاویں۔ چنانچہ ٹمٹم کے بالمقابل آکر انہوں نے آواز دی کہ ٹمٹم کھڑی کر دو۔ سندر داس جو ٹمٹم چلا رہا تھا اس نے فوراً ٹمٹم کھڑی کر دی۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ نیچے اتر آؤ۔ سندر داس کود کر فوراً نیچے آ رہا۔ بابو صاحب کچھ لیت و لعل کرنے لگے۔ مگر بے چارے بے بس تھے۔ طوعاً کرہاً ان کو بھی نیچے اترنا پڑا۔ اجزا امین نامی ایک نوکر ٹمٹم میں سوار تھا۔ جو سندر داس کا نوکر تھا۔ بدمعاشوں نے گھوڑوں کو کھول کر علیحدہ ایک موقعہ پر ایک درخت سے باندھ دیا۔ ٹمٹم راستہ میں کھڑی کر دی اور ہر سہ اشخاص بابو صاحب ٹھیکہ دار اور اس کے نوکر کو گرفتار کر کے برستے مینہ میں خوست کو لے چلے۔ ساری رات سفر کر کے صبح کو بتاریخ ۲۶ر اپریل ۱۹۱۰ء اپنے مسکن کوژا علاقہ خوست میں پہنچ گئے۔ رات اندھیری[2] تھی۔ اور مینہ بھی برستا تھا۔ راستہ میں ان کو کوئی آدمی نہ ملا۔ صرف عصمت نامی

---

[1] آٹھ کسان نہیں تھے۔ بلکہ چھ تھے۔

[2] رات بادل کی وجہ سے اندھیری تھی۔ لیکن چاند کی تیرھویں تاریخ تھی۔ اور بادل چھٹ جانے کے بعد خوب چاندنی نکھر گئی۔

ایک شخص ان کے سامنے آیا۔ جو اس کو بھی پکڑ کر ہمراہ[1] لے گئے
اور پھر کچھ دور لیجا کر اس کو چھوڑ دیا۔ اور منزل مقصود پر پہنچ کر بدمعاشوں نے
جزامین نوکر ٹھیکہ دار کو بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ ان کے وارثوں کو کہہ دو۔ دو دو
ہزار روپیہ لے آویں۔ اور قیدی اپنے چھڑا لے جاویں۔ بابو محمد اکرم کے
پاس ایک سرکاری پستول بھی تھا جو اس نے اچھا کیا کہ نہیں چلایا۔ ورنہ
ضرور مارا جاتا۔ اب خوست میں ان بدمعاشوں نے بابو اور ٹھیکہ دار کو ٹھہ
Stook میں ڈالا ہوا ہے زنجیروں سے بھی باندھا ہوا ہے۔ بابو صاحب
کی چٹھیاں اور حال واحوال متواتر آتے رہتے ہیں۔ اور یہاں سے بھی ان
کی رہائی اور خبر گیری کے واسطے حتی الوسع کوشش ہو رہی ہے۔ مگر بیچارہ
ایسے موذیوں کے پھندے میں پھنسا ہے جو بغیر روپیہ کے اس کو نہیں
چھوڑیں گے۔ بلکہ روز بروز ان کا مطالبہ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور اس
کام پر روپیہ صرف کرنا افسروں کو منظور نہیں ہے۔ ایک موز ملک کو معہ
ایک مراسلہ کے سردار[2] خوست کے پاس روانہ کیا گیا۔ اور معمولی تحفہ تحائف
بھی اس کی خدمت میں بھیجے گئے۔ اور التجا کی کہ بیچارے مظلوموں کی رہائی کرا کر
ثواب دارین حاصل کریں۔ وہ آج واپس آیا ہے اور بیان کرتا ہے۔ کہ
اوّل تو سردار بہت مہربانی سے پیش آیا۔ لاکن جب اس کو مراسلہ دکھلایا
گیا تو یکایک اس کے تیور بدل گئے۔ اور حکم دیا کہ آئندہ میرے پاس

---

[1] غالباً یہ وہ شخص ہے جس کو وسیم گل نے جا کر جان کا خوف دلایا تھا میرا قیاس ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کی خاطر کہیں اس نے فوراً اطلاع نہ دی۔ یہ افسانہ محکمہ پولیٹیکل میں سنایا ہوگا۔ کہ اس کو بھی ہمراہ لے گئے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔
[2] شاہ غازی یعنی حاکم خوست عموماً شاہی خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ اس لئے سردار کہلاتا ہے۔

ڈاک مت لایا کرو۔ میں نے قوم کی طرف کی ڈاک بھی بند کر دی ہے۔ اور ٹوچی کی ڈاک بھی بند کرتا ہوں۔ تم لوگوں کو راستہ میں نقصان پہنچے گا میں ذمہ وار نہیں ہو سکتا۔ اور زبانی اس کو یہ جواب دیا گیا۔ کہ کوئی بابو یا ٹھیکہ دار ہمارے علاقہ میں نہیں لایا گیا۔ تم لوگ ناحق میرے علاقہ کو بدنام کرتے ہو حالانکہ میں نے لوگوں کو تنگ کر کے ایسا عمدہ انتظام کیا ہوا ہے۔ کہ بالکل واردات بند ہو گئی ہے۔ ملک بیچارہ جس قدر عرض معروض کرتا رہا۔ سردار نے کچھ توجہ نہ کی۔ حالانکہ امید تھی کہ چونکہ کمشن شروع ہونے والا ہے۔ اب اس قدر بے اعتنائی وہ نہیں کرے گا۔ اب ایک اور آدمی تیار کر کے بھیج رہے ہیں۔ کہ جس طرح بھی ہو سکے بابو صاحب کی مخلصی کی تجویز کرے۔ میں تو پہلے ہی سے کوشاں تھا۔ کیونکہ اگرچہ بابو صاحب سے میری واقفیت نہیں ہے۔ مگر ایک مسلمان بھائی ظالموں کے پنجہ میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کی رہائی کے واسطے کوشش کرنی ہمارا فرض ہے اور اب جبکہ حضور کا فرمان بھی وارد ہوا ہے۔ تو تہ دل سے کوشش میں مصروف ہوں۔ اور انشاء اللہ اس خدمت کو بجا لا کر حضور کے روبرو سُرخ رو ہوں گا۔ مگر غضب یہ ہے کہ بدمعاشان امیر صاحب کے علاقہ میں ہیں جہاں ہمارا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں۔ البتہ اگر آپ اجازت عطا فرماویں تو لشکر بھیج کر ان پر حملہ کرا سکتا ہوں جس میں امید ہے کہ بابو صاحب بھی چھوٹ جائے گا۔ اور ان بدمعاشوں کو بھی بہت کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے مگر اس قسم کی کارروائی ہماری بردبار عادل گورنمنٹ روا نہیں رکھتی۔

آپ نے سن لیا ہو گا کہ مضافی بنوں کے چوکیدار کو بھی وہی خوست کے
فراری لے گئے ہیں۔ جو ہنوز ان کے پاس ہے۔ اور تحصیل بنوں کے وچڑاسیول
اور ایک ہندو کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ادھر سے کمشن تیار ہے اور ادھر سے
واردواتوں کا یہ حال ہے۔ ان بدذاتوں نے سخت تنگ کر رکھا ہے۔
خداوندِ ذوالجلال اپنا فضل فرماویں۔ آمین حضور دُعا کی مہربانی فرماویں۔ اور
کوشش جہاں تک ایک انسان کر سکتا ہے۔ اس میں ذرا بھی فرق نہ ہو
گا حضور مطمئن رہیں۔ البتہ تقصیر معاف کرنا۔ اللہ پاک کے اختیار میں ہے۔
"تمبئی تدوّش پور سے گم حد سے"۔[۱]

اگر میرے لائق کوئی کارِ خدمت ہو گا تو میں اسکی سرانجامی دینا فخر سمجھونگا...

اگرچہ اس خط کے مضمون سے میری صحیح حالت کا نقشہ ناظرین کے سامنے آگیا ہو گا۔ پھر بھی میں اس میں سے چند امور کی جانب خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں یعنی موذیوں کا مسکن افغانی سلطنت کے علاقہ خوست میں ہونے کیوجہ سے سرکار انگلشیہ کا کوئی بس ان پر نہ چل سکتا تھا۔ اور وہ ظالم بغیر روپیہ لئے مجھے کبھی نہ چھوڑتے۔ روپیہ دینا حکام کو منظور نہ تھا۔ اس لئے گورنمنٹ کے پاس میری رہائی کا واحد ذریعہ پولیٹیکل دباؤ یا ڈپلومیٹک چاپلوسی تھا۔ لیکن اس دباؤ اور اس درخواست کے لئے پہلی تنقیح میرا خوست میں مقید ہونا ثابت کرنا تھا۔ اگر یہ ثابت نہ ہو تو دباؤ اور درخواست فضول۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو حکامِ افغانستان اسے اپنی سلطنت کی بدنامی کا باعث خیال کرتے تھے چنانچہ

---

[۱] پشتو کی ضرب المثل۔ عاشق اپنے اختیار تک ہی قصور وار کہا جا سکتا ہے۔

حاکمِ خوست نے باوجودیکہ وہ یقینی طور پر میرے تمام حالات سے واقف تھا۔ کس طرح تجاہلِ عارفانہ کرتے ہوئے میری وہاں پر موجودگی سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ واقعات کو سُننا بھی گوارا نہ کیا۔ ایسے حالات میں ہماری سرکار اگر کوئی حتمی ثبوت بہم پہنچا بھی دیتی۔ تو اس کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوتا۔ کہ وہ ہمیں قتل کر دیتے تاکہ کوئی ثبوت ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ اخیر میں بالکل یہی صورت پیش آئی اور حاکمِ خوست نے ہمارے قتل کا حکم بھیجدیا۔

ہمارے وارثوں نے جو سرگرمیاں ہر طرف سے کی ہوئی تھیں اُن کے مختصر ذکر کا بھی یہ کتاب متحمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا بیرونی واقعات پر اس قدر روشنی ڈال کر ناظرین کرام کو مَیں پھر واپس لیجا کر قصّہ کو سلسلہ وار شروع کرتا ہوں۔

لالہ سندرلال گورنمنٹ کی رہائی دلانے کی خبروں پر بھروسہ کر کے اپنی حالت پر قانع رہنا چاہتے تھے۔ اور فرماتے کہ جب تک ہم گھروں سے اور سرکار سے بالکل نا امید نہ ہولیں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اپنے اوپر بلا لیں۔ اگر پکڑے گئے تو وہ وہ تکالیف دیں گے۔ جو ہماری ساری عمر کے لئے نشانی رہیں گی۔ پاؤں کاٹ دیں گے۔ دانت توڑ دیں گے۔ یا کوئی ایسا ہی اور عضو کاٹ لیں گے۔ اس کے جواب میں مَیں نے لالہ صاحب کو یہ سمجھایا۔ کہ مَیں نے ان امور پر پوری طرح غور کر لیا ہے۔ لیکن مَیں موت کو اس قید پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور جب ہم بھاگیں گے تو ضرور ایک رائفل اپنے ساتھ لے کر بھاگیں گے۔ اور خدانخواستہ اگر ہم کامیاب نہ ہو سکے۔ اور وہ ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ تو ہم لڑ کر جان دے دیں گے۔ ؏

گرچہ نتواں بدوست رہ بُردن ۔۔۔ شرطِ عشق است در طلب مُردن

غرض ہر وقت اس قسم کی گفتگو سے لالہ صاحب کے خیالات بھی تبدیل ہونے لگے
اور میری اس عرضداشت پر غور فرمانے لگے۔

ان کو اس طرف مائل پاکر میں نے آہستہ آہستہ اپنی تجاویز کو ان پر ظاہر کرنا
شروع کیا۔ طرح طرح کی حکایات سے ان کو امیدیں دلاتا۔ اور آخر موقع پاکر ایک
روز میں نے انہیں اپنی زنجیریں کھول کر دکھائیں۔ یہ حال دیکھ ان کے دل میں
بھی امنگ پیدا ہوئی۔ اور انہوں نے بھی اپنی زنجیریں کھولنے کے لئے آمادگی
ظاہر کی۔ لالہ سندر لال کی زنجیریں میری زنجیروں سے بہت سخت تھیں۔ اور مزید براں
جس روز مدآمیر خوست کی طرف واپس جانے لگا۔ تو اس نے اپنے سامنے
گل قدم کے ہاتھ لالہ صاحب کی زنجیروں میں اور تار ڈلوا کر اسے بڑا مضبوط کر دیا
اور لالہ صاحب کو چلنے میں بھی میری نسبت زیادہ دقّت ہوتی۔

میں نے لالہ صاحب کی زنجیروں کو غور سے دیکھا اور ان کو یقین دلایا۔ کہ
انسان کے آگے کوئی کام ناممکن نہیں۔ البتہ اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

ان دنوں میرے دل میں قدرتاً ایک یقین سا پیدا ہوجاتا جس کام کی بابت
میں خیال کرتا۔ خواہ وہ ناممکن العمل ہوتا میرے دل میں یہی گذرتا۔ کہ نہیں یہ ضرور ہی
ہوجائے گا۔ لالہ صاحب کی زنجیروں کا بغیر اوزار کے کھلنا ناممکن نظر آتا۔ اور خاصکر
جب یہ بھی خیال مدِنظر ہو۔ کہ سرسری نظر میں فراری لوگوں کو پتہ نہ لگے۔ لالہ صاحب
خود بھی تجاویز سوچنے لگے۔ اور میں بھی اسی خیال میں محو رہنے لگا۔ لالہ صاحب
نے رام کا نام جپنے کے لئے ٹوٹے دھاگے ہیں کئی سو گرہ دے کر ایک مالا بنائی
جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ موقع پاکر اس مضبوط دھاگے کے ذریعے تار کے سروں کو

علیحدہ کیا جاوے۔ لیکن سمندر میں کاغذ کی ناؤ کب چلے۔ کہاں لوہے کی مضبوط زنجیر اور کہاں بچارا سوت کا دھاگا۔ اس کے آٹھ آٹھ تار ملا کر استعمال کئے گئے۔ لیکن کچھ اثر زنجیر پر نہ ہوا۔ پھر بھی مجھے یقین رہا۔ کہ ہماری لگاتار کوشش سے ضرور کوئی صورت نکل آئے گی۔

معتدل بہار اب گذر چکی تھی۔ دوپہر کے وقت شدت کی گرمی پڑنی شروع ہو گئی۔ پہاڑوں کے پتھر تپ کر اس جگہ کی آب و ہوا کو بہت گرم بنا دیتے ہیں۔ اس لئے وزاریوں کا تقسیم اوقات بھی اب بدل گیا۔ ہمارے مسکن کی پہاڑی کے نیچے ایک زمین کا ٹکڑا قابل کاشت تھا۔ جو سیلاب کے وقت کیتی نالے کے پانی سے سیراب ہوتا۔ اس کا کچھ حصہ مدے اور مدا خیل نے بھی مول لے رکھا تھا۔ اس زمین میں توت کے درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا۔ صبح کے وقت سویرے یہ لوگ توت کھانے چلے جاتے۔ اور دس بجے وہاں سے واپس آتے۔ اور چھپروں کی چھاؤں میں دو دو چار چار مل بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتے۔ بعد ازاں دس بجے کھانا کھا کر پھر توتوں کے سائے میں جا آرام کرتے۔ وہاں ٹھنڈی ہوا چلتی۔ اور چھپروں کی نسبت بہت آرام رہتا۔ نماز ظہر وہیں ادا کرتے۔ اور دن ڈھلے گھروں میں واپس آجاتے۔ عصر کی نماز دن غروب ہونے کے قریب ادا کی جاتی۔ اور اس وقت تک گھروں میں بیٹھے رہتے۔ دوپہر کے وقت ہمارا چارج عورتوں کے سپرد ہوتا۔ یہ اجازت نہیں تھی کہ لالہ سندر لال اور میں ایک ہی جگہ بیٹھیں۔ نیک نامے میرے پاس بیٹھی اپنا کام[1] کاج کیا کرتی۔ یا چھپر کے

---

[1] عورتوں کا کام تھا۔ لکڑیاں توڑ کے جمع کرنا۔ گھر کے مٹی کے برتن گھڑے ہانڈیاں پیالے بنانا۔

دروازے میں چٹائی ڈالے پڑی سویا کرتی۔ لالہ سندر لال کے پاس خوشنے کی ماں اور اس کی بھاوج رہا کرتیں۔ وہ باری باری پہرہ دیتیں۔ اور میری طرف بھی خیال رکھتیں۔ لالہ صاحب اکیلے بیٹھ کر اکثر رویا کرتے۔ عورتوں کا دل مردوں کی بہ نسبت کمزور ہوتا ہے۔ ان کے گرد دو چار عورتیں بیٹھ جاتیں۔ اور ہمدردی کی باتیں کیا کرتیں۔ ان کو اس طرح نرم کر کے لالہ صاحب میرے پاس بیٹھنے کی اجازت لے کر چلے آتے۔ نیک نامے لالہ جی کے اس طرح وارد ہونے سے بہت چڑ ہوتی لیکن میرے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ خوشنے کی ماں کے پاس جا بیٹھتی۔ اور اس طرح ہمارے پہرہ کی باری ان تینوں پر منقسم ہو جاتی۔ اس وقت ہمارا بھاگ نکلنا بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ فرضاً اگر یہ سب سو بھی جائیں تو بھی گاؤں میں ان کے علاوہ اتنی موجود تھیں کہ انمیں سے کوئی نہ کوئی ضرور دیکھ لیتی۔ نیز نالے میں چرواہے مویشی چرا رہے ہوتے۔ مزید برآں آبادی پہاڑوں میں روز روشن بچ کر نکلنا خیال خام تھا لیکن ہم دونوں کا مل کر بیٹھنا ضائع نہ جاتا۔ اور سب سے بڑا کام جو اکیلے بیٹھ کر کیا وہ لالہ جی کی زنجیروں کا کھلوانا تھا۔ لالہ صاحب کی زنجیروں کو غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے دونوں سرے لالہ صاحب کے دائیں پاؤں کے باہر کی طرف لا کر ملائے گئے ہیں۔ اور ان میں جو تار ڈالا گیا ہے۔ اس کا کھولنا آسان ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ دونوں پاؤں کے درمیان والا حصہ زنجیر دیکھتے۔ یہ کسی کو یاد بھی نہ تھا۔ کہ پاؤں کے باہر بھی اس کا جوڑ ہے۔ سو ہم نے ایک دو پہر اس کے کھولنے کی کوشش کی لیکن زنجیر بڑی سخت تھی۔ کچھ پیش نہ گئی۔ اتفاقاً لالہ صاحب کو وہ قفل جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یاد آ گیا۔ اور انہوں نے اس سے مدد لینی چاہی۔ لالہ صاحب کو گویا یہ الہام

ہوا۔کیونکہ یہ قفل آئندہ ہمیں نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں۔کہ اسی کے ذریعہ ہماری جان بچی۔اس قفل کا سر بہت باریک تھا جو تار کے پیچوں کے اندر چلا جاتا۔اور پھر لیور کی طرح اس سے زور لگ سکتا۔

غرض اس قفل کو لے کر لالہ صاحب کی زنجیر کو کھولنا شروع کیا۔اور اللہ کی عنایت سے ہم کامیاب ہو گئے زنجیر کے دونوں سرے بالکل علیحدہ کر دیئے۔اور زنجیر کو اتار لیا۔اس کے بعد قفل کا پارچ لالہ صاحب نے مجھے دے دیا۔اور میں نے اسے ازار بند کے ساتھ باندھ کر پاجامہ کے اندر ڈال دیا۔اور زنجیر کو پھر عارضی طور پر مضبوط کر دیا۔

اپنی کامیابی دیکھ کر ہمارے دل جوش سے بھر گئے اور جلدی نکلنے کا موقع تاڑنے لگے۔لیکن ابھی مجھے لالہ صاحب کے دل کا اندازہ لگانا تھا۔کہ آیا وہ وقت پر جرأت کر سکیں گے یا نہیں۔میں نے اس بات کے لیئے انہیں آزمانا شروع کیا لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔اور یہ ایک اور مشکل نظر آنے لگی۔

لالہ صاحب کو ابھارنے اور ان کا دل مضبوط کرنے کے لیئے میں ان کو بڑی بڑی حکائتیں سنایا کرتا۔اور ان کے ہر وقت کے روتے رہنے کے طرف اشارہ کر کے کہتا۔ع

روئے گا بے پروبالی پہ قفس میں کب تک
ہے اگر خواہش پرواز تو پَر پیدا کر

اور میں نے بھاگ نکلنے کے خیال کو حدِ اعتدال سے گذار کر بہت زیادہ کر دیا۔جس سے لالہ صاحب مجھے ہمیشہ روکتے ہیں ہر وقت اسی خیال میں مستغرق رہتا

ہر لحظہ یہی ذکر چھیڑے رکھتا۔ کبھی کسی سے راستہ کا ذکر ہے کبھی ارد گرد کی تفحص ہے کبھی پانی کی پرسش ہے۔ لالہ صاحب مجھے بہت روکا کرتے۔ کہ راز افشائے ہو جائے گا۔ حوصلہ کرو اور صبر سے کام لو۔ ابھی بھاگنے کے خیال کو ملتوی رکھو کیوں بے فائدہ جان کو خطرہ میں ڈالتے ہو۔ میرا حد سے گذر جانیکا ایک سبب لالہ صاحب کو حد اعتدال پر لانا بھی تھا۔ چنانچہ اس مقصد میں بہت کچھ کامیاب ہوا۔ اب ہم دونوں کی کوششیں راستوں کی کیفیت کے دریافت کرنے پر صرف ہونے لگیں۔ ہر بات کا پہلو ہم اسی طرف بدلتے۔ ہر لفظ کا رُخ اسی جانب پھیر لیتے۔ وہ شخص آپس میں باتیں کرتے تو کوئی نہ کوئی حرفِ مطلب اس سے نکال ہی لیتے وہ لوگ بھی ان امور میں بڑے محتاط تھے۔ اور بڑی ہشیاری سے کام لیتے۔ مثلاً گل قدم خوست سے نمک خرید کر لایا۔ جس پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اور ظاہر تھا۔ کہ وہ انگریزی علاقہ سے خریدا گیا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ دریافت کرنا شروع کیا۔ اور آخر معلوم ہوا۔ کہ موضع ٹل سے لایا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی گل قدم نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کہ ٹل اس طرف ہے۔ وسیم گل کہیں چھپر کے باہر اس گفتگو کو سن رہا تھا۔ برہم ہو کے بولا۔ کہ گل قدم تم بڑے احمق ہو۔ گل قدم نے جواب دیا۔ کہ احمق نہیں ہوں تم نے دیکھا نہیں۔ میں نے کس طرف اشارہ کیا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ کہ ٹل کی طرف اشارہ کرنا ہمیں دھوکا دینا تھا۔ اس واقعہ سے ہی ان کی حدِ احتیاط کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب کبھی بارش ہوتی تو ختنے کی ماں وطن کو یاد کر کے رویا کرتی اور بادلوں کی چمک دیکھ کر کہا کرتی۔ کہ آج ہمارے وطن میں بارش ہو رہی ہے۔ اس کی اس

گفتگو سے بھی سمت کا پتہ چلتا۔

ایک روز ہوا بڑے زور سے چل رہی تھی۔ اور بادل جنوب مغرب کی طرف سے گھرے آرہے تھے۔ میں لالہ سندرلال اور خوت نے اکٹھے بیٹھے تھے۔ خوت نے مجھ سے کہنے لگا۔ کہ بابو یہ بادل کس جگہ چمک رہے ہیں۔ اس سوال کی تہ میں ہماری کوششوں کا اندازہ لگانا مقصود تھا۔ یعنی آیا انہیں یہ معلوم ہے کہ ہم کس جگہ بیٹھے ہیں۔ کسی پہلو سے بھی اس سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ الٹ پلٹ بنانا بھی ٹھیک نہ تھا۔ اس وقت میرے اس اصول نے مدد دی۔ جو شروع سے قائم رکھے ہوئے تھا۔ اور اس کے ذریعے بہت سے اس قسم کے سوالوں کو ٹال دیا کرتا تھا۔ میں نے اس کے سوال کو پھر اس سے دُہرایا اور اس کے دہرانے پر نہایت سادگی سے لالہ سُندرلال سے پوچھا۔ کہ یہ کیا کہتا ہے لالہ صاحب نے اس کا مطلب بیان کر کے مجھ سے یہ بھی کہا۔ کہ تم جواب دو۔ (خ۔س۔ت، یعنی خوت پر۔ یہ جواب اس کو زیادہ شک میں ڈالتا۔ سو میں نے نہایت ہی سادگی سے جواب دیا۔ کہ بادل ایسے ہی چمک رہا ہے۔ برس نہیں رہا۔ پھر اس نے جھنجلا کر پوچھا۔ کہ کس جگہ چمک رہا ہے۔ میں نے سائنس کا مسئلہ شروع کر دیا۔ کہ اس طرح بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح چمک پیدا ہوتی ہے۔ وہ ان باتوں کو بھلا کیا جانے چُپ ہو رہا۔ اس قسم کی بہتیری چالیں چلتے اور ہمارے دل کا بھید لیتے رہتے۔ لیکن آخر وقت تک ہماری طرف سے ان کا دل صاف ہی رہا۔ اور کوئی شک ان کو پیدا نہ ہوا۔

آپس میں باتیں کرنے کے لئے ہم نے اصطلاحات مقرر کر لیں پہلے

اپنے فراریوں کے نام مقرر کئے تاکہ ان کی موجودگی میں ان کا ذکر کر سکیں۔ مثلاً

وسیم گل	رتہ	یعنی سُرخ۔ اس کے چہرہ اور بالوں کی رنگت پر۔
مغلم	چھوٹا رتہ	وسیم گل کا مطیع فرمان ہونے کی وجہ سے۔
مدے	یک میم	یعنی یک چشم۔
خونے	ٹڑو	اس کی زود رنج طبیعت کے باعث۔
لوانا ملک	بیوقوف	لوانہ دیوانہ کو کہتے ہیں۔ اور وہ بیوقوف ہوتا ہے۔

ہم نے آپس میں یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ کہ اگر ہم بھاگنے سے نا امید ہو گئے۔ اور تکلیفوں کو برداشت نہ کر سکے تو دو رائفلیں اٹھا کر ایک چھپر میں مورچہ پکڑ لیں گے۔ اور ایسے موقع پر جب سب مل کر بیٹھے ہوں گے۔ ان پر فائر کر دیں گے۔ اس عمل کا نام ہم نے "فائنل پیمنٹ" آخری ادائیگی رکھا تھا۔ راستہ کا نام نوٹ بک سے تعبیر کرتے۔ بھاگ نکلنے کو بل بنانا کہتے۔ اور اسی قسم کی اور اصطلاحیں تھیں۔ یہ تقریباً لالہ صاحب نے تجویز کیں۔ تاکہ بولنے میں انکو دقت نہ ہو۔ انگریزی کی اصطلاحیں لالہ صاحب کے ٹھیکہ دار ہونے کی وجہ سے بل اور پیمنٹ وغیرہ مقرر کیں۔

لالہ صاحب کا یہ منشا تھا۔ کہ جس طرف سے ہمیں لے کر آئے ہیں۔ اسی طرف کو ہم نکلیں۔ اس تجویز کے نیک و بد پر سوچا گیا۔ اور اس راستہ کی بہت سی کیفیت معلوم کی گئی۔ لوانا ملک کا گاؤں ہم سے بہت فاصلہ پر نہ تھا۔ فراری لوگ بہت سی ضروریات بہم پہنچانے کے لئے اس گاؤں تک جایا کرتے۔ لالہ صاحب کی تجویز تھی۔ کہ کسی طرح اس تک پہنچ جائیں۔ لیکن میں اس راستہ کو اختیار کرنا خطرناک

سمجھتا تھا۔ کیونکہ فراریوں کا تمام زور اسی طرف پڑے گا۔ اور ہم فوراً غزنہ میں آجائیں گے۔ میری تجویز یہ تھی کہ کوئی ایسا راستہ نکالیں جو حتی الوسع مذکورہ راستہ کی سمت کے مخالف ہو۔ اس طرح ان کے خواب وخیال میں بھی نہ سمائے گا۔ کہ ہم نے ایک نادیدہ مخالف راہ اختیار کی ہے۔

جب فراری توتوں کے نیچے دوپہر گذارنے کے لئے چلے جاتے۔ اور مجھے اور لالہ جی کو اکٹھے بیٹھنے کا موقع مل جاتا تو لالہ سندر لال کو میں اپنے پاس بٹھا لیتا عورتوں پر یہ ظاہر کیا جاتا۔ کہ ہم اپنے وطن کا ایک کھیل کھیلتے ہیں۔ اور در اصل ہم راستوں کا نقشہ پتھروں کے ذریعے بناتے۔

یہ اس طرح کیا جاتا۔ کہ جہاں اڈنگے کا گاؤں یعنی ہمارا قید خانہ تھا۔ اس کی جگہ ہم ایک چھوٹا سا پتھر رکھ دیتے چھوٹی سی لکڑی پر میلوں کا پیمانہ بنایا جاتا اور اس کے ذریعے اردگرد کی آبادیاں لگائی جاتیں لیکن اس نقشہ میں میرا اور لالہ صاحب کا بڑا اختلاف رہتا۔ لالہ صاحب بھی گردونواح سے نابلد اور اس قسم کے نقشہ کے کام سے ناآشنا تھے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ اس طرح بھی کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اس لئے وہ اس طرف توجہ ہی نہ دیتے۔ لیکن چونکہ میری تعلیم اور ملازمت ہی انجینئری کی تھی۔ اس لئے میں اپنی رہائی کا مدار ایک بڑی حد تک اس نقشہ کی تکمیل پر سمجھتا۔ مختلف آبادیوں اور شہر وجگہوں کے ٹھیک ٹھیک فاصلے دریافت کرنا اس نقشہ کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔ میں ان فاصلوں سے مثلث بنا بنا کر علاقہ انگلشیہ کے مقامات کی صحیح صحیح سمتیں قائم کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ سب سے زیادہ موزوں سمت کا انتخاب کیا جاوے۔ اس کے بعد منتخبہ راستہ کے متعلق

یہ بھی دریافت کرنا تھا کہ اس پر آبادی کہاں کہاں ہے۔ کون کون سی قومیں اس راستہ پر آباد ہیں۔ اور ہماری سرکار کے ساتھ ان کے کس قسم کے تعلقات ہیں۔ وغیرہ

جن مقامات کی سمت دریافت کرنا میرے زیر غور تھا وہ یہ تھے۔ دتہ خیل میراں شاہ۔ سپلین وام۔ بنوں۔ ٹل۔ کرم۔ پاراچنار۔ یہاں پر مفصل بیان کرنا کہ کن کن وسائل سے میں نے ان مقامات کے متعلق کیا کیا اطلاعات بہم پہنچائیں مضمون کو ناقابلِ برداشت طویل کر دیگا۔ البتہ ان کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی وہ یہ تھی۔

۱۔ دتہ خیل ہم سے بہت دور تھا۔ افغانستان کا بہت سا علاقہ طے کرنا پڑتا۔ اور خونخوار وزیر قومیں راہ میں آباد تھیں۔ جن کے سرکارِ انگلشیہ سے اچھے تعلقات نہ تھے۔ اس لیئے اس سمت کا خیال میں نے بالکل ترک کر دیا۔

۲۔ سب سے قریب تر میراں شاہ کا علاقہ تھا۔ راستہ بہت آباد تھا۔ بلکہ گرمیوں میں اکثر قومیں ان پہاڑوں پر سردی ہونے کی وجہ سے آباد ہوتیں۔ تورکر پہاڑ خاص طور پر ٹھنڈا بیان کیا جاتا۔ جس کے دوسری جانب میراں شاہ کا علاقہ تھا۔ یہ سمت بھی کسی قدر موزوں تھی

۳۔ بنوں کی طرف جو راستے جاتے تھے وہ سب تقریباً اسی طرف اور انہی اقوام میں سے ہو کر جاتے تھے۔ جدھر سے ہم گرفتار ہو کر آئے تھے۔ اس لیئے ان کے اکثر حالات ہمیں معلوم تھے۔

۴۔ ٹل اور پاراچنار کا علاقہ ایسا تھا۔ جس طرف کے حالات معلوم کرنا ہمارے لئے نہایت ہی دشوار تھا۔ اور جتنا دشوار تھا اتنا ہی میرے نزدیک زیادہ ضروری تھا۔

۵ ۔ اس کے علاوہ لوآنہ ملک کے گاؤں تک پہنچنے کے سوال کو بھی باوجود پُرخطر ہونے کے پوری طرح زیرِغور رکھا۔

غرض ان مقامات کا نقشہ مکمل کرنے کے لئے مجھے بے حد صبر اور تحمل سے کام کرنا پڑا۔ بار بار کی ناکامیوں کے باوجود بڑے استقلال کے ساتھ سُراغ رسانی جاری رکھی۔ جس حد تک وہ ہماری معلومات کو محدود رکھنے کے لئے احتیاط برتتے اس کا ذکر ابھی اوپر کر آیا ہوں۔ لیکن ایلآدار دستے کا امداد سے میں نے بہت سارا مواد جمع کر لیا۔ بدقسمتی سے وہ ہمارے گاؤں میں بہت کم ٹھہرتا۔ اس لئے موقع بہت تھوڑا ملتا۔ اس طرح ایک مدت تک ہم اسی دھندے میں لگے رہے۔ لیکن خدا تعالےٰ کی مدد اور فضل سے میں نے نقشہ مکمل کر ہی لیا۔ جس کے بعد میں اس کی صحت کو پرکھتا رہتا۔ بڑے غور د خوض کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی کہ بھاگنے کے لئے پاراچنار کی سمت سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔ کیونکہ وہ ہماری گرفتاری والے راستہ سے تقریباً زاویہ قائمہ پر واقع تھا۔ اور دوسرے راستوں کی نسبت سب سے زیادہ مخالف سمت میں تھا۔ قوم کے کچھ حالات مجھے اپنے ایک دوست نے سیدگی میں بتائے تھے۔ یہ صاحب قوم سے تبدیل ہو کر اسی روز سیدگی بعہدہ پوسٹ ماسٹری پہنچے تھے جس روز میں نے سیدگی میں قدم رکھا تھا۔ پاراچنار کی سمت کی طرف جو پہاڑ دور سے نظر آتے وہ برف سے ڈھکے رہتے۔ اور ان کا نام بھی ہم نے دریافت کر ہی لیا۔ انہیں سپین غرحی سفید کوہ کہتے تھے۔ چنانچہ قوم کے جو حالات میری یاد میں محفوظ تھے۔ وہ عین اس نظارہ اور اس

نام کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔ اب ایک اور مشکل یہ تھی کہ ہم جس مقام کی طرف رُخ کرینگے۔ اغلب ہے کہ اس سے کچھ میل ادھر یا ادھر پہنچ جائیں یا نقشہ میں کئی میلوں کی غلطی ہو۔ تو اس طرح کسی نئے خطرہ میں مبتلا ہو جانیکا اندیشہ تھا۔ اس مشکل کو میں نے نہایت عُمدگی سے حل کیا۔ مجھے ایک موہوم سی یاد آئی اور لالہ صاحب کو پُورا علم تھا۔ کہ ٹل سے پاراچنار تک برابر پختہ سڑک شاہی چلی گئی ہے جس کی لمبائی قریباً ۶۰ میل ہے۔ میں نے سوچا کہ بجائے ٹل یا پاراچنار کی سمت اختیار کرنے کے اگر اس سڑک کے عین وسط کی طرف رخ کیا جائے تو پندرہ بیس میل کا بُعد بھی اگر منزلِ مقصود سے ہو جائے۔ تب بھی اسی سڑک کے کسی نہ کسی مقام پر پہنچ جائیں گے۔ اس لئے میں نے قرار دیا کہ سڑک کے درمیانی حصہ کی سمت اختیار کرینگے۔ اس عقدہ کے اس طرح کے حل سے طبیعت کو بہت فرحت حاصل ہوئی۔

سمت مقرر کر لینے کے بعد ایک مرحلہ یہ بھی تھا۔ کہ رات کے اندھیرے میں اس سمت کو قائم کس طرح رکھا جائے گا۔ اس کے لئے میں نے ہیئتِ فلکی کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ بیتابی میں بیدار رہ کر رات گذار دینے کو اختر شماری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی راتیں حقیقی اختر شماری میں گذار دیتا۔ اور اجرام فلکی کی ترتیب کو اس حد تک ذہن نشین کر لیا۔ کہ آج تک بھی آنکھیں بند کر کے ازبر کردہ صفحہ کی طرح بڑے بڑے ستاروں کی پوزیشن کو دیکھ سکتا ہوں

زچشمانم بپرس اوضاع گردوں

کہ یکدم خواب در چشمم نگشت است

اور ساری ساری رات کی بیداری میں اجرام کی مختلف اوقات کی گردش کو بھی اچھی طرح دل پر نقش کر لیا چنانچہ مجھے یقین ہوگیا کہ ابر آلود آسمان میں بھی اس کے کسی حصہ کو دیکھ کر رات کیوقت مجھے سمت اور وقت کا اندازہ لگانے میں دقت نہ ہوگی۔ علاوہ اس کے دن کے وقت سورج کے سایہ کا تخمینہ اور اس سے مشرق و مغرب کی تعیین کا بھی خوب مطالعہ کیا۔ غرض اپنی سکیم کے اس مرحلہ کی طرف سے بھی میں مطمئن ہوگیا۔

ہماری رہائی کی سکیم کے کئی پہلو تھے۔ یا یوں کہیئے کہ کئی سکیمیں ہمارے زیر غور تھیں۔ مثلاً (۱) گاؤں کے کسی فرد سے اس قسم کے تعلقات پیدا کرنا جس سے اندرونی طور پر وہ ہمیں مدد دے کر نکال سکے۔ (۲) زنجیریں کھول کر کوئی موقع بھاگ نکلنے کا پیدا کرنا۔ (۳) کوئی ایسی صورت پیدا کرنا جس سے ہم ان لوگوں کی مدد فدیہ کی ادائیگی میں سہولت پیدا کرنے کے لئے حاصل کر سکیں (۴) جب تک ہمیں رہائی حاصل نہ ہو۔ اس وقت تک ایسے حالات پیدا کئے رکھنا جن میں ہم ان کی ایذا رسانی سے محفوظ رہ سکیں۔

(۱) واقعات کا جو مرقع اس وقت تک ناظرین کرام کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس گاؤں میں صرف تین ہستیاں ایسی تھیں جن سے کچھ رحم کی امید ہم کو ہو سکتی تھی۔ نیک نامے۔ مدے اور خواتڑے۔

اوّل۔ نیک نامے۔ اس نیک بخت کی ہمدردی اور غمخواری کی یاد اسوقت تک بھی میری آنکھوں کو پُر آب کر دیتی ہے۔ اس کی مہربانیوں کا بیان کئی موقعہ پر پہلے آچکا ہے۔ یہاں پر میں اس فرشتہ سیرت کے شکریہ کے طور پر تھوڑا سا مزید

ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر ان خونخواروں کے چہرے دیکھنے سے جو ہیبت اور وحشت میرے دل میں پیدا ہوتی۔ نیک نامے اپنے تبسم ریز تکلم سے ایک حد تک اس کا ازالہ کرتی رہتی۔ اس کی یہ طرز تسلی کچھ ایسا انداز اپنے اندر رکھتی تھی۔ جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ گویا میرے دل کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اور جوں جوں میری قید کی میعاد بڑھتی جاتی۔ اس کے ان تسلی دینے والے جذبات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا۔ میری عادات کا مطالعہ کر کے جہاں تک اس غریب کے اپنے اختیار میں تھا۔ مجھے خفیہ اور علانیہ ہر طرح آرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ اس نے اٹھا نہ رکھا تھا۔ مثلاً اسیری کے شروع ایام میں ہمارے مال غنیمت کے روپوں سے اپنی فیروز بختی کی خوشی میں قزاری چاول پکواتے رہے۔ نیک نامے نے یک دو روز میں ہی محسوس کر لیا کہ پٹھانوں کے وحشیانہ طریقہ خورد و نوش کے باعث میں ان کے ساتھ کھانے میں چنداں خوشی محسوس نہیں کرتا۔ اور بغیر سیر ہوئے دست کش ہو جاتا ہوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میرے اس کفران نعمت کو وہ بُرا مناتی لیکن اس کے بجائے وہ ایسا مہمان نوازانہ سلوک کرتی جس سے میں شرمسار ہوتا یعنی وہ قزاریوں کے کھانے سے پہلے مجھے کھانے کے لئے اصرار کرتی۔ میں انکار کرتا۔ کہ یہ نہایت نامناسب ہے لیکن وہ کچھ ایسی محبت بھری عاجزی اور قسموں سے مصر ہوتی کہ میں مجبور ہو جاتا۔ کھانے کے بعد وہ روٹی کے کچھ ٹکڑے مجھے دکھا کر چھپر میں رکھ دیتی اور کہتی تم تھوڑا کھاتے ہو اس لئے تمہیں ضرور بھوک لگتی ہو گی۔ یہ ٹکڑے میں اکثر دوسرے قیدیوں میں تقسیم کر دیا کرتا۔ اوائل میں صبح خاصی سردی ہوتی۔ وہ

نیک دل میرا کاٹھ کھلنے سے بہت پہلے اٹھ کر التزام سے آگ جلاتی اور میرے وضو کے لئے پانی گرم کر دیتی۔ مجھے استعمال کے لئے کپڑے کی ایک بوسیدہ چادر ملی ہوئی تھی۔ وہ تار عنکبوت سے زیادہ بودی تھی۔ اور اپنے ہی بوجھ سے پھٹ جاتی۔ ہر دوسرے تیسرے روز وہ لے کر اس کو ٹانک دیتی۔ فواریوں کی جوئیں میرے کپڑوں میں بھی گھس آتیں وہ رحمدل انہیں نکالتی رہتی۔ اور میرا تو خیال ہے۔ کہ اس نے پہلی نظر مجھے دیکھتے ہی مجھ پر مہربان رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور۔ روز بروز وہ اس فیصلہ کو سرگرمی سے نبھاتی۔ مجھے خوش رکھنے کے لئے اگرچہ وہ میرے سامنے چہرہ پر بشاشت اور مسکراہٹ پیدا رکھتی لیکن کئی دفعہ میری مصیبت کے تاثر سے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔ اور مجھے زنجیر پہناتے وقت تو جیسا کہ ذکر آ چکا ہے۔ اس نے کمال ہی کر دکھایا۔ لالہ سندر لال سے اس کو نفرت تھی۔ اور جب اپنے چہرے پر آنے سے روکنے کے لئے ان کو ملامت کرتی۔ تو اس وقت اس کا قدرتی سُرخ چہرہ غصّہ کی مزید لالی کیوجہ سے اور بھی بھلا معلوم ہوتا۔ وہ اس وقت غصّہ کے انداز اور اپنے الفاظ سے گویا اس تفاوتِ مراتب کا عملی اظہار کرتی۔ جو میرے اور لالہ جی کے درمیان اسکے دل میں تھا۔ اور مجھ پر واضح کرتی کہ میرے ساتھ اس کی مہربانی کا سلوک صرف ایک قیدی ہونے کے حیثیت سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ہمدردی اس سے زیادہ گہری ہے پس اگر بھاگنے میں مدد کی توقع کسی پر ہو سکتی تھی تو سب سے زیادہ اس پاک محبت رکھنے والی پر ہو سکتی تھی۔

لیکن اہم ترین سوال یہ تھا۔ کہ اگر کوئی آمادہ ہو بھی جائے تو کس قسم کی مدد

کا سوال اس سے کیا جائے مشکل ترین مسئلہ ہماری زنجیروں کا کھولنا تھا۔
جس کے لیئے اوزار چاہیئیں۔ وقت چاہیئے اور خلوت چاہیئے۔ اور پھر زنجیروں
کے کھُلتے ہی بھاگ نکلنے کا موقع چاہیئے۔ اور موقع بھی ایسا چاہیئے جس سے
ہماری مدد کرنے والے پر کسی کو شبہ نہ ہو۔ ورنہ اس کا سینہ ہوگا اور گولیوں کی بوچھاڑ
کیا یہ حالات پیدا ہو سکتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ تو میں کس امید پر اس
معاملہ میں کسی سے ساز باز کرنے کی کوشش کرتا سو جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا
ہوں "بھاگنے کی وہی سکیم کامیاب اور کم خطرناک ہو سکتی تھی جس میں فراریوں
کے کسی فردِ واحد سے استمداد کا جزو نہ ہو"۔ بایں ہمہ میں نیک نامے سے اپنے
وطن کا عیش و آرام۔ ریل کے سفر کی دلچسپیاں میدانوں کی وسعت میں سڑکوں
کا جال۔ عالی شان عمارتوں کے منظر۔ شہروں کی دلکش زندگی اور تنعم۔ بوقلمون
کھانوں کی لذات بڑے دلفریب پیرائے میں بیان کرتا رہتا۔ اور کبھی کبھی یہانتک
بھی کہہ دیتا کہ رہا ہو کر میں تم کو ضرور اپنے ہمراہ سیر کے لیئے لے چلوں گا۔ اس
توقع پر کہ شاید میری مدد کرنے کی سلسلۂ جنبانی اس کی طرف سے ان الفاظ کے
ساتھ شروع ہو" کہ بابو مجھے جلدی لے چلو"۔ سکیم کے پہلو نمبر ۱ کا تو یہ حال تھا۔
اب ۲ کو لیجئے۔ اس پہلو پر جتنا میں غور کرتا اتنا ہی مشکل نظر آتا لیکن بایں ہمہ
بھی ایک صورت ہمارے بچاؤ کی تھی۔ اور اس باب میں اسی سکیم کے متعلق ذرا
تفصیل سے ذکر آئے گا۔

۳ کا خیال کرنے سے یہ ایک لغو سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے
اس پر بھی کافی توجہ دی۔ تلورام کا زرِ فدیہ ضد کی وجہ سے انہوں نے بڑھا کر

ایک ہزار کر دیا تھا۔ لیکن تو کے چند ملک اس کے فدیہ کی ضمانت چھ سو روپے تک دینے کو تیار تھے۔ میں نے لالہ صاحب سے مشورہ کر کے تورام سے دریافت کیا کہ آیا تم اپنے فدیہ کی مطلوبہ رقم ادا کرنے کے قابل ہو یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میرا والد آسانی سے ادا کر سکتا ہے لیکن ہم لوگوں میں روپیہ کی اتنی محبت ہوتی ہے۔ کہ میری فرقت کی نسبت روپیہ کی جدائی اس پر زیادہ شاق ہے۔ میری مصیبتوں کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ گیا۔ اور پھر جا کر کہلا بھیجا۔ کہ میری طرف سے اجازت ہے۔ خواہ قتل کر دو خواہ چھوڑ دو۔ تلورام سے یہ معلوم کر لینے کے بعد ہم نے عملداد کے کان میں پھونکا کہ تلورام کا تم نو سو روپیہ مانگتے ہو چھ سو روپے کی ضمانت وہ خود دیتا ہے۔ باقی روپے کا بندوبست وہ جا کر کر سکتا ہے۔ اگر تم لوگوں کو یقین ہے۔ کہ ہمارا فدیہ سرکار انگریزی دے گی۔ تو ہم اس کی ضمانت دیتے ہیں۔ کہ اس کا بقایا ہم ادا کر دیں گے۔ دوسرے ہمارے لواحقوں کو یہاں پہنچنے یا پیغاموں کے آنے جانے میں بھی کافی خرچ اٹھ جائے گا۔ اور یہ شخص جا کر مفت ہمارے لئے کوشش کرنے کو تیار ہو گا۔ اور جب تک ہم اس کا روپیہ ادا نہ کریں ہم دونوں میں سے ایک آپ کے پاس رہے۔ عملداد نے کہا میں اس پر غور کروں گا۔ چنانچہ اس نے دوسرے ہمراہیوں سے اس کا ذکر کیا۔ اور یہ خبر وسیم گل وغیرہ تک پہنچی۔ وسیم گل نے ہم سے پوچھا۔ کہ جو روپیہ تم اس کی ضمانت میں دو گے۔ اپنے فدیہ میں زیادہ کر کے ہمیں کیوں نہ دے دو۔ اسے ہم نے بہت اچھی طرح سمجھایا۔ کہ ابھی تک ہمارا اصلی غم کھانے والا کوئی نہیں۔ تلورام کی تھوڑی سی ضمانت ہے جس کے برابر رقم ہمارے اقارب کے آنے جانے

میں خرچ ہو جائے گی۔ اور یہ جا کر مفت سارا کام کرے گا۔ اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ بلکہ تمہارا فائدہ ہے۔ جو کام دو ماہ میں ہونے والا ہے یہ دس دن میں کر دے گا۔ چنانچہ اس کے متعلق فراریوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ اور یہ امر زیر غور ہی تھا کہ بیچارے تلو رام کی قسمت نے یاوری کی اور وہ رہا ہو گیا۔

مئی کی بائیسویں یا تیئیسویں رات کو جب ملا پیوندا کا قاصد ہمارے فراریوں کو لے گیا۔ تو چند وزیر فراری نہ گئے تھے لیکن ذوڑ قوم کے سب افراد چلے گئے تھے۔ یہ دن ہمارے لئے نہایت غنیمت تھا۔ اور ہم نہایت جوش سے آج کے دن بھاگنے کی تدابیر میں کوشاں رہے۔ اپنی زنجیروں کو کھول کر ایک دفعہ پھر آزمایا۔ اور تمام دن جوشیلے خیالات میں کاٹ دیا۔

ہمارے بھاگنے کی تجاویز میں دو اہم رکاوٹیں اور بھی تھیں ایک تو وہاں کے خونخوار کتے۔ اور دوسرا ختونے کی حریص ماں۔ کتوں کا یہ حال تھا۔ کہ ذراسی آہٹ پا کر ایک کتا بھونکنا شروع کرتا۔ اور آناً فاناً سارے گاؤں کے کتے اس کے شریکِ حال ہو جاتے۔ اور آدھ آدھ گھنٹہ تک وہ طوفان بے تمیزی برپا رکھتے کہ الاماں۔ لیکن جب خاموش ہوتے تو یکدم ایسا سناٹا چھا جاتا گویا شہر خاموشاں بن گیا۔ بعض کتے بڑے قد آور "گدی نسل" کے تھے۔ میں ان کو مانوس کرنے کے لئے نیچے کھچے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے کھلاتا۔ اور موقع پا کر ان سے محبت کرتا۔ وسیم گل اس حد تک محتاط تھا کہ ایک دفعہ روٹی کھاتے نیک نامے نے مجھے کہا کہ کتے کو ٹکڑا ڈال دو۔ وسیم گل نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جھڑک کر بولا کہ تم نے آئندہ کبھی کتے کو کوئی چیز کھانے کو نہ دینا۔ غرض کتوں کو مانوس

کرنے کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنا ضروری تھا کہ بھاگنے کے وقت کُتوں کا مشاعرہ نہ ہو رہا ہو۔ باقی رہا خوتے نے کی ماں کا سوال سو وہ ایک بلائے بے درماں اور مرضِ لاعلاج تھی۔ رات کو وہ ہماری طرف منہ کر کے لیٹتی۔ دونوں ہاتھ چہرہ کے، دائیں بائیں اس طرح رکھ لیتی جیسا دور سے کسی چہرہ کو دیکھنے کے لئے بعض دفعہ انسان (گھوڑے کی کنپٹیوں کی طرح) رکھ لیتا ہے۔ اور ساری رات اسی کروٹ اور اسی پوزیشن میں پڑی رہتی۔ اور اگر کوئی غیر معمولی حرکت مجھ سے رات کو سرزد ہوتی۔ تو صبح اس کا ذکر کرتی پس اس کا علاج سوائے اس دعا کے میرے پاس نہیں تھا۔ کہ خدایا ہمارے بھاگنے کی رات اسے بڑے آرام کی میٹھی نیند سُلا دینا۔

جب سے بھاگنے کا خیال میرے دل میں سمایا تھا۔ زادِ راہ کے لئے برابر روٹی کے ٹکڑے میری بنیان کے اندر چھپ چھپیں۔ ونتک چھپے رہے۔ گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے بنیان ان کے کہنے پر میں نے اتار دی۔ اور ٹکڑے لالہ صاحب کے چارج میں دیدئے۔ لالہ صاحب اتنے ٹکڑے دیکھ کر حیران ہوئے۔ کہ کس طرح بنیان میں چھپے رہے۔ انہوں نے ان سوکھے ٹکڑوں کو خوتے نے کے چھپر میں دروازے کے اوپر چھپا دیا۔

آج رات چارپائیاں بہت خالی تھیں۔ لالہ صاحب کی اور میری چارپائیاں پاس پاس تھیں۔ ہمارے پاس کوئی مرد نہیں تھا۔ سوتے وقت خوتے نے کی والدہ نے مجھ سے بار بار کہا۔ کہ بابو پستو کا میں گے کپڑے اتار دو۔ لیکن میں نے نہ مانا۔ افسوس لالہ صاحب سب ارادوں پہ خاک ڈالکر کہ ہی

نیند سو گئے ہیں سر اٹھا اٹھا کر خوست نے کی والدہ کو دیکھتا۔ اور اسے سوتا سمجھ کر
لالہ صاحب کے چٹکیاں بھرتا۔ لالہ صاحب نہایت بے پروائی سے میری طرف
دیکھ کر دوسری طرف مُنہ کر لیتے۔ مجھے نہایت غصہ آتا۔ اور جی چاہتا کہ اکیلا نکل
جاؤں۔ حتّیٰ کہ اسی کشمکش میں دن نکل آیا۔ لیکن اس میں بھی خدا کی حکمت ہوئی۔
وہ بدنہاد بڑھیا جاگتی تھی۔ چنانچہ اس نے صبح اٹھ کر مدّے سے ذکر کیا۔ کہ آج
رات بابو کی نیّت صاف نہیں تھی۔ اور بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس پر
لالہ صاحب نے مجھے سرزنش کی۔ کہ دیکھا جلد بازی کا نتیجہ۔ اس لئے دوسرے
روز ہم نے زنجیروں کو پھر اصلی حالت پر کر دیا۔ لیکن اس طرح کہ ضرورت ہو تو کھول
سکیں۔ اور سارا دن دعائیں کرتے رہے کہ آج فراری نہ آئیں۔

یہاں پر ایک ایسی افواہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے ہم بھی اور
فراری بھی پریشان رہتے یعنی لگاتار اطلاعیں آنے لگیں کہ قرم میں ایک جرگہ
(قرم کمشن) بیٹھا ہوا ہے۔ انگریز اور افغان حکام قرم میں جمع ہو کر پیچیدہ مقدمات
کو آپس کی مشاورت سے حل کر رہے ہیں۔ اور اس میں ہمیں مفت چھڑانے
کے لئے بڑا زور دیا جا رہا ہے۔ اور تجویز ہے کہ یہ جرگہ خوست بھی آئے۔ اس
صورت میں فراری کہتے کہ ان کو سرکاری حکم سے نقل مکان کرنا پڑے گا۔ اس
قضیئے سے وہ بہت گھبراتے۔ خاص کر جب حکامِ انگلشیہ کا مفت چھڑانے کے
لئے تقاضا کا ذکر کرتے تو وہ دانت پیسنے لگ جاتے۔

غرض ہماری دعائیں قبول نہ ہوئیں۔ اور کچھ فراری خوست سے واپس آ گئے
اور باقی کے دوسرے روز علے الصباح پہنچے۔ لیکن شاد آمین ان کے بعد شام

کو واپس آیا اس نے بیان کیا کہ کُلاجان رجو کہ ایک بار شوخ فراری تھا۔ اور شاہ غاثی سے بہت رسائی رکھتا تھا، کی معرفت شاہ غاثی نے پیغام بھیجا ہے۔ کہ جرگہ خوست کی طرف براہ تُرم آنے والا ہے۔ میں فراریوں کو ہرگز نکلیف دینا نہیں چاہتا تھا لیکن ان کے یہاں ہونے سے سلطنت کی بدنامی ہے۔ اس لئے بہتر ہے۔ کہ وہ تیار رہیں۔ اور جب میں حکم دوں جھٹ ارد گرد کی پہاڑیوں میں چلے جائیں۔ وہاں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ ضروری سامان ان کے لئے مہیا کر دیا جائے گا۔ مویشیوں کے لئے بھوسہ پہنچا دیا جائے گا۔ ہر قسم کا غلہ اور اشیائے خوردنی بھیج دی جائیں گی۔ اور جب جرگہ گذر جائے گا۔ تو واپس خوست بُلا لیا جائے گا۔ شاد آمین شاہ غاثی کا فراریوں کی طرف عام رعایا کی نسبت زیادہ مائل ہونا خاص لذت سے بیان کرتا رہا۔ اس کی تقریر سے اس کی عنایتوں کے مورد ہونے کا فخر ٹپکتا تھا۔ اور باقی فراری بھی محظوظ ہو رہے تھے۔ سوائے مدّے اور مدّا خیل کے جنہوں نے ابھی تک فصلوں کو نہیں سنبھالا تھا۔

آج ہم وہاں کے ایک ایسے قصہ کا ذکر کرنے لگے ہیں جو نہایت دلگداز اور رقت انگیز ہونے کے لحاظ سے وضعی قصوں سے بھی زیادہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ عملداد تنگ دستی اور افلاس کے ہاتھوں اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا۔ تلورام کے بارہ میں خواشے اور دوسرے حصہ داروں کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ ان کے لحاظ سے اور نیز تلورام کے والد کے مایوس کن پیغامات کے سبب عملداد بہت جھلاّ گیا۔ اور اس نے جھنجلا کر تلورام کی قسمت کا آج ہی یا ہم تمّی فیصلہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ اس نے بڑی سے بڑی قسمیں اٹھائیں کہ میں اس

کا فدیہ اب بارہ سو سے کم کسی طرح نہ لوں گا۔ اس نے اپنی عورت پر طلاق کی قسم کھائی۔ کہ میں اب اسے اس طرح عذاب دے دے کر ماروں گا جس سے دوسرے قیدی عبرت پکڑیں۔ چنانچہ اس نے تلورام کو گاؤں کے درمیان کھڑا کر کے اس کے بدن سے کپڑے اتروا لیئے۔ اور ہیرے والا کاٹھ اس کے کندھے پر رکھوایا۔ اور پابزنجیر دوپہر کی کڑکڑاتی دھوپ میں ایک پہاڑی کیطرف لے گیا۔ ایک تپتے ہوئے بڑے پتھر پر ننگے بدن دھوپ میں لٹا کر اس کو کاٹھ مار دیا۔ اور اس بے کس کو اسی طرح اکیلا تڑپتا چھوڑ کر آپ گاؤں میں آگیا۔ ع

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد

در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

تلورام کو دھوپ میں تڑپتے جب تقریباً تین گھنٹہ کا عرصہ ہو گیا اور دن بھی ڈھل گیا۔ تو بعض فراریوں کے دل جو پہلے سے ہی تلورام کی طرفداری کرتے تھے پسیجے۔ بلکہ آج تو تسیم گل کا رحم بھی حرکت میں آیا۔ اور انہوں نے بیٹھ کر مشورہ کیا کہ عملداد نے اس کو مار دینے کی قسم کھائی ہے۔ جس سے ایک تو رقم ضائع جائے گی۔ دوسرے تلورام بے قصور ہے۔ اس پر یہ عذاب روا نہیں۔ اس لیئے کوئی صورت فیصلہ کی نکالنی چاہیئے۔ اصل میں تلورام ٹوچی کا باشندہ تھا۔ اور ہمارے فراری بھی چونکہ ٹوچی ہی کے تھے۔ اور اس کے والد کو سب جانتے تھے۔ انہیں اپنے ہی علاقہ کے ہندو کے ساتھ یہ ظلم کرتے ہوئے ہمدردی بھی اور شرم بھی آتی تھی۔ آخر مشورہ کے بعد طے پایا۔ کہ تلورام کے فدیہ کی وہی رقم لی جائے جو اس کے والد کے ساتھ مقرر ہوئی تھی۔ یعنی آٹھ سو روپیہ لیکن عملداد

کی قسم قائم رکھنے کے لئے اس کے سامنے بارہ سو کے حساب سے اس کا حصہ پیش کیا جائے۔ اور اس سے درخواست کی جائے کہ وہ آٹھ سو کے حساب سے لے کر باقی رقم واپس کر دے۔ اس طرح اس کی قسم نہ ٹوٹے گی یہ فیصلہ کر کے انہوں نے خواڑے کو بلایا اور اس کو کہا کہ اگر تمہیں اپنے والد کی لاج رکھنی منظور ہے تو تم دو سو روپیہ کے لئے اس کے ضامن بنو چھ سو روپیہ کی ضمانت توڑچی کے ملک دے گئے ہیں۔ دو سو روپیہ تم وصول کر کے لانے کی مزید ضمانت دو۔ تو ہم تلو رام کو رہائی دلانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ خواڑے نے منظور کیا۔ اور اس کی رائفل کی ضمانت لی گئی۔

حقیقت میں فراریوں نے یہ امر ہم سے پوشیدہ رکھا تھا۔ کہ تلو رام کا باپ سلطنتِ افغانیہ کے ملحقہ علاقہ میں نزدیک ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور چھ سو کی رقم پر فیصلہ کے لئے اس نے ٹوچی کے ملکوں کو روپیہ دے دیا تھا۔ اور انہوں نے اس رقم پر چھوڑنے کے لئے اپنی ضمانت دی ہوئی تھی۔ یہ طے پا جانے کے بعد فراری عملداد کے پاس بطور ایک وفد کے گئے۔ خوڑے نے عملداد کا حقیقی بھائی بھی اس وفد میں شامل تھا۔ اس سے جب فراریوں نے درخواست کی تو بہت سی "نہیں نہیں" کے بعد آخر اس نے منظور کر لی۔

سب کچھ طے ہو چکنے کے بعد یہ وفد تلو رام کو مژدہ سنانے کیلئے پہاڑی کی طرف گیا۔ اس بکیس نے عملداد کی قسمیں اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ اگرچہ دھوپ ڈھل گئی تھی۔ پھر بھی اتنی تپش برداشت کرنے کے بعد اس کے حواس بجا نہ تھے۔ عملداد کی معیت میں فراریوں کو آتے دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ کہ

خدا جانے اب اور کیا عذاب تجویز ہوا ہے۔ فراریوں کی زبان سے مژدہ رہائی سن کر قریب تھا کہ اسے شادی مرگ ہو جائے۔ گویا پھانسی کے تختہ سے اُسے اتار لیا گیا۔

اس قید میں اس نے نہایت سخت تکالیف برداشت کی تھیں۔ اس کا سارا جسم سوجا ہوا تھا۔ جس کے باعث وہ قدرے پُرگوشت نظر آتا۔ ورنہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ کاٹھ اس کے پاؤں سے علیحدہ کیا گیا۔ اور نالا کیتو میں اسے نہلانے کے لئے لے گئے۔ اس کی زنجیریں کھولنے کے لئے بہت سے فراریوں نے کوشش کی آخر بڑی دشواری سے توتے نے ان کو اتار اتلورام کو نہلایا گیا۔ ایک پٹھانی نے اس کے لئے بہت سے گھی میں روٹی کو ٹکڑے کر کے ڈالا۔ تلورام نے نہایت شوق سے کھایا۔ اس کی رہائی سے ہمارے دل نہایت خوش ہوئے۔ آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ گویا ہمارا ایک بھائی رنج و محن سے چھوٹ گیا۔ اس کی رہائی پر ہماری بہت سی امیدوں کا مدار تھا۔ اس کی وفاداری اور استقلال سے ہماری بیشمار توقعات وابستہ تھیں اس نے وعدہ کیا۔ کہ جہاں تک ہو سکے گا۔ وہ جلدی ہماری خبر لے گا۔

چند خطوط پہلے ہی سے فارسی میں اپنے متعلقین کی جانب لکھ رکھے تھے اس کے حوالے کئے۔ اور زبانی بہت سے پیغامات دیئے لیکن جیسا کہ ابھی ذکر آئے گا ہم نے پولیٹیکل محکمہ کو کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ لالہ صاحب نے ایک خط پوشیدہ لکھوا کر اسے علیحدگی میں دیا۔ اور تلورام کو نشیب و فراز سمجھاتے رہے اس سے التجا کی کہ اپنا داغدار جسم ہمارے پسماندوں کو برہنہ کر کے دکھانا اور کہنا

کہ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ رِقّت قلبی سے آنسو ٹپاٹپ ہمارے چہرہ پہ جاری تھے۔ آخری دفعہ اسے گلے لگا کر ہم نے الوداع کیا۔ اور کہا کہ اے رنج و مصیبت دیکھے ہوئے۔ آزاد ہو کر اپنی مصیبت کے ساتھیوں کو بھلا نہ دینا۔ اس کے بعد چند فراریوں کی معیت میں شام کے قریب لالہ تلورام ہم سے رخصت ہو گئے۔

دوسرے روز عصر کے قریب مجھ سے کہا گیا کہ تمہارے بھائی کا خط آیا ہے ایک آدمی لیئے مجمع میں بیٹھا ہے۔ چنانچہ میں دیوانہ وار یہ پڑھتا ہوا مجمع کیجانب گیا۔

مرحبا طائرِ فرخ رُخ فرخندہ پیام

خیر مقدم۔ چہ خبر یار کجا راہ کدام

وہاں جاکر دو اجنبی شکلیں مجھے نظر آئیں۔ ایک سفید پوش مہذب خوش باش چہرہ والا جوان تھا۔ دوسرا پست قد معمولی افغانی شکل و شباہت کا مرد تھا۔ میں نے اس سفید پوش کو بزرگ سمجھا۔ اور نہایت عقیدت سے اس سے مصافحہ کیا۔ اور دو زانو مؤدب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حسب عادت زنجیروں کو پھیلا کر اس کے سامنے کیا۔ گویا زبان حال سے رحم کی التجا کر رہا ہوں۔ اس نوجوان نے نہایت آزادی سے گفتگو کی اور فراریوں کو سمجھایا کہ یہ مسلمان ہے اسے ہرگز صوم و صلوٰۃ کی تکلیف نہ دینا۔ اور عزت سے رکھنا۔ البتہ اس کی زنجیریں بہت کمزور ہیں۔ اِدھر اُدھر ہو کر اس نے کوشش کی تو توڑ لے گا احتیاط اچھی چیز ہے یہ زنجیریں تبدیل کر دو۔ آہ میں کیا سمجھا تھا اور کیا پیش آیا۔

ہر بلائے کز آسماں آید	گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پرسد	خانۂ انوری کجا باشد

اس کی اس ہدایت سے میرا دل کانپ گیا اور میں نے پاؤں سمیٹ لئے۔ بعد ازاں میں نے اپنے خط کی بابت دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہی پہلا خط جو مجھے پہنچ چکا ہے۔ یہ دوسرا آدمی لایا تھا۔ اور اس کی بابت دریافت کرتا ہے۔ کہ آیا پہنچ گیا ہے۔ یا نہیں۔ اس اجنبی قاصد نے کسی قسم کا غیر معمولی میلان قصداً میری طرف ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ میرے بھائی سے میرے چھڑانے کے واسطے وعدے کر کے آیا تھا۔ اس نووارد نے بیان کیا۔ کہ میں بتوں کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر تمہیں اپنے بھائی کے نام کوئی خط لکھنا ہو تو لکھ دو میں نے کہا کہ ایک قیدی کے ہاتھ ابھی کل پرسوں مفصل حالات تحریر کئے ہیں۔ لمبے مضمون کی کیا ضرورت ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی حالت کی ایک پر الم تصویر لفظوں میں کھینچی۔ میرا زیادہ زور اسی بات پر تھا۔ کہ ایک دفعہ مجھ سے ملنے کی کوشش کریں۔ اور جتنا ہو سکے روپیہ لاکر فراریوں کے سامنے رکھیں شاید روپیہ کی چمک دیکھ کر یہ رضامند ہو جائیں۔ قاصد سے میں نہایت الفت کے ساتھ بغلگیر ہوا۔ اور اس کے ہاتھوں پر بوسہ دے کر کہا۔ کہ اسی طرح میرے بھائی کے ہاتھوں پر بوسہ دینا۔ اور اسی بغل میں جاکر انہیں میری طرف سے دبانا۔ میرا حال زار جس طرح دیکھتے ہو ان سے عرض کرنا۔ لو خدا حافظ۔ قاصد چلا گیا۔ اور میں دیر تک ٹکٹکی باندھے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔

گلاجان مذکورہ صدر۔ ایک معتبر فراری تھا۔ جس کا رسوخ شاہ غاقی تک تھا۔ اور ایک معزز رئیس لالہ پیر[1] کا مصاحب تھا۔ جو فراریوں کا ایک قسم کا پیر سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی شرافت اور نیک نیتی کے فراری معتقد تھے۔ دا گرچہ بعض فراری

---

[1] یہ وہی مشہور و معروف ہستی ہے جو امیر امان اللہ کے عہد میں بغاوت خوست میں بہت نمایاں حصہ لیتے تھے۔

اسے بھی دغاباز کہتے تھے)۔ اس لالہ پیر کا شاہ غاقی پر بڑا اثر تھا۔ افغانستان میں بڑے بڑے روسا اور ملک حکام کی خوشنودی کے لئے سرکاری کام بغیر معاوضہ کے انجام دیتے ہیں۔ لالہ پیر بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ بہت سے پیغامات فراریوں کے شاہ غاقی کی طرف سے لالہ پیر کی معرفت پہنچتے تھے۔

رات کو گلا جان کی بہت آؤ بھگت کی گئی۔ بہت سے فراریوں کا مجمع بڑی دیر تک اس کے گرد جمع رہا۔ معلم کے پاس بندوق نہیں تھی۔ گلا جان کے پاس ایک زائد بندوق تھی جس کا سودا معلم کرنا چاہتا تھا۔ بہت دیر تک اس پر گفتگو ہوتی رہی۔ میر افدیہ پہنچ جانا یقینی سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ سودا اُدھار پر ہوتا تھا۔ لیکن گلا جان ایک کار آزمودہ گرگ تھا۔ اس نے کہا۔ کہ تمہارے پاس دو قیدی ہیں۔ کیا معلوم دونوں بھاگ جائیں یا مر جائیں۔ یا شاید مفت چھوٹ جائیں۔ پھر میں کس کو پکڑوں گا۔ باقی فراری ان خیالات کو محالات سے تصور کرتے اور کہتے کیا اتنا غضب ہو جائے گا۔ کہ دونوں میں سے ایک کا روپیہ بھی ہمیں نہ پہنچے گا۔ خیر اخیر میں یہ قرار پایا۔ کہ معلم خوست چل کر بندوق کو دیکھے۔ اور قیمت کا فیصلہ کیا جائے۔ اس کے بعد گلا جان نے اپنے آنے کا مقصد یوں بیان کیا۔ کہ ملا پیوندا کے بلاوے تم خوست گئے۔ تم نے بڑی ہمت اور دلیری کا ثبوت دیا۔ کہ اتنی جلدی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اتفاق سے وہ پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ اور لالہ پیر کو بھی ان کے ہمرکاب جانا پڑا۔ تم لالہ پیر کی غیر حاضری میں وہاں پہنچے اور وہ تمہارے مراسم مہمان نوازی بجا نہ لا سکا۔ اب اس نے مجھے بھیجا ہے۔ کہ میں پھر آپ لوگوں کو ان کے پاس لیجاؤں۔ تاکہ وہ فوت شدہ حقوق کو پورا کریں

پھر شاہ غاقی اور جرگہ یعنی قوم کمشن کی بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ چاند رات کی آج غالباً انیسویں یعنی مئی کی اٹھائیسویں تھی۔ ہمارے گرد چارپائیوں کا حلقہ باندھ دیا گیا۔ اور درمیان میں مرکز بن کر ہم لیٹ گئے۔ دن کے واقعات کی وجہ سے آج رات غیر معمولی تپش میرے دل کو مضطرب کر رہی تھی۔ میں نے وسیم گل سے کہا۔ ع

کہ امشب دل بصحرا میل دارد

جنونے دارد و صد خیل دارد

مجھ پر آج وحشت و جنون کا اثر ہے۔ اور میں شاید ساری رات بیداری اور اختر شماری میں گذار دوں گا۔ اور تمہارے دل میں خواہ مخواہ شک پیدا ہو گا۔ کہ بھاگنا چاہتا ہے۔ بہتر ہے تم مجھے کاٹھ لگا دو۔ تاکہ تمہیں تسلی رہے۔ چنانچہ وہ میرے لئے کاٹھ منگوانے لگا۔ کلا جان نے اسے میری نیک نیتی پر محمول کیا۔ اور کہا کہ بے فکر رہو۔ میں ساری رات جاگتا رہوں گا۔ زنجیروں پر کاٹھ کی کوئی حاجت نہیں۔ لالہ صاحب ایک چٹائی پر پڑے تھے۔ جس میں بیشمار پسو تھے اُن کے جسم پر پسوؤں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن میرے لئے وہ سخت تکلیف کا باعث تھے۔ زمین آج کچھ غیر معمولی تپی ہوئی تھی۔ میں بڑی دیر تک کروٹیں لیتا رہا۔ دل کی بیقراری سے مجھے سخت تشنگی معلوم ہوئی۔ میں نے خوستے کو بلایا۔ اور اس نے مجھے پانی پینے کی اجازت دی۔ پانی کی ٹھلیا پاس رکھی تھی۔ لیکن پانی تلے کا تھا میں نے برتن کو رکھ دیا۔ تاکہ مٹی نیچے بیٹھ جائے۔ اور کچھ پانی ہاتھوں سے اپنے جسم پر ملا۔ تاکہ پسوؤں کے کاٹنے کی جلن کو تسکین ہو۔ اس میں کچھ وقت صرف ہو گیا۔ خوستے نے مجھے آواز دی کہ بابو تم بیٹھے کیوں رہے ہو سوتے کیوں نہیں؟

چنانچہ میں نے پانی کے دو گھونٹ پیئے اور لیٹ رہا۔

صبح اٹھ کر وسیم گل بلا کی طرح چمٹا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ کہ تم رات بھاگنا چاہتے تھے۔ اور میں نے بھی ہاتھ بندوق کی لبلبی پر رکھ لیا تھا۔ کہ ایک قدم تم نے لیا۔ اور میں نے گولی چھوڑی۔ میں نے خوستے کو گواہی میں پیش کیا۔ کہ میں نے تو اس کو جگا کر پانی پیا تھا۔ خو نے کہنے لگا کہ نہیں میں پھر سو گیا تھا۔ تم اتنی دیر بیٹھے کیا کرتے رہے۔ گلاجان نے میری کچھ طرفداری کرنی چاہی۔ لیکن وسیم گل نے کہا کہ ہم بڑھیا سے سن چکے ہیں۔ کہ ہماری غیر حاضری میں بھی یہ نکلنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اچھا کل اس کا علاج کر لیا جائے گا۔

صبح کے آٹھ بجے کے قریب گلاجان ہم سے رخصت ہوا۔ اس سے پوشیدہ گفتگو کرنے کی مجھے اجازت مل گئی۔ میں نے اپنی بیقراری اور بے بسی کی دردناک تصویر کھینچی اور اس کے دل کو نرم کرنا چاہا۔ اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا۔ کہ وہ جو کچھ میری مدد کر سکتا ہے۔ کرے گا۔ اور ایک ہفتہ کے بعد پھر ملنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس کی ہر بات سے پرلے درجہ کی دغابازی اور چالاکی ٹپکتی تھی۔ اور اس کی مبالغہ آمیز تشفی دہ باتیں تہ دل سے نہیں نکلتی تھیں۔ میرے ساتھ مصافحہ کر کے رخصت ہوا۔ چند فراری تھوڑی دور تک چھوڑنے کے لئے اس کے ہمراہ گئے۔

جس روز فراری لوگ خوست چلے گئے تھے۔ لالہ صاحب نے میرے ساتھ مشورہ کر کے اپنا ریشمی ازار بند خوستے کی والدہ کو دیدیا۔ کیونکہ جس شخص کی نظر اس ازار بند پر پڑتی حیرانی سے پوچھتا۔ کہ کیا ریشمی ہے؟ خوستے کی والدہ نے

ایک پُرانا ازار بند جو کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ لالہ صاحب کو دیدیا۔ لالہ صاحب کے اس کام نے خوت نے اور اس کی والدہ کو ان پر بہت مہربان کر دیا۔ لیکن یہ بات دوسرے حصہ داروں کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کو بہت بُرا سمجھا۔ میرے بُوٹوں پر تخلم نے قبضہ کر رکھا تھا۔ لنگی پر وسیم گل دانت پیس رہا تھا۔ مجھے بھی خیال ہوا۔ کہ یہ میری رشوت دہی پر محمول نہ ہو۔ بہتر ہے تصفیہ ہو جائے۔ چنانچہ رات کو بیٹھ کر میں نے سب کے روبرو کہا۔ کہ آج کل میری بنیان۔ کوٹ اور بوٹ فالتو ہو گئے ہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ تم سب حصہ دار ہو۔ بہتر ہے کہ ان کی تقسیم آپس میں کر لو۔ البتہ لنگی چونکہ میرے سر کی چیز ہے۔ وہ میں دینا نہیں چاہتا۔ اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔ یہ الفاظ کچھ نہایت حسرت آمیز لہجہ میں کہے گئے۔ مدّے نے جواب دیا کہ بالوہم نے ایک ہندو کو پکڑا تھا جس نے ایک سونے کا زیور پہن رکھا تھا۔ اور چونکہ ہم نے پکڑتے ہی اس سے چھین نہ لیا۔ اس لئے اسے ہم نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ تمہارے کپڑے تمہیں مبارک رہیں۔ ہمارے لئے قابلِ شرم ہے۔ کہ اب تمہارے جسم سے ہم انہیں آتاریں۔ مدّے کی یہ مختصر سی تقریر سُن کر دوسرے اس سے اختلاف کرتے شرماتے تھے۔ اس لئے سب خاموش رہے۔ اصل میں تو دوسرے چمڑہ اتار کر بھی بس نہ کرتے۔ صرف ان کو خیال یہ تھا کہ چُپکے سے کسی چیز پر قبضہ کر لینے سے آپس میں جھگڑا پیدا ہو جائے گا۔ اور کُھلے طور پر تقسیم کرنے میں مدّے حائل ہو گا۔ مدّے نے مجھ سے علیحدگی میں کہا کہ مجھے معلوم ہے۔ وسیم گل تم سے لنگی لینا چاہتا ہے۔ بہتر ہے نیک نامے سے لنگی لے کر اپنے سر پر رکھو۔ اگر پھر وہ تم سے مانگے تو میں اس بے غیرت سے

سمجھ لوں گا۔

کل رات کے واقعہ کی سزا میں یا مزید احتیاط کے لئے آج رات وسیم گل نے تجویز کی۔ کہ مجھے رات کو کاٹھ مارا جائے۔ میری صورت حسرت و سوز کا ایسا مرقع پیش کرتی تھی۔ جس نے بہت دلوں کو مسخر کر رکھا تھا۔ بہت سے لوگ میرے ساتھ سچی ہمدردی کرنے لگے تھے۔ ابھی تک اس قید بے بسی میں بھی کسی کو جرات نہ ہوئی کہ میرے لئے بے عزتی کے الفاظ استعمال کرے۔ ان لوگوں میں میں قدآور تھا۔ اور وہ مجھے وجیہ نوجوان سمجھتے تھے معلم نے مذاق میں کئی دفعہ کہا۔ کہ اگر تم بھی فراری ہوتے۔ تو ہم تمہیں سنہری کمربند پہنا کر کندھے پر رائفل لگا کر اپنے آگے بطور سردار رکھتے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں۔ کہ واقعی وہ مجھے ایسا ہی سمجھتے تھے لیکن مذاق میں بھی اکثر وہ عزت کی حد سے دور نہ جاتے تھے۔ مدّے کو میری خاطر داری اتنی منظور تھی۔ کہ پہلے ایام ہی میں جب کہ ریوالور نے دھوکا دیا۔ اور کارتوسوں کے پٹاخے توڑ نہ سکا۔ تو میں نے مدّے کی رائفل کو خاص مقصد کے لئے آزمانا چاہا۔ میں نے اس سے التجا کی۔ کہ وہ مجھے ایک کارتوس چلانے کی اجازت دے۔ اس نے بخوشی منظور کیا۔ چنانچہ بندوق اور کمربند لے آیا۔ پانچ چھ اور فراری بھی جمع ہو گئے۔ ایک سفید پتھر مقرر کیا گیا۔ جس کا نشانہ باندھ کر میں نے فائر کیا۔ میں نے مدّے سے کارتوسوں کی قیمت دریافت کی۔ اس نے کہا یہ انگریزی فوج کے کارتوس ہیں۔ بہت مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک روپے زند رامی فی کارتوس سے کم نہیں ملتے۔ میں نے بڑی معذرت کی کہ مجھے قیمت معلوم نہ تھی۔ ورنہ میں

تمہارا نقصان نہ کرتا۔ اس پر اس نے کہا۔ کہ نہیں جتنے تمہاری مرضی ہے چلاؤ۔

اس عزت و آبرو کی وجہ کچھ ہی ہو۔ خواہ ذاتی میگنا ٹزم (مقناطیسی) خیال کریں جو بعض کے نزدیک انسان سے خارج ہو کر دوسروں کو موثر کرتا ہے یا وہ برکت انوار الٰہیہ تصور فرمائیں۔ جو نہایت خلوص اور تضرع سے صرف ذات پاک پر بھروسہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْءَ ۱ اس آئت کا گہرا اثر میرے قلب پر ہوتا۔ اور ہر حالت اضطراب میں یہ آئت شریفہ بار بار دل کی گہرائیوں سے نکلتی۔ اور مجھے پختہ یقین ہو جاتا۔ کہ ضرور میری دعا مستجاب ہو جائے گی۔ یا اللہ کی اس عنایت کا سبب وہ دعائیں خیال فرمائیں۔ جو ان ملول دلوں سے بصورت نالہ و آہ نکل کر بارگاہ ایزدی کو کھٹکھٹاتی تھیں۔ جو میرے ساتھ بہت مضبوطی سے وابستہ تھے بغرض و تسیم گل نے جب علاوہ زنجیروں کے رات کو کاٹھ لگانے کی نہایت تکلیف دہ تجویز پیش کی تو اس کا ساتھ باستثنائے دو ایک کے کسی نے نہ دیا۔ عملداد نے جواب دیا۔ کہ اگر تم زیادہ احتیاط چاہتے ہو تو رات کو دوسری مضبوط زنجیر اس کے پاؤں کی زنجیر میں ڈال کر اپنی چارپائی کے ساتھ بذریعہ قفل باندھ لیا کریں گے۔ یہ کاٹھ سے بھی زیادہ محتاط طریقہ ہے۔ اس گرگ باراں دیدہ نے جواب دیا۔ کہ احتیاط بہت اچھی چیز ہے۔ میری رائے میں کاٹھ بہتر ہے! آگے جیسے تمہاری مرضی۔ عملداد اٹھا۔ اور ایک زنجیر لے آیا۔ قفل کی تلاش کی گئی۔ لیکن وہ تو میرے پاجامے کے اندر تھا۔ کہاں سے ملتا۔ دل بہت ڈرا۔ کہ کہیں راز نہ کھل جائے۔ لالہ صاحب

---

۱ جس وقت وہ اس کو بلاتا ہے۔ اور وہ تکلیف کو آسان کر دیتا

کو ٹٹولا۔ کہ کیا کریں۔ انہوں نے کہا چپکے ہو رہو۔ قفل سے مایوس ہو کر عملدار نے اپنے ہاتھ سے زنجیر کو وسیم گل کی چارپائی سے ایسا مضبوط باندھا۔ کہ صبح وسیم گل سے کھل نہ سکا۔ اور عملدار کو بلایا۔ عملدار ہنس پڑا۔ اور کہا دیکھا کیا مضبوط طریقہ[1] ہے۔

دوسرے دن صبح (اٹھائیسویں مئی) قدرتاً میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ بہت احتیاط کر رہے ہیں کہیں زنجیروں کا ملاحظہ نہ ہو۔ چنانچہ لالہ صاحب سے مشورہ کر کے میں نے اپنی زنجیروں کو بالکل پہلے کی طرح مضبوط کر دیا۔ لالہ صاحب کی طبیعت بھی گھبرانے لگی۔ کہ کہیں ان کی زنجیروں کا بھی ملاحظہ نہ ہو لیکن میں نے ان کو تسلی دی۔ کہ آپ کی زنجیروں کی ظاہری حالت ایسی پختہ ہے۔ کہ کسی کو شک تک نہیں گذر سکتا۔ یہ حسن اتفاق تھا یا اللہ کی مہربانی۔ کہ زنجیروں کو میں نے ٹھیک کر لیا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہوا۔ کہ ظہر کی نماز کے بعد متکلم کے چھپر کی مشرقی جانب میں فرار ایل کے درمیان بیٹھا ان کو پشتو کے دیوان عبدالرحمن کی غزلیں سنا رہا تھا۔ غزلیں میں نے حسب حال انتخاب کی ہوئی تھیں۔ کئی ایک اشعار ایسے حسب حال تھے کہ ان کے دل پر بھی اثر ہو رہا تھا۔ دو اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

زہ لہ دے دنیا نہ تلونی پہ شتاب یم — لکہ پانڑہ وخزاں پا برکاب یم

ترجمہ:۔ میں اس دنیا سے کوچ کرنے میں جلدی کر رہا ہوں — مانند خزاں زدہ پتے کے میرا پاؤں رکاب میں ہے

دا جہاں قصاب خانہ کڑو خدائے ماتہ — پابستہ ولاڑ پہ خولے وقصاب یم

ترجمہ:۔ یہ جہاں خدا نے میرے لئے قصاب خانہ بنا دیا ہے — پابستہ قصاب کے باڑہ کھڑا ہوں میں

لالہ صاحب ان شعروں پر وجد میں آ کر ان کو بار بار مطلب سمجھاتے۔ ہم پر تو ایک قسم کا محویت کا عالم طاری تھا۔ ادھر خونے کی آنکھیں میری زنجیروں پر لگی ہوئی

[1] چنانچہ یہ طریقہ منظور ہو کر آئندہ کا دستور العمل بن گیا۔

تھیں۔ لالہ صاحب تاڑ گئے۔ اور مجھے سمجھایا۔ کہ تمہاری زنجیروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے تیور بدل رہے ہیں۔ میں نے کتاب بند کر لی اور پاؤں سمیٹ کر چارپائی پر ہو بیٹھا۔ خوستے نے نہایت متانت سے وسیم گل سے کہا۔ کہ تلوآرام والی زنجیر کہاں ہے۔ لے آؤ بابو کو ڈالیں گے۔ وہ زنجیر مدے کے ہاں رکھی تھی۔ وہ گیا اور ہاتھ میں جھنجھناتی ہوئی زنجیر لے آیا۔ اس صدائے سلاسل کا میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ ع

جس کی آواز سے ہوں رونگٹے سوہانکے کھڑے

وہ زمانے نے دیا سلسلۂ پا ہم کو

معلّم اڑنگے کے ہاں سے ایک اوزار لے آیا جس سے میری پرانی زنجیریں اتارنے لگے۔ ان زنجیروں کے اتارنے میں انہیں بہت دقت پیش آئی۔ اور مشکل سے قریب آدھ گھنٹہ کے عرصہ میں یہ آہنی زیور میرے پاؤں سے علیحدہ ہوا۔ جب نئی زنجیر مجھے پہنانے لگے اس وقت وسیم گل نے مجھ سے ایک سوال کیا۔ کہ بابو اگر تم سچے دل سے وعدہ کرو۔ اور قسم کھاؤ۔ کہ تم بھاگو گے نہیں۔ تو ہم تمہیں زنجیریں نہیں ڈالیں گے میں اس سوال کی نوعیت کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے کہا۔ کہ اپنے آپ کو کھلا دیکھ کر خواہ مخواہ میرے جی میں بھاگ نکلنے کا جوش پیدا ہوتا رہیگا اور تم لوگوں کا دل بھی بے چین رہے گا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے مضبوطی سے زنجیر ڈالو۔ تاکہ میرے دل میں بھاگنے کے امکان کا کبھی خیال بھی پیدا نہ ہو۔ اور تمہارے دلوں کو بھی ہر وقت کی احتیاط سے دل جمعی رہے۔ میرے اس جواب سے وسیم گل ضرور دل میں شرمندہ ہوا ہوگا۔ پہلے خوستے نے میرے پاؤں کے گرد لپیٹا رہا۔

لیکن اس خونخوار کے ہاتھ سے جلدی اللہ نے رہائی دی۔ اور معلّم نے اس کے ہاتھ سے لے کر خود زنجیر ڈالنی شروع کی معلّم پھر بھی سادہ مزاج تھا۔ اس نے نیک نیتی سے مجھے پوچھا۔ کہ کتنی کھلی رکھی جائے میں نے اسے سمجھایا۔ کہ اگر تکلیف دینے کے لئے ڈالتے ہو۔ تو جس طرح تمہاری مرضی ہو ڈالو۔ اور اگر احتیاط کے لئے ڈالتے ہو جس میں مجھے بھی آسانی رہے۔ تو ایک تو فاصلہ ذرا لمبا رکھنا جس سے وضو وغیرہ کے لئے مجھے تکلیف نہ ہو۔ اور نماز میں قعدہ کے وقت بآسانی بیٹھ سکوں۔ کیونکہ پہلی زنجیریں اتنی تنگ تھیں۔ کہ قعدہ میں پاؤں کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ دوسرے پنڈلی کے گرد کا حلقہ تنگ ہونے سے زنجیر چلتے وقت گرد نہیں پھرتی تھی۔ اور پنڈلی میں چٹکیاں لیتی تھی۔ مہربانی کر کے ان دو امور کا اگر لحاظ رکھو تو بڑی نوازش ہوگی معلّم نے نیک نیتی سے میرے پاؤں میں کافی فاصلہ رکھا لیکن خوتے نے کے اصرار سے کچھ کم کر دیا۔ اور پنڈلی کے گرد پہلے اتنا کھلا رکھا۔ کہ میں کوشش کرتا تو ایڑی سے اتار لیتا لیکن بے رحم خوتے نے جو کہ بہت ہی محتاط تھا۔ بڑے اصرار سے ان حلقوں کو تنگ کرایا۔ ڈاکخانہ کے لمبے تار کا ایک بنڈل لے آئے۔ اس کو زنجیروں کے حلقوں میں سے نکالنا شروع کیا تار لمبا ہونے کی وجہ سے اس کا سر الٹ کر کنڈلیوں سے نکل جاتا۔ جو کھینچ کر سُشک سے کنڈلیوں کے ساتھ کوٹ دیا جاتا جتنی مضبوطی ان کے وہمی دل کر سکتے تھے۔ کی گئی۔ چنانچہ معلّم نے فخریہ لہجہ میں فرمایا۔ کہ اب اگر بابو بھاگ گیا۔ تو اس کی قسمت کی یاوری ہے

زنجیر کی اس پختگی کو دیکھ کر میرا دل بالکل مایوس ہو گیا۔ کیونکہ اب زنجیر کھول کر بھاگنا

ناممکن نظر آنے لگا۔ گویا جد و جہد کا خاتمہ ہو کر صبر و سکون کا دَور شروع ہو گیا۔

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

جب زنجیر اتار چکے تو ایک موقع مجھے ملا جس کا میں نے پُورا فائدہ اٹھایا میری پہلی زنجیر کو انھوں نے بغور دیکھا۔ اور کوئی نشان پتھر سے کوٹنے یا توڑنے کا انہیں نہ ملا۔ اس کو میں نے اپنی صاف دلی کا نتیجہ بتایا۔ بڑے زور سے کہا۔ کہ مجھے علیحدہ بیٹھنے اور اِدھر اُدھر ہونے کا بہت موقع ملتا رہا ہے۔ اگر کچھ بھی میرے دل میں بے ایمانی ہوتی تو میں ضرور کوشش کرتا۔ بیشک اچھی طرح دیکھ بھال کر لو۔ اور خود دل میں کہتا۔ ؎

بڑے صاف باطن بڑے نیک طینت
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

چنانچہ اس واقعہ اور میری تقریر سے میری صاف دلی کا ان پر زیادہ نقش ہوا۔

قدرت کا قاعدہ ہے کہ سوتے وقت انسان کا دماغ خواب کی صورت میں اسی کے خیالوں کو متشکل کر کے اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ گویا نیند میں خواب کے پردے پر جو فلم دکھایا جاتا ہے وہ خود اسی کا اپنا تیار کردہ ہوتا ہے۔ اور اس میں جیبٹ ایکٹر بھی وہ خود ہی ہوتا ہے لیکن اکثر خواب تو نیند کی مدہوشیوں میں ہی کھو کر رہ جاتے ہیں۔ اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تاثیر کے لحاظ سے زندہ رہتے ہیں۔ اسی اصول پر ضروری تھا کہ مصیبت کے ان ایام میں رات کو تھوڑا بہت جو میں سوتا تھا۔ اپنے جذبات کی تیار شدہ فلم رات کو ضرور

مشاہدہ کرتا ہوں گا۔ لیکن میرے حافظہ نے کبھی اسے بیداری کے لئے محفوظ نہ رکھا۔ سوائے ایک خواب کے کہ جس کی گوناگوں لذتیں اور تلخیاں آج تک اپنے اندر ایک نشتر کی سی تاثیر رکھتی ہیں۔ میرے زنجیر بدلنے کے دو تین رات بعد کا ذکر ہے کہ ہمارا گاؤں ایک قلعہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے جنوب مغربی گوشہ میں ایک تنگ و تاریک برج تھا۔ جس کے اندر میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس برج کی دیواریں کوئیں کی مانند گول تھیں۔ جن میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف ایک روشندان چھت میں تھا۔ اس کے ذریعہ سے میں اُوپر چڑھ گیا۔ چھت کے گرد اگرد ایک قدِ آدم دیوار نظر آئی جس میں مورچے بنے ہوئے تھے۔ اس دیوار کے اُوپر چڑھ کر میں نے بیرونی دُنیا پر ایک نظر ڈالی تو قلعہ کے نیچے مجھے ایک فراخ نالا بڑی گہرائی پر بہتا ہوا نظر آیا۔ جس کی سطح ریتلی تھی۔ میرے دل پر قلعہ کے آقاؤں کی ہیبت چھا رہی تھی۔ اور حبس کی زندگی سے زندہ درگور کی حالت محسوس کر رہا تھا۔ آخر موت یا رہائی کے لئے ایک فیصلہ کن اقدام کے طور پر میں دیوار پر سے نالا میں کود پڑا۔ ریت پر گرنے کی وجہ سے مجھے کوئی چوٹ نہ آئی۔ اور میں ایک آہو کی طرح کوہ دامن پھاندتا ہوا اپنے وطن کے میدانوں میں جا پہنچا۔ دُور سے اپنے زاد و بوم شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ اور وطن کی مانوس ہواؤں کی تاثیر سے دل کی مُرجھائی ہوئی کلی گل تر کی طرح کھل گئی۔ ہری بھری فصلوں کو چیرتا ہوا میں شہر کے اس دروازہ سے داخل ہوا جس طرف میری طالبعلمی کے زمانہ کو یاد دلانے والا اسکول واقع تھا۔ خوشی و خُرمی کے مجسمہ کی طرح اپنے بچپن کی محبوب گلیوں میں سے ہوتا ہوا اپنے مکان پر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر گھر بھر میں

ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بھائی بند مجھے مبارکیں دینے کے لئے دوڑے آئے اور اک آن کی آن میں احباب واقربا کا خاصہ جمگھٹا ہوگیا۔ والدہ مکرمہ کی صورت دیکھکر انتہائے انبساط سے میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے! اور ابھی میں ان سے کلام کرنیکو ہی تھا کہ جذبات کے ہجوم سے میری آنکھ کھل گئی۔ شہر کی بارونق عمارتوں کی بجائے۔ رات کی خاموش تاریکی میں چھپروں کی جھگیاں کھڑی تھیں۔ اپنے عزیزوں کے بدلے مہیب و خونخوار سنتری۔ اور رہائی و آزادی کے عوض زنجیریں نظر آئیں میں نے آنکھیں بند کر کے ہزار کوشش کی کہ ایکدفعہ پھر وہی منظر سامنے آئے۔ لیکن بے سود۔ ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

صبح تک اس خواب کی انتہائی لذتیں سمندر کی موجوں کی طرح قید و بند کی کرخت چٹانوں کے ساتھ ٹکراتی رہیں۔ نہ تو لذتوں کا یہ تموج کم ہوا۔ اور نہ تلخی کی چٹان جگہ سے ہلی آج تک اس خواب کی وہ شیریں لذت اسی طرح قید کی سختیوں سے ہمکنار نظر آکر ایک حسرت و مسرت کی معجون مرکب سے دل پر عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ اور اپنی تاثیر کے لحاظ سے یہ خواب میرے لئے قید کے ایام کا ایک حقیقی واقعہ بن چکی ہے۔

غرض زنجیر کی پختگی سے قطعاً مایوس ہو کر میں نے لالہ صاحب سے عرض کیا۔ کہ اب وہ میرا انتظار نہ کریں جس وقت موقع ملے نکل جائیں لیکن انہوں نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے نہایت شریفانہ جواب دیا۔ کہ میں تمہارے بغیر نہیں بھاگونگا۔

اگلے روز نماز فجر ادا کر کے میں اپنے مستقبل کی فکر کر رہا تھا۔ یکایک وسیم گل نے کہا کہ تمہارا خط آیا ہے چنانچہ باہر نکل کر میں نے قاصد کو دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو گلاجان کے ہمراہ آیا تھا۔ اور میرا خط لے کر بنوں گیا تھا۔ یہ علے الصباح یہاں

پہنچ گیا تھا۔ اور نماز کی امامت بھی اسی نے کی تھی۔ اس قاصد نے ایک ملفوف خط میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا یہ تمہارے والد کا خط ہے۔ ع

روان فدائے تو نامہ کہ بردۂ قاصد

زہے لطافتے ذوقے کہ در بیان تو نیست

خط کے ہمراہ براؤن لیٹر پیپر کا ایک پیکٹ اور جناب قبلہ گاہی کے دست شفقت کی تراشیدہ ایک پنسل بھی اس نے مجھے دی۔ یہ دونوں اشیاء میں نے بھائی صاحب سے اپنے خط میں طلب کی تھیں۔

میں نے خط کھول کر پڑھا اس کا حرف حرف میرے لئے شمس و قمر سے زیادہ منور تھا۔ اس کی سطر سطر پر دل قربان ہو رہا تھا۔ دل چاہتا تھا۔ کہ سینہ چیر کر اسے دل میں جگہ دوں۔ اس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے جگر کے خون سے پرورش کردہ فرزند محمد اکرم موفق ہوں۔ میں بنوں میں موجود ہوں۔ جو مصیبت انسان پر آتی ہے۔ اس کو صبر اور شکر سے گذارنا چاہیئے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی چندے اور تم اسی حالت میں رہو گے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ط وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ط

[1] اور ضرور ضرور عالم ظاہر میں تمہارا امتحان کریں گے کسیقدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور صبر کرنیوالوں کو مژدہ سنا دے جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ کا مال ہیں اور ہمکو اسی کے پاس جانا ہے یہی لوگ ہیں جن پر خدا کیطرف سے شاباشیں اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ راہ یاب ہو گئے ؛

تمہاری ہر حالت پیشِ نظر ہے۔ اور میں غافل نہیں ہوں لیکن کُلُّ اَمْرٍ مَرْھُوْنَۃٌ بِاَوْقَاتِھَا میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے بعد بھی تمہیں لکھا جاوے گا۔ (مصیبت زدہ بندہ غلام غوث تمہارا باپ از بنوں ۳۰ مئی ۱۹۱۰ء)

وسیم گل نے بمشکل مجھے ختم کرنے دیا ہوگا۔ کہ سُنانے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ اس میں فدیہ کی بابت کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اور مضمون بھی کسی قدر گول مول تھا۔ خاص کر "چندے اور رہنا پڑے گا" سے میرے دل کو سخت بے چینی ہوئی۔ کیا جناب قبلہ گاہی محسوس نہیں کرتے کہ اس "چندے اور" میں میری حالت کیا سے کیا ہو جائے گی۔ کیا ان کو علم نہیں کہ اسی "چندے اور" میں میری موت و حیات کا فیصلہ ہو جانے والا ہے۔ ؎

پیشم ازاں بپرس کہ پرسی واہل کو

گوئند خستہ زحمت خود زین دیار برد

میرے جواب دینے سے پہلے قاصد نے وسیم گل کی حرارت کا اندازہ کر کے یوں سلسلہ کلام شروع کیا۔ میں اس کے باپ کو دیکھ آیا ہوں۔ غریب ملّا ہے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہیں۔ اپنے فرزند کی جدائی میں ہر وقت روتا رہتا ہے۔ بڑھاپے میں سخت چرکا دل پر لگا ہے۔ معز اللہ خاں تھانہ دار نے اس کی بیکسی اور بڑھاپے پر رحم کھا کر اپنے پاس جگہ دی ہے۔ اور بنوں سے چندہ جمع کر کے اور کچھ گھر سے منگوا کر ایک ہزار روپیہ نذرانہ کا بندوبست کیا ہے۔ اور تم لوگوں کے آگے نہایت عاجزی سے درخواست کی ہے۔ اگر اتنا فدیہ منظور ہو تو ابھی بھیجنے کو تیار ہیں۔ ورنہ جس طرح آپ کی مرضی۔ معز اللہ خاں نے اس کا خط اسکے

باپ کو نہیں دیا۔ کہ کہیں فرطِ غم سے اس کی روح ہی پرواز نہ کر جائے۔

خط کے مضمون اور قاصد کی اس تقریر نے سامعین کو پُرغضب بنا دیا۔ انہوں نے قاصد سے سخت کلامی میں گفتگو کی۔ اور مجھ کو بھی وعید سُنا سُنا کر دھمکانے لگے قاصد نے کہا جو تمہاری مرضی ہو تمہیں اختیار ہے۔ کسی کا زور تم پر نہیں چل سکتا مجھے ایک ہفتہ کے بعد پھر بنّوں جانا ہے۔ جس طرح جواب دو گے میں ان سے جا کر کہہ دوں گا۔ مجھے ایک ہفتہ کا وعدہ بھی نہایت لمبا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے نہایت منت سے التجا کی۔ کہ وہ مدت میں تخفیف کرے جس کا جواب گرفتہ لہجہ میں اس نے دیا۔ کہ میری فصلیں کھڑی ہیں۔ اور میری تھوڑی سی غیر حاضری سے مجھے نقصان پہنچتا ہے۔ تمہارا باپ مجھے کوئی معاوضہ تو نہیں دے دیگا۔ قاصد چلا گیا۔ وسیم گل نے کہا مجھے معلوم ہے۔ اس نے بنوں میں قرآن شریف اٹھایا ہے اور اس سے قسمیں لی گئی ہیں۔ کہ یہ جا کر ایسی ایسی تقریریں کرے انہوں نے اسے طمع دی ہے۔ یہ بڑا دوّس اور بے ایمان ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ دوسروں نے بھی اس کی تائید کی۔ پھر روئے سخن میری طرف ہوا۔ میں نے اپنا وہی پرانا رونا رویا۔ میں نے پہلے انہیں یقین دلایا۔ کہ مجھے امید ہے۔ ضرور سرکار انگلشیہ ہماری مدد کرے گی۔ اور آپ کو یہ رقم مل جائے گی۔ ورنہ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ کہ اتنی گراں بہا رقم ہمارے ہاں سے برآمد ہونی مشکل ہے۔ افسوس ہے۔ اس نے پہلا خط جناب قبلہ گاہی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ وہ میرے حالات سے تا حال بے خبر ہیں۔ خیر جس طرح بھی ہو سکا یہ وقت ٹالا گیا۔ البتہ آئندہ کی ناخوشگوار امیدیں دل کو بہت

ستانے لگیں۔

جب سے بھاگنے کا خیال میرے دل میں سمایا تھا۔روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میری بنیان کے اندر بیس پچیس روز تک زادراہ کے لئے چھپے رہے۔گرمی زیادہ ہوجانے کی وجہ سے مجھے فراریوں کے کہنے پر بنیان اتار دینی پڑی۔اس لئے ٹکڑوں کا چارج میں نے لالہ صاحب کو دے دیا ہوا تھا۔لالہ صاحب نے ان سوکھے ٹکڑوں کو خونے کے چھپر میں دروازہ کے اوپر چھپا رکھا ہوا تھا۔آج عصر کے وقت خونے کی بھاوج کا ہاتھ ان ٹکڑوں پر جا پڑا۔اور وہ حیران ہو کے بولی۔کہ یہ کس نے یہاں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔میں گڑبڑا گیا۔اور کوئی جواب بن نہ آیا لیکن شاباش لالہ سندر لال پر بے ساختہ نہائت متانت سے جواب دیا۔کہ انہیں رکھا رہنے دو۔یہ میرے ہیں وہ حیران ہو کے بولی یہ کیوں؟ انہوں نے کہا۔کہ مجھے پچھلے پہر بہت بھوک لگتی ہے۔اپنی روٹی سے میں تھوڑا سا بچا کے رکھ لیا کرتا ہوں۔اور توڑ توڑ کر کھایا کرتا ہوں لالہ صاحب نے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔کہ وہ اس راز کو مردوں پر ظاہر نہ کرے۔لالہ صاحب پہلے ہی سے بسیار خوار مشہور تھے۔اس واقعہ نے کوئی بدنیتی کا خیال پیدا نہ کیا۔البتہ ان کی نسبت بسیار خواری کے خیال میں اور اضافہ ہو گیا۔وسیم گل کو پہلے ہی یقین تھا۔کہ لالہ صاحب بہت پیٹو ہیں۔چنانچہ اس نے کوشش کی کہ میری روٹی وسیم گل کے ہاں رہے۔اور سندر لال خونے اور مدے کے ہاں کھایا کریں۔اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان دونوں کو اکٹھے بیٹھنے کا ذرا بھی موقع نہ ملے۔اور آج سے اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

گلاجان نے لالہ پیر کی طرف سے جو دعوت فراریوں کو دی تھی۔ اس کی تعمیل کے لئے چند سر کردہ فراری لالہ پیر کے پاس خوست گئے تھے۔ شاد آمین بھی توں کا شائق تھا۔ وہ بھی ہمراہ گیا۔ باقی سب فراری تو دوسرے روز واپس آ گئے۔ لیکن شاد آمین مصلحت دیکھ کر ایک دن اور ٹھہر گیا۔ اس کی واپسی آج کے دن بوقت مغرب ہوئی۔ چنانچہ فراریوں کے درمیان چارپائی پر بیٹھ کر اس نے لالہ پیر کی ملاقات کا مجمل طور پر ذکر کر کے ان کی طرف سے چند پیغام ضروری پہنچانے شروع کئے۔ کہا کہ آجکل جرگہ کی آمد آمد ہے۔ اور اس کی رسیدگی کی زور شور سے خبریں آ رہی ہیں۔ شاہ غازی[۱] کا حکم ہے۔ کہ کوئی فرد داڑے پر باہر نہ جائے اور اگر کوئی گیا۔ تو میں بہت برا سلوک اس سے کروں گا۔ دوسرے اپنی تیاری کر رکھو جس وقت حکم آئے یہاں سے کوچ کر جاؤ۔ جہاں جاؤ گے وہاں کسی قسم کی تکلیف تمہیں نہیں پہنچے گی۔ اور ہر قسم کا سامان مہیا کر دیا جائے گا۔ اور وسیم گل کے برخلاف اونٹوں والا مقدمہ جو درپیش ہے۔ اس کی نسبت لالہ پیر نے وسیم گل کو بلایا ہے۔ کہ ایک دفعہ آ کر اپنی صفائی دے دے۔ ورنہ شاہ غازی نے اگر فیصلہ کیا۔ تو شاید وسیم گل کو نقصان پہنچے گا۔

رات کو حسب معمول مجھے وسیم گل کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اور میں تمام رات اس نئے طریقے میں باندھے جانے سے رہائی کی تجاویز سوچتا رہا۔

دوسرے روز وسیم گل صبح خوست کی تیاریاں کرنے لگا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ کہ بابو گھبرانا نہیں۔ میں اب کے تمہارا پورا پورا پتہ لے کر آؤں گا۔ مغل کو

[۱] یہ لفظ ایشک اقاسی کا بگڑا ہوا ہے۔ جو زبان ترکی میں ایک عہدے کا نام ہے۔

اس نے اپنے ساتھ تیار کیا۔ دوسرے فراری بھی سمجھ گئے۔ کہ یہ دھاڑے کی نیت سے جانا چاہتا ہے۔ اس کو انہوں نے بہتیرا سمجھایا۔ اور شاہ غالب کا حکم یاد دلایا لیکن وہ کب ماننے والی اسامی تھی یہی جواب دیتا رہا۔ کہ میں خوست ہی جا رہا ہوں۔ چنانچہ یہ دن بھی گذر گیا۔ دوسرے دن یعنی ۳ جون ۱۹۱۱ء وسیم گل اور معظم خوست کے بہانے غدی یعنی دھاڑے پر روانہ ہو گئے۔ ریوالور جس کا ہمیں بہت خیال تھا۔ معظم اپنے ساتھ لے گیا۔ لالہ سندر لال اور میں نے یہ مشورہ کر رکھا تھا کہ ضرور کسی ہتھیار کا ہمارے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ صرف اپنے بچاؤ کے لئے ہی نہیں بلکہ دشمن اگر ہم پر غالب آ کر پکڑنا چاہیں۔ تو ہم اپنا کام تمام کر سکیں۔ آج تلگورام کا وعدہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا فدیہ نہ پہنچا۔ چنانچہ خواڑے بھی چار دن کا وعدہ کر کے روانہ ہو گیا۔

جب سے یہ بڑی زنجیریں مجھے ڈالی گئیں۔ میرے دل کو لمحہ بھر قرار نہیں آیا بھاگ نکلنے کے جن خوش کن خیالات میں محو رہ کر غم غلط کیا کرتا تھا۔ وہ حالت اب نہیں رہی تھی۔ زنجیروں کا اترنا ایک امر محال معلوم ہوتا تھا۔ میرا جنون بہت دفعہ مجھے بیخود بنا دیتا۔ کئی دفعہ مجھے ہوش نہ رہتا۔ اور فراریوں کی موجودگی میں میری ٹکٹکی اس طرح زنجیروں پر بندھی ہوتی۔ کہ لالہ صاحب کو مجھے بیدار کرنا پڑتا۔ اس کے پیچوں کو بغور دیکھتا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے۔

وسیم گل اور معظم جا چکے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں لالہ صاحب اور میں زیادہ آزادی کے ساتھ ملنے لگے۔ بلکہ باوجود بندشوں کے کھانا بھی اکٹھے ہی کھاتے۔ آج یعنی ۳ مئی کو ہم نے ایک پلاٹ بنایا۔ اور اس کے تفصیلات پر

بار بار غور کیا۔ اور اس کی کامیابی کے لئے بڑی عاجزی سے دعا کی خوتنے
کے ہاں ایک چمڑے کی ٹوٹی ہوئی چپل پڑی ہوتی۔ کمیاب ہونے کی وجہ سے وہ
اسے کبھی کبھی شوقیہ پہنتا۔ اس کے علاوہ ایک دقیانوسی ٹوٹی پھوٹی آفریدی
جوتی بھی اس کے چھپر میں کسی پُرانے واقع کی یاد تازہ کرنے کے لئے پڑی رہتی
تھی۔ اس کے تلووں میں بڑی بڑی میخیں لگی تھیں۔ بس یہ وہ چند بے حقیقت سی
چیزیں تھیں جن پر ہم نے بھاگ نکلنے کے پلاٹ کی بنیاد رکھی

ہم نے دوپہر اکٹھے خوتنے کے ہاں کھانا کھایا۔ کھانے سے فراغت پاکر
لالہ صاحب نے اس سے کہا کہ تمہاری چپل پھٹ گئی ہے۔ لاؤ اس کی مرمت
کر دیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہ دو معزز موچی اس کی جوتی مرمت کرنے کے لئے
حاضر بیٹھے ہیں۔ چنانچہ جلدی جلدی اس نے ضروری سامان بہم پہنچا دیا یعنی تاگا
موٹی سوئی اور ایک بیڈھب سی دستی بنی ہوئی آر۔ لالہ صاحب نے ٹوٹے
ہوئے تسموں کو تلے کے ساتھ ٹانکے لگائے۔ جو پائدار نہیں رہ سکتے تھے۔
لالہ صاحب نے نہائت متانت سے اس پُرانی جوتی پر نظر اٹھا کر دیکھا۔ اور
تھوڑے سے تامل کے بعد کہنے لگے۔ کہ اگر اس جوتی کی میخیں نکال کر
بجائے ٹانکوں کے استعمال کی جائیں۔ تو تلوا بھی پائدار ہو جائے اور تسمے بھی
مضبوط ہو جائیں۔ چنانچہ اس جوتی سے ایک دو میخیں ہم نے بدقت نکالیں۔
لالہ صاحب نے نہایت سادہ لوحی سے کہا۔ کہ کہیں سے اگر زنبور مل جائے
تو اس کی ساری میخیں اکھاڑ کر چپل میں لگا دی جائیں۔ خوتنے نے فوراً ماں کو
بھیجا۔ اور وہ اڑنگے کے ہاں سے وہی زنبور جو لالہ تلو رام کے دانت اکھاڑنے

کے وقت استعمال کیا گیا تھا۔ لے آئی۔ لالہ صاحب نے اب آہستہ آہستہ میخیں نکالنی شروع کیں۔ اور وقت ٹالنے لگے حتیٰ کہ دوپہر بہت تیز ہو گئی۔ اور خوتے نے کے سونے کا وقت ضائع ہونے لگا۔ وہ دن کا سونا نہایت ضروری سمجھتے تھے تاکہ رات کو غفلت کی نیند نہ آجائے۔ اس نے چپلی لالہ صاحب کے سپرد کی۔ اور کہا تم نے اسے ٹھیک کر رکھنا میں آکر دیکھوں گا۔ وہ یہ کہہ کر توتوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وسیم گل اور مغلم گل دہاڑے پر چلے گئے تھے۔ لالہ صاحب نے کہا کہ اب بتاؤ کہاں جائیں میں نے کہا کہ چلو مغلم والے چھپر میں۔ انہوں نے کہا کہ وہاں تو میری دشمن نیک نامے لیٹی ہوئی ہے۔ وہ مجھے کب گھسنے دے گی۔ میں نے کہا۔ یہ میرے ذمہ رہنے دو۔ غرض ہم اپنا موچی گری کا اسباب اٹھا کر دوسرے چھپر میں آگئے۔ نیک نامے مغربی دیوار کے پاس پڑی خراٹے بھر رہی تھی۔ میں نے لالہ صاحب سے کہا۔ کہ بے کھٹکے تم شور کرو۔ تاکہ یہ جاگ پڑے پھر میں اسے نکال لوں گا۔ چنانچہ ایک بڑے پتھر پر میخ رکھ کر لالہ صاحب نے دوسرے پتھر سے کوٹنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ وہ "فتنۂ خفتہ" بیدار ہوئی اور لالہ صاحب کو گالیاں دے کر گھورنے لگی۔ لالہ صاحب ایک عجیب انداز مایوسی سے اس کی طرف چپکے چپکے دیکھنے لگے۔ یہ انداز صرف لالہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ جب تھوڑا سا جوش اس کا زبان کے راستے نکل گیا۔ تو میں نے اپنے چہرہ پر مسکنت کی نقاب چڑھائی۔ اور خوشامد اور تملق کی زبان سے ایک سرد آہ کی تمہید کے بعد عرض کیا۔ کہ آہ اللہ نے ہم پر عجب مصیبت ڈالی ہے۔ مرد تو ظالم ہیں ہی عورتوں کے دل ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ادھر وہ چپلی سپرد کر کے کہہ گیا ہے

کہ اس کی واپسی تک تیار رہو۔ ادھر تمہارے خوف سے آواز نکالنے کی مجال نہیں۔ نیک نامے نے کہا۔ بابو بتاؤ میں کہاں آرام کروں۔ یہ عورتیں بعض اوقات اپنی آسانی کے لیے ہمیں مقلّم کے چھپر میں بٹھلا کر آپ خوتنے والے چھپر میں سو رہتیں۔ ایک بیٹھ کر ہماری چوکیداری کرتی۔ پھر دوسری کو جگا کر خود سو رہتی۔ اس طرح بجائے ہر ایک کے جاگنے کے وہ تینوں باری باری اپنا پہرہ دیتیں۔ ان کی اس عادت کو مدنظر رکھ کر میں نے اس سے التجا کی۔ کہ وہ خوتنے کے چھپر میں تشریف لے جائے۔ چنانچہ وہ بھلی مانس اٹھ کر وہاں جا لیٹی۔ اور خالی میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اس چھپر میں دروازے کے قریب جنوبی دیوار کے پاس چارپائی پڑی تھی۔ جس پر بیٹھنے سے آنے جانے والے کی خبر ہو جاتی۔ میں پاؤں لٹکا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اور لالہ صاحب نے میری زنجیروں پر زور آزمائی شروع کی۔ اس کشمکش و کوشش میں میری پنڈلی کو بعض دفعہ سخت ضرب پہنچتی رہی۔ لالہ صاحب کے ہاتھوں پر چھپوسے پڑ گئے۔ اور ان کا دم چڑھ گیا۔ آخر نہایت مایوسی کے عالم میں لالہ صاحب رو پڑے اور کہنے لگے۔ افسوس نہیں کھل سکتیں۔ ان کے اس آخری فقرہ سے میری رہی سہی امید ٹوٹ گئی لیکن میں نے چاہا کہ میں بھی ایک دفعہ قسمت آزمائی کروں۔ چنانچہ لالہ صاحب اپنی مالا لے کر دروازے میں بیٹھ گئے۔ کھانسنا اس امر کی نشانی مقرر کی گئی۔ کہ کوئی آ رہا ہے۔ میں اندھیرے میں زنجیروں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس زنبور نے زنجیر پر کوئی اثر نہ کیا۔ ابھی تک وہ قفل جس سے پہلے لالہ صاحب کی زنجیروں کا عقدہ وا ہوا تھا۔ ہمارے ذہن سے اترا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے یاد آیا۔ اور میں نے جھٹ اپنا آزاربند کھینچا جس کے ساتھ بندھا ہوا

وہ بھی نکل آیا۔ میری زبان پر کلمہ طیبہ جاری تھا۔ میں اس سے بالکل بے پرواہ تھا۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ اور پنڈلیوں پر زخم ہو گئے تھے۔ میں اپنی ساری طاقت کو ایک مرکز پر لا لا کر کھینچتا تھا حتیٰ کہ کچھ کامیابی ہونے لگی۔ لیکن بدقسمتی سے قفل ٹیڑھا ہو گیا۔ اس لئے پہلے اسے سیدھا کیا۔ اب زنجیر کا حلقہ کافی کشادہ ہو چکا تھا دوسری دفعہ قفل بالکل ٹوٹ گیا لیکن ساتھ ہی زنجیر پاؤں سے اُتر آئے اپنی مضبوط زنجیر کے اُتر جانے کو ہم نے فال نیک تصور کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی تھا۔ کہ اس حالت میں پہلی زنجیر کی طرح ہم موقع کا لمبا انتظار نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ زنجیر ضرور راز افشا کر دے گی۔ اس لئے ہم کو جلدی نکلنا چاہیئے۔ میں نے تین چار دفعہ زنجیر کو اتار چڑھا کر اپنی تسلی کر لی۔ اور ٹوٹے ہوئے قفل کو جنوبی دیوار کے پتھروں میں دبا دیا۔ میری اس حالت کو دیکھ لالہ صاحب کو جوش آیا۔ اور انہوں نے میری جگہ بیٹھ کر اور مجھے اپنی جگہ بٹھا کر اپنی زنجیروں کو اتارا اور تسلّی کر لی۔ انہوں نے بھی اپنی زنجیروں کو اس حالت میں کر لیا۔ کہ جس کے دیکھنے سے ہم کو راز کھل جانے کا ڈر رہے۔ اس طرح اپنی اپنی تسلّی کر کے ہم نے اپنی اس "خطرناک" کامیابی کو چھپائے رکھنے کی کوشش کی پنڈلی پر اپنی چادر پھاڑ پھاڑ کر دھجیاں زنجیر کے زخموں کے بہانے لپیٹیں۔ تاکہ موٹی ہو کر زنجیر پھنسی رہے۔ علاوہ ازیں لالہ صاحب نے اپنی زنجیر سے ایک پتلی تار کا ٹکڑا نکالا۔ اور اس کا ایک عارضی چھلا بنا کر میں نے اپنی زنجیر کی کنڈلیوں میں ڈال کر اسے تنگ کر لیا۔ اور مزید براں اپنے پاجامے کو پھاڑ دیا۔ تاکہ زنجیر کو ڈھانپے رکھے۔ زنجیر کے کھلنے کے بعد جتنا عرصہ وہاں رہے برابر تلاوتِ قرآن شریف

کے بہانے دو زانو بیٹھا رہا۔ زنجیر سے فراغت پانے کے بعد ہم نے چپلی کی مرمت کی۔ زنبور ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اسے سیدھا کیا اور خوت نے کے گھر میں چھپا دیا۔ تاکہ ان کے مانگنے پر دیا جائے۔ اور اگر طلب نہ کریں تو پڑا رہے۔

آج نکل جانے کے لئے ہم نے آپس میں بڑے وعدے کئے۔ اس دن کے خیالات مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ ہم کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی بڑے بھاری میلے پر جانے کے لئے تیاری کی ہے۔ ہمارے چہرے بشاش تھے۔ اور ہم بار بار تجاویز پر غور کرتے۔ وتسیم گل نے دو جوڑے چپلیوں کے بنائے تھے۔ ایک وہ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اور دوسرا چھپر کی چھت میں رکھ گیا۔ یہ جوڑا میرے پاؤں کے عین برابر تھا۔ لالہ صاحب نے ایلاوار کی نئی چپلیوں پر نظر رکھی۔ پانی کے واسطے کوشش کی گئی۔ کہ مشکیزہ اٹھا لے چلیں۔ یہ بات ذہن میں نہ آئی۔ کہ خالی مشکیزہ نہایت کارآمد ہوگا۔ اور بغیر تکلیف کے چھپا لے چلیں گے۔ درآں صورت کہ مشکیزہ ہمراہ لے جانے میں ناکام رہیں۔ تو پھر ایک پانی سے لبریز کوزہ کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ جہاں تک اپنی کوشش ہو سکے جان پر کھیل کر بھی ایک رائیفل لے جانی چاہیئے۔ اپنے ساتھ چند روپوں کا ہونا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ راستہ کی بابت اپنی قرارداد وں کو ہم نے پھر تازہ کیا۔ اور وہ یہ تھیں۔

۱۔ بھاگنا اس طرف کو ہے۔ جسے ہم نے "وادیٔ تِرم کی سمت" قرار دے رکھا ہے۔

۲۔ چار پانچ میل تک ہم کو امیر صاحب کی سلطنت میں جانب شمال بھاگنا ہو گا۔ اور پھر وہاں سے تِرم کی طرف رُخ کیا جائے گا۔ اس طرح ہمارے پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔

۳۔ راستہ میں بالکل ایک دوسرے سے سوائے نہایت ضرورت کے بات کرنا منع ہوگا۔

۴۔ ایک کپڑے کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے وابستہ رہیں گے۔ جو صرف ہاتھوں میں پکڑا ہوا ہوگا۔ اور بندھا نہ ہوگا۔

۵۔ اگر کوئی پگڈنڈی یا راستہ ہمیں مل جائے۔ تو دو میل تک بڑی احتیاط سے اس پر چل کر اس کی اصلی سمت معلوم کی جائے گی۔ اگر وہ ہمارا مطلوبہ راستہ ہی ہے۔ تو بھی اس سے ایک میل کی دُوری اختیار کر کے اس کی سمت کو قائم رکھا جائے گا۔

۶۔ سفر صرف رات کو کیا جائے گا۔ اور دن کسی غار میں بسر کیا جائے گا۔

۷۔ رات کو زنجیروں کے کھولنے کے درجے قائم کئے۔ اور ہر ایک درجے کے لئے انگلیوں کے اشارات مقرر ہوئے یعنی ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں دے کر کھڑی انگلیوں کے تعداد سے اشارہ معلوم کر لینا۔ یہ درجے اسطرح تھے۔

(۱) میرا محافظ سو رہا ہے۔ (۲) میرا محافظ جاگتا ہے۔ (۳) پہلی زنجیر کھول لی (۴) دوسری زنجیر کھول لی۔ (۵) تیار ہو جاؤ۔ (۶) بھاگو۔ ان ہدائتوں کو ہم نے آپس میں بہت دفعہ دہرایا۔ اور ان کی خوبیوں اور مضرتوں پر بحث کی۔ ہم اپنے میں ایک غیر معمولی جوش دیکھتے تھے۔ میں نے کہا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ایک گھوڑے کو کوتل رکھ کر کھلایا جائے۔ اور ڈیڑھ ماہ کے بعد اس کو میدان میں نکالا جائے۔ اور وہ اپنے جوش میں آرام سے کھڑا نہ ہو۔ لالہ صاحب کہتے مجھے یقین ہے۔ کہ میں دس پندرہ میل کی دوڑ بلا تکان دوڑ لوں گا۔ غرض انہی

خیالات میں ہم نے دن بسر کر دیا۔

آج رات سرِ شام ہی بادل گرجنے لگے۔ اور آندھی چلنے لگی۔ یکلخت ایسی تاریکی چھاگئی۔ کہ دنیا ظلمت کے پردہ میں چھپ گئی ہم نے اس کو فالِ نیک سمجھا۔ اتنے میں کتے بھونکنے لگے۔ اور کچھ مہمانوں کی آمد کی خبر پہنچی معلوم ہوا کہ فراریوں کے معزز اور ہر دل عزیز بزرگ لالہ پیر بذاتِ خود تشریف لائے ہیں۔ اور انکے ہمرکاب گلہبان اور ایک اور فراری بھی ہیں۔ انکی اس غیر متوقع آمد نے فراریوں کے دلوں کو تذبذب میں ضرور ڈال دیا۔ اس معزز اور مہربان مہمان کے خیر مقدم میں انہوں نے اسی وقت ایک دُنبہ ذبح کرنا چاہا۔ لالہ پیر نے بہت روکا۔ اور کہا میری اسی میں خوشی ہے۔ کہ صرف ایک مرغ میرے لئے ذبح کیا جائے۔ لیکن رات کے نو بجے جھٹ پٹ دنبہ ہی ذبح کیا گیا۔ سارے فراری پروانوں کی طرح لالہ پیر کے گرد جمع ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پولیٹیکل چالوں سے ان سب کا دل لبھا رکھا تھا۔ اِدھر تو یہ کارروائی ہوتی رہی۔ اُدھر ہمارا مقیاسِ جوش سو درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ تاریکی اس قدر چھائی ہوئی تھی۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ میں نے لالہ صاحب سے کہا کہ رات کو شاید موقع نصیب نہ ہو۔ آؤ جرأت کریں۔ اور چھلانگ مار کر تاریکی میں غائب ہو جائیں۔ پہلے تو انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی لیکن پھر انہوں نے مناسب نہ سمجھا ئیں کو زہ لے کر اِدھر اُدھر ہوا۔ لیکن لالہ صاحب نے ہامی نہ بھری۔ کچھ رات گئے اللہ داد لالہ پیر کے پاس سے اٹھ کر ہمارے پاس آیا۔ ہم نے اس سے لالہ پیر کے آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے بیان کیا۔ کہ حاکم خوست نے اسے بھیجا ہے۔ کہ جرگہ آنے والا ہے۔ قیدیوں کو لے کر تم دوسری جگہ چلے جاؤ۔ اور اب مشورہ کر رہے ہیں۔ کہ

تیراہ کو چلے جائیں۔ صبح سارا اسباب باندھ کر قیدیوں کے سروں پر رکھا جائے گا اور کوچ کر جائیں گے۔ میں نے یہ خبر سُن کر نہایت اضطراب ظاہر کیا لالہ صاحب نے ایلا دار سے کہا۔ کہ رغیوں کا ٹوکرا بالو کے سر پہ رکھو اس کے اوپر بستر اور دو چارپائیاں میرے سر پر رکھ دو۔ اور چلو ابھی چلے چلیں۔ لالہ صاحب نے یہ بات ایسے انداز میں کہی کہ سب ہنس پڑے۔ اور ہنسی میں وہ وقت ٹل گیا میرے دل میں کھٹکا تھا۔ کہ اس پیر نابالغ کا ایسے موقع پر آنا خالی از علت نہیں ہے۔ لالہ پیر نے آکر وسیم گل کی نسبت دریافت کیا۔ کہ وہ کہاں ہے۔ اس سے فراریوں کو یقین ہوگیا۔ کہ وہ خوست کی طرف نہیں گیا۔ بلکہ دہاڑے پر چلا گیا ہے۔ لالہ پیر کے سامنے انہوں نے کوئی بہانہ بنا دیا۔ آدھی رات سے زیادہ لالہ پیر کی خاطر و مدارات میں گذر گئی۔

آج ہماری چارپائیاں شمال کی طرف کھینچ کر وسیم گل کے چھپر کی مغربی جانب کر دی گئیں۔ اور اس طرح خوتے نے کی دائم بیدار والدہ کی نظر سے ہم ذرا دُور جا پڑے۔ مشکیزہ بھر کر دیوار کے ساتھ پتھروں پہ رکھ دیا گیا۔ لالہ صاحب نے ایک کوزہ پانی کا بھر کر اپنے سرہانے رکھ لیا۔ وسیم گل اور منگم کے چلے جانے سے ہم دونوں کو چارپائیاں نصیب ہوگئیں۔ اور نیزان کے چلے جانے کے بعد میرا چارج خوتے نے کے سپرد ہوا۔ اور لالہ صاحب اس کے چارج سے نکل کر ایلا دار کے حوالے ہوئے۔ کیونکہ میری نہایت درجہ احتیاط کی جاتی۔

جب سب سو گئے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ تو ہم نے زنجیر ورنچ دست درازی شروع کر دی۔ چنانچہ میرا پہلا اشارہ ہوگیا جس کا جواب لالہ صاحب نے بھی تسلّی بخش دیا۔ میں نے ایک زنجیر کھولی اور دا اشارہ کیا۔ جواب میں لالہ صاحب

نے بتایا۔ کہ انھوں نے دونوں زنجیروں کو علیحدہ کر دیا ہے۔ اس اثنا میں مجھے
شک ہوا۔ کہ خوستے جاگ رہا ہے۔ اس بندۂ خدا نے ہماری طرف ایسا نہ کیا۔
کہ صبح تک کروٹ نہ لی۔ اس کی اس حالت کو میں نے اس کی چال سمجھا اور بڑا
انتظار کیا۔ کہ وہ کب کروٹ لے اور ہم بھاگیں۔ میری آنکھوں میں نیند کی جگہ موت
کی شکل سمائی ہوئی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خوستے کو دیکھتا رہا۔ لیکن میرا شک
یقین تک پہنچ گیا۔ کہ وہ جان بوجھ کر خاموش ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے زنجیروں
کو پھر چڑھانا شروع کیا۔ حکمتِ الٰہی سے ان کا اوپر چڑھنا دشوار ہو گیا۔ جوں جوں ان
کے اوپر چڑھنے میں دقّت محسوس ہوتی میری گھبراہٹ بڑھتی جاتی۔ اور گھبراہٹ
کے بڑھنے کے ساتھ ان کا چڑھانا مشکل ہوتا جاتا۔ پسینے میں میں شرابور ہو گیا۔ پورا
زور لگاتا لیکن کچھ بھی نہ بن پڑتا۔ نیز یہ اندیشہ بھی دامنگیر تھا کہ کہیں پاؤں سُوج گیا تو
چڑھانا ناممکن ہو جائے گا۔ آخر میں نے اپنے دل کو ٹھہرانے کے لئے دو تین منٹ
آرام کیا۔ اور نہایت تسلّی سے دوسری دفعہ کوشش کی۔ اور میں کامیاب ہو گیا۔
اس کے ساتھ ہی چھبیسویں رات کا چاند نمودار ہوا۔ اور صبح کے آثار پیدا ہو گئے
میں نے لالہ صاحب کو پکارا تو مستِ خواب پایا۔ ان کو جگا کر کہا۔ کہ صبح ہو گئی۔
زنجیریں صبر و شکر کر کے پہن لو۔ لیکن ہم دونوں کی قسمت ایک جیسی تھی۔ انکی زنجیریں
بھی رُک گئیں۔ اور مجھ سے زیادہ گھبراہٹ ان کو محسوس ہوئی پہلے تو وہ بطورِ خود
کوشش کرتے رہے۔ پھر نہایت اضطراب میں مجھ پر ظاہر کیا۔ کہ زنجیر ایڑی پر
پھنس گئی ہے۔ میں نے ان کو تسلّی دیکر کہا کہ ذرا اپنے دل کو ٹھہرا کر اور حواس کو
درست کر کے آہستہ آہستہ چڑھاؤ۔ چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا لیکن ناکام رہے۔

اتنے میں چاند ہمارے جسموں کی طرح نحیف و زار نمودار ہو گیا۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر صبح کا ستارہ بھی چمک دکھانے لگا۔ ساتھ ہی مسجد سے خلافِ معمول کلمہ طیبہ کے ورد کی صدا آنے لگی۔ اور اڑنگے والے چھپروں کی لائن میں ہل چل شروع ہو گئی۔ ان باتوں سے لالہ صاحب کی طبیعت میں اور گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ اور مجھ سے کہنے لگے۔ "بابوجی میں تو مارا گیا۔ مجھے بھاگنے دو"۔ ان کی اس دیوانہ وار حرکت سے مجھے بہت خوف پیدا ہوا۔ وہ بھی پکڑے جاتے اور میں بھی ساتھ مارا جاتا۔ میں نے انہیں روکا۔ اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کہ کوزے سے پانی لے کر ڈالو۔ اور کوشش کرو۔ چنانچہ یہ بھی کیا گیا لیکن فائدہ نہ ہوا۔ وہ بہت گھبرائے مجھے ایک آخری تجویز سوجھی۔ وہ یہ تھی کہ لالہ صاحب اپنے محافظ ایلاآدار کو جگائیں۔ اور رفعِ حاجت کی سخت ضرورت کا اظہار کر کے اپنی زنجیر چارپائی سے کھلوا کر اور دور جا کر آرام اور احتیاط سے چڑھا لیں۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ ہم پر ایسی گھبراہٹ طاری تھی۔ کہ ساتھ ہی میں بھی اٹھ بیٹھا۔ جو کہ نہایت نامناسب تھا لیکن خیر گذری ایلاآدار نے بغیر کسی شبہ کے زنجیر کھول دی۔ ادھر اس نے زنجیر کھولی! ادھر لالہ صاحب کو تسلی ہوئی۔ اور چارپائی پر بیٹھے ہی زنجیر چڑھ گئی۔ ذرا دن چڑھا تو لالہ صاحب نے اس پانی کے لئے جو چارپائی پر گرا تھا۔ نہایت حسبِ حال بہانہ بنایا۔ آپ نے کہا۔ کہ مجھے پیشاب نے سخت تنگ کیا لیکن ایلاآدار کے خوف سے میں نے اسے نہ جگایا! اور اوپر ہی نکل گیا۔ پھر ٹٹی سے تنگ اور نہایت مجبور ہو کر اس کو صبح کے قریب جگانا ہی پڑا۔ اس بیان سے انہوں نے لالہ صاحب کو بیشک بُرا بھلا کہا۔ لیکن یہ بُرا بھلا کہلانا شک کے ایک ذرہ بھر سے بہت اچھا تھا۔

صبح اٹھ کر فراری پھر لالہ پیر کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں جناب امیر صاحب شاہ افغانستان کی سرحدی قلعہ سے جو ہم سے دو میل کے فاصلہ پر تھا میجر صاحب بُلائے گئے۔ میں حیرت میں تھا۔ کہ "یہ پیر مغاں" آج قلعہ سے کیسے تشریف لائے۔ آخر معلوم ہوا۔ کہ سرکارِ انگلشیہ نے جناب امیر صاحب سے بمعرفت جرگہ یعنی کمشن "قرۃم" میرا مطالبہ کیا ہے۔ اور میرے سب سے پہلے خط کی نقل جناب امیر صاحب والیٔ افغانستان کو بھیجی ہے جس میں فراریوں نے فخریہ اپنے نام اور جائے سکونت مجھ سے تحریر کرائی تھی۔ اب دارالسلطنت کابل سے فرمان جاری ہوا ہے۔ کہ شاہ غاشی اس کی تحقیق کر کے لکھے۔ وہ فرمان لالہ پیر کے پاس ہے۔ اور میجر صاحب کو اس کا یہ جواب لکھنے کے لئے بُلایا گیا ہے۔ کہ یہاں کوئی سرکاری ملازم اس نام کا نہیں پکڑا گیا۔ اور نہ مندرجہ چٹھی کے ناموں کے کوئی فراری موجود ہیں۔ اس خبر کے سننے سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں نے کئی فراریوں کو اس کی تحقیق کے لئے مختلف بہانوں سے مسجد میں بھیجا۔ لیکن سب نے بالاتفاق یہی بیان کیا۔ میجر صاحب سے اس کا جواب لکھوانے کے بعد اُٹھ نکلے گے ہاں کھانا کھایا گیا۔ وہاں بھی اس امر پر گفتگو ہوتی رہی جس کے بہت سے کلمے ہمارے کانوں میں پڑتے رہے۔ اور ہمیں شک ہونے لگا۔ کہ شاید ہمیں یہ نیست و نابود کر دیں گے۔ یا ایسی جگہ رکھیں گے۔ جہاں مدت تک ہمارا پتہ نہ ملے۔ اور کمشن کا فیصلہ ہو جانے کے بعد پھر ہمارا معاملہ اٹھایا جائے۔ کھانا کھانے کے بعد لالہ پیر صاحب رخصت ہونے لگے۔ اور چونکہ وہ چھپر کے پاس ہی تھے اس لئے میں ان کی تقریر کو سُن سکتا تھا۔ اور شکل و صورت

کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک سفید گھوڑی پر سوار تھے سفید ریش۔ دُبلا بدن۔ کپڑے نہ بہت میلے اور نہ اجلے۔ اور ایک پُرانے فیشن کی مدور شیشوں کی عینک زیب چشم کئے ہوئے تھے۔ اس وقت گاؤں کے تمام ذاری ان کے گرد جمع تھے آپ نے ان کے درمیان گھوڑی پر سوار لمبی چوڑی تقریر کی جس میں سلطنتِ اسلام کے فیوض و برکات کا تذکرہ کیا۔ پھر آپ نے بیان کیا۔ کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ جناب امیر صاحب اور فرنگی کی سلطنت کے درمیان دوستی ہے۔ ایسی صورت میں اگر یہ تحقیق ہو جائے۔ اور ثبوت مل جائے۔ کہ ہم نے سرکاری آدمیوں کو قید کر کے اپنی سلطنت میں رکھا ہے۔ تو ہماری سلطنت کی بڑی بدنامی ہے۔ بابو نے بیشک تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اور قسم ہے اس خدا کی (اشارہ اُوپر کو کر کے) کہ یہ چٹھی فرنگی نے بھیجی ہے۔ اور یہ بابو کا خط چھاپ کر بھیجا ہے۔ اس بابو نے دھوکا دیا ہے۔ اور کوشش کی ہے۔ کہ فرنگی اسے مفت چھڑا لے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ تم کچی کوڑی بھی اس پر وصول نہیں کر سکو گے۔ اور حاکم خوست کی یہ مرضی ہے کہ تم اسے قتل کر دو۔ اس کا جواب ذاریوں نے یکزبان ہو کر دیا کہ ان کے قتل کا ملال ہمیں اتنا بھی نہ ہوگا جتنا ایک مرغے کا ہوتا ہے۔

اے کہ در کشتنِ ما ہیچ مدارا نہ کنی
سود و سرمایہ بسوزی و محابا نہ کنی

جس طرح ان کے یہ الفاظ ہمارے کانوں میں بار بار گونجے اس کا احساس سوائے ہمارے اور کسے ہو سکتا ہے۔ کس ٹھنڈے دل سے ہم نے اپنا فیصلہ سُنا۔ یہ فیصلہ سُنانے کے بعد لالہ پیر نے سب ذاریوں کے ساتھ بلکہ بقائے دولتِ افغانستان

ودرازیٔ عمرِ امیر صاحب کیلئے دعا کی اور رخصت ہوا۔ بہت سے فراری دُور تک اس کے ہمرکاب گئے۔

اس تقریر کے بعد گلاجان نے مجھے نہیں بھلایا۔ وہ چھپر میں میرے پاس آیا اور برق کی طرح میرے خرمن پر گرا۔ آج اس نے مجھے بہت دھمکایا۔ اور یہ مجھے حکم سنایا۔ کہ اب تمہارا آخری وقت قریب ہے۔

لالہ پیر کے تشریف لے جانے کے بعد سارے لوگ مسجد میں تمام دن جمگھٹا کر کے بیٹھے رہے میجر صاحب بھی مرکز کی طرح درمیان میں بیٹھے تھے۔ ہم نے چند فراریوں سے دریافت کیا۔ کہ آخر لالہ پیر کے چلے جانے کے بعد یہ سرگوشیاں اب کیا معنی رکھتی ہیں معلوم ہوا کہ فراری کوچ کرنے کے مسئلے پر مشورہ کر رہے ہیں۔ اور قیدیوں کو کسی اور جگہ منتقل کرنے کے مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔ خشک عبدالکریم کو لالہ صاحب نے بھیجا۔ چنانچہ اس نے بھی یہی بیان کیا۔ کہ کل شاید تورکمر کی طرف روانگی ہو۔ ادھر فراری مشورہ کرتے رہے اُدھر ہم جان و زندگی سے ناامید اپنے ارادوں اور اقراروں کو پکّا کرنے لگے۔ ہمیں یہاںتک ناامیدی تھی۔ کہ ممکن ہے ابھی آکر ہمارے سر تن سے جُدا کر دیں۔ آج ہم نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں۔ میں نے کہا اے ذوالجلال والاکرام اگر تیرا بندہ تیری قسم کھا کر کسی امر کا ارادہ کرے۔ تو ضرور تُو اس کو پورا کرتا ہے۔ مجھے تیری عزّت اور جلال کی قسم ہے۔ کہ اگر زندگی آج بچی رہی تو میں رات کو ضرور بھاگ نکلوں گا۔ خواہ محافظوں کی آنکھیں کھُلی ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح لالہ صاحب نے بھی قسمیں کھائیں۔ اور میں نے بقیہ روز عبادتِ الٰہی میں گذار دیا۔

شاخ سرکش شد و دست ہمہ کوتاہ بماند
جور گلچیں و نزاع سر خار آخر شد

آج ہم اپنے حالات کے اس حصّے میں پہنچتے ہیں جس کا ہر ایک فقرہ دل کو پاش پاش کرنے کے لئے کافی ہے۔ جون سنہ ۱۹۱۰ء کی پانچویں تاریخ کا روز گذر گیا۔ نماز مغرب سے فراغت پا چکے۔ میرے کھانے کی باری نیک نامے کی طرف تھی۔ اور لالہ صاحب کی خوتنے کے ہاں۔ یہ ہمارا وہاں کا آخری آب و دانہ تھا۔ نیک نامے نے اپنے چھپر کے سامنے چٹائی بچھائی۔ اور مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود میرے مقابل بیٹھ گئی۔ روٹیوں کی چنگیر درمیان رکھی گئی اور مل کر کھانا شروع کیا۔ اتنے میں مدّتے ایک برتن میں مرغی کا شوربا لے کر آیا۔ اور نیک نامے کو دے دیا۔ اس نے وہ برتن درمیان میں رکھ لیا۔ نیک نامے نے اپنی رسم کے مطابق روٹی کو ٹکڑے کر کے اس شوربے میں ڈال دیا۔ اور ہاتھوں سے خوب مل مل کر تر کیا۔ اس اثنا میں وہ مجھے نہایت

محبت آمیز الفاظ میں کھانے کے لئے کہتی جاتی۔ میں جواب دیتا۔ کہ تم بھی فارغ ہو تو اکٹھا کھانا شروع کریں گے۔ غرض یہ آخری کھانا ہم دونوں نے ایک ہی برتن میں مل کر کھایا۔ وہ ساتھ ہی مجھے زیادہ کھانے کے لئے اصرار کرتی بار بار کہتی کہ جلدی جلدی کھاؤ۔ شوربے میں دو ہڈیاں بھی تھیں جنہیں پکڑ پکڑ میرے منہ میں ڈالتی! اور خواہ مخواہ مجھے کھاتے ہی بنی۔

میرا بُت اگرچہ اس وقت نیک نامے کے سامنے موجود تھا لیکن میں خود اردگرد کے نادیدہ پہاڑوں اور جنگلوں میں سرگرداں تھا۔ اور عالمِ محویت میں راستوں کی رہنمائی سے بے نیاز سمتوں کی پیروی میں پریشان ہو رہا تھا۔ ؏

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

نیک نامے کی باتوں کا جواب خود فراموشی کے عالم میں کچھ نہ کچھ دے رہا ہوں گا۔ لیکن مجھے ہوش نہ تھا۔ کہ کس سے مخاطب ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں کیونکہ موجودہ اشتہا کی تسلی کرنے کی نسبت مجھے اپنی خیالی منزل کے زادِ راہ کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ روٹی کے ٹکڑوں کو چھپا چھپا کر ایک کافی مقدار اپنی چادر میں جمع کر لی۔ لاصاحب اس وقت خوسنے کے ساتھ ہم دسترخوان تھے مرغی کا شوربا انہیں بھی مل گیا۔ لیکن میری طرح اتنی محبت سے کھلانے والا ساتھی میسر نہ تھا جو اٹھا اٹھا منہ میں نوالے دے۔

کھانے سے فراغت پا کر پہلے میں نے چپلیوں کا بندوبست کرنا چاہا۔ نیک نامے اپنے چھپر کے پاس بیٹھی تھی۔ میں کسی بہانے سے اندر گھسا وہ بھی

نزدیک ہی تھی۔ اس لئے چھت میں کھسر پھسر کرنے میں رُک گیا۔ پھر دوسری دفعہ اندر گیا۔ لیکن موقعہ نہ ملا۔ حقیقت میں اس وقت تک چپلیوں کی ضرورت سے واقف نہ تھا۔ اگرچہ لالہ سُندر لال نے اپنا تجربہ بارہا مجھ سے بیان کیا۔ اور کہا خبردار پاؤں کی حفاظت کا بندوبست ضرور کر لینا۔ لیکن میرا یہی جواب ہوتا۔ کہ لالہ صاحب اگر ہمارے پاؤں کے پُرخچے اُڑ جائیں تو بھی ہم کسی نہ کسی طرح منزلِ مقصود تک پہنچ ہی رہیں گے۔ خواہ بعد میں چھ مہینے چارپائی سے اُٹھ نہ سکیں۔

سورج کا شاہنشاہ آرام کی خاطر دامانِ شب میں اپنے منور چہرہ کو لپیٹ چکا تھا۔ اور ملکۂ شب اپنی سیاہ زلفوں کو وسعتِ عالم میں پھیلا رہی تھی۔ ماہ جمادی الثانی ۱۳۲۸ھ[1] کی قمری تاریخ ستائیسویں تھی۔ اس لئے تمام شب تاریکی کا ہی راج رہے گا۔ فراری جمع ہونے لگے۔ وہ منگل کے چھپر کی مغربی جانب چارپائیوں پر بیٹھتے جاتے۔ ان کے انداز کی سنجیدگی اور فضا کی خاموشی سے ایسا معلوم ہوتا کہ ہمارے کورٹ مارشل کی تیاری ہو رہی ہے۔ شاد آمین صاحب بھی خاص آن بان سے تشریف لائے۔ شاید اس کورٹ مارشل کے احکام کو عملی جامہ پہنانا اور ہمارے آخری دموں کا خاتمہ کرنا انہیں کے سپرد ہونیوالا ہے۔ اور یہ اس ہائی کورٹ کے (Executioner) یا جلاد مقرر ہوئے ہیں۔

میں اور لالہ سندر لال نیچے چٹائی پر بیٹھے ان کی مزاجوں کی افتاد کا اندازہ لگا رہے تھے۔ لالہ صاحب اُٹھے اور ان کی تمباکو نوشی کے لئے سامان شروع کیا۔ خود نے چلم پینے کا عادی نہیں تھا۔ چند روز سے لالہ صاحب نے اسے

---

[1] ماہ جون ۱۹۱۰ء کی پانچویں اور چھٹی تاریخ کی درمیانی رات۔

بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور ان کو زیادہ غافل کرنے کے لئے تمبا کو میں بھنگ ملا کر پینے کی عادت ڈالی۔ وہ لوگ اردگرد سے بھنگ کی پتیاں توڑ لاتے۔ اور لالہ صاحب کو دے دیتے۔ چنانچہ لالہ صاحب نے آج بھی تمبا کو میں ملا کر بھنگ کا خوب دور چلایا۔ میں نے لالہ صاحب کو بہت تاکید کی کہ وہ خود چلم نوشی سے آج بچے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے خود بہت احتیاط رکھی۔

شاد آمین کا روئے سخن میری جانب ہوا یا بلائے آسمانی ٹوٹ پڑی۔ بولنا شروع کیا تو بند ہی نہیں ہوتے۔ دھمکانے پر آئے تو وہ ظلم تجویز کئے کہ سُننے والوں کے دل کانپ گئے۔ فرمانے لگے کہ ہندو بچارہ بے گناہ ہے جو شرارت ہے اس بابو کی ہے۔ اور جو فتنہ ہے اس کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس نے ہمیں بہت بڑا دھوکا دیا۔ ہمیں سُنایا کچھ اور خطوں میں لکھا کچھ۔ اس کا خمیازہ یہی نہیں ہوگا۔ کہ قتل کر دیا جائے۔ بلکہ وہ مصیبتیں دی جائیں گی۔ کہ سسک سسک کر جان دے۔ اس کی طفیل ہمیں سندر لال کے فدیہ سے بھی نا امیدی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ دونوں کی مشکیں جوڑ کر ان کو باندھ دو۔ اور ان کو دھوپ میں رکھ دیا کرو۔ تاکہ یکدم مر جانے کی آسانی انہیں نہ ملے۔ انہوں نے ہماری روٹیوں کو حرام کیا۔ ہمارا کھلایا پلایا سب برباد گیا۔ ہماری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیا اب یہ صرف موت ہی اپنا انجام سمجھیں گے۔ نہیں ان کی موت ایسی ہونی چاہیئے کہ دوسرے قیدی عبرت پکڑیں۔ اور اپنی رہائی کا جلدی بندوبست کریں۔ ہم بہت ناز برداری کر چکے ہیں۔ ہم اسے مسلمان سمجھتے تھے لیکن اس نے کافروں سے بدتر دھوکا دیا۔ اپنے دھوکے کا بدلہ تھوڑی دیر میں یہ پالے گا۔ اس کا

منہ کھول کر جلتے ہوئے کوئلے بھر دو۔ تاکہ جھوٹ بولنے کی سزا پا لے اس نے اپنی عزّت کو نہیں پہچانا۔ اور اپنی قدر کو نہیں دیکھا۔ گرگرے کی شاخوں سے اس کا چمڑا اتار دینا چاہیئے۔ بالو تیار ہو جاؤ اپنی مرگ کے لیئے۔ اب ہم وہ نہیں رہے۔ جو تھوڑی دیر پہلے تھے۔ تم اس رات کو اپنی آخری رات سمجھو اس تقریر کو اس نے اتنا طول دیا اور اس جوش میں کہا۔ کہ اگر پتھر کا دل بھی ہوتا۔ تو اس کی آتش غضب سے پگھل کر بہ جاتا۔ مجھے ہرگز جرأت نہ ہوتی تھی کہ اپنی صفائی کے لیئے ایک حرف بھی کہوں کیونکہ ساری کارروائی میں اپنے کانوں سُن چکا تھا۔

بارہا دیکھی تھیں ان کی رنجشیں

لیکن اب کے سرگردانی اور ہے

اگر میں نے کہا تو یہی کہا۔ کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اگر میں نے دھوکا دیا ہے۔ تو ظاہر ہو کر ہی رہے گا لیکن میری باتیں کہاں تک اثر رکھ سکتی تھیں۔

شاد آمین چُپ ہوئے تو مداخیل کی باری آئی۔ ان کا اندازِ کلام کچھ اور ہی شان لیئے ہوئے تھا۔ لفظ لفظ سے تکبّر اور بے پروائی ٹپکتی تھی۔ ان کی تقریر سے یہ ظاہر ہوتا۔ کہ گویا کسی دوسرے فرد ہی کے ساتھ میرا تعلق ہی نہیں۔ اور صرف انہی کی ذاتِ والاصفات کے ساتھ میری موت وحیات وابستہ ہے۔ اگر ذرا بھی خلاف ورزی کی گئی۔ تو کانٹوں میں گھسیٹ دینگے۔ گرم توے پر بٹھا کر جلا دیں گے۔ بھاڑمیں جھونک دیں گے۔ اور کوئی ان سے پرسش نہ کرے گا۔ ان کی تقریر کو ایک اور صاحب نے قطع کیا۔ اور وہ لوچھاڑ شروع کی۔ کہ سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ سب کے چہروں پر میری نظر پہنچتی۔ اور رات

سے کے اندھیرے میں نہایت مایوس ہو کر واپس آتی۔

آج کے تمام دن کے واقعات پر غور و فکر میں مستغرق رہنے کی وجہ سے قدرت نے میری حسِ بے تابی و بیقراری کو نیم مُردہ سا کر دیا ہوا تھا۔ اور بھاگنے کی تجاویز کو پختہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہی میں اپنے آپ کو ہر طرح کی بیرحمی کے ساتھ قتل کئے جانے کے لئے بھی تیار کر رہا تھا میری بے تابی میں اب اسقدر بجلیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ کہ ان کی ان سفاکانہ تجاویز قتل کی دھمکیاں کوئی مزید نمایاں اثر پیدا نہ کر رہی تھیں۔ بلکہ میں دل میں ان کی دھمکیوں کا جواب یوں دے رہا تھا۔

نہ اتنا بُرّشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ

مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

انتہائے یاس نے ایک "صبر و تسکین" کی سی حالت پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔

مدّے میرے برابر چارپائی پر بیٹھا خاموشی سے سُن رہا تھا میں نے اسے ٹٹولا اور نہایت یاس بھری دھیمی آواز میں پوچھا۔ کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے بیان کیا۔ کہ تمہارا خط انگریزوں نے امیر صاحب کی طرف بھیجا تھا جس میں لکھا تھا۔ کہ تم امیر صاحب کی سلطنت میں مقید ہو۔ وہ خط حاکمِ خوست کے پاس بھیجا گیا اور اس نے لالہ پیر کی معرفت کہلا بھیجا ہے۔ کہ جرگہ یعنی کشن قوم کی سرحد پر بیٹھی ہے۔ اور خوست آنے والی ہے۔ اگر یہ راز افشا ہو گیا۔ تو بہت بدنامی ہوگی لہذا قیدیوں کا کام تمام کر دو۔ چونکہ یہ بیج تم نے بویا ہے۔ اس لئے تم اس کا پھل ضرور کھاؤ گے۔ بلکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ دوسرے قیدیوں سے بھی ناامیدی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

اس اثنا میں شاد آمین نے تجویز کیا کہ اس سے زنجیر کی آزادی "فوراً صلب کر لینی چاہیئے۔ اور ابھی سے اسے کاٹھ میں جکڑ دینا چاہیئے۔" خوست نے جاؤ کاٹھ لے آؤ تاکہ اسے فوراً پہنا دیا جائے"۔

یہ حکم ایسا تھا جس نے میری رہی سہی امیدوں کو بالکل منقطع اور میری سب کوششوں کو برباد کر دیا ہمارے بے رحمانہ قتل میں اگر کچھ حائل تھا۔ تو اس نے ہٹا دیا۔ میں نے بہت سوچ رکھا تھا لیکن کاٹھ سے آزادی کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہ آسکتی تھی۔ نپولین کا مقولہ ہے۔ کہ ناممکن کا لفظ بیوقوفوں کی لغت میں ملتا ہے اس کا کچھ ہی مطلب ہو لیکن میں یہ کہوں گا۔ کہ ایسی مشکلات انسان کو بکثرت پیش آتی ہیں۔ جن کا حل اس کی اپنی طاقت سے باہر ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے کلی ناامیدی اس کے دل میں نہیں پیدا ہوتی۔ اور وہ اپنے سے زبردست طاقت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ اگر یہ رجوع ایسی ہے۔ کہ دوسری جوانب سے بالکل اس کی امید منقطع ہے۔ اور اس نے سمجھ لیا ہے۔ کہ بیشک اللہ سب ممکنات پر قادر ہے۔ تو ضرور ہے۔ اس قادرِ مطلق کا جلال اس عُقدے کو حل کر دے یسو میں یہ کہوں گا۔ کہ انسان کے لئے کوئی امر ناممکن نہیں۔ یا تو وہ خود حل کر لیتا ہے۔ یا بواسطہ اللہ کے آسان ہو جاتا ہے۔ شاد آمین کے اس فقرہ کو سُن کر میں خاموش اپنی جگہ سے اٹھا۔ اپنی رہائی اور بچاؤ کے لئے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ اور ایک آہ سرد بھر کر نماز عشار کے لئے کھڑا ہو گیا۔ خدا جانے یہ آہ کیسی تھی۔ اور اس نے کس کس کے دل پر کیسا اثر کیا۔ کم از کم شاد آمین کے دوران تقریر میں میرے اس غیر متوقع طور پر اٹھ جانے سے اس کی ستم ایجاد

تقریر کا طوفان تھوڑی دیر کے لئے تھم گیا۔ اور میں جس بارگاہِ ایزدی میں کھڑا ہو گیا۔ اس سے واپس بلانا بھی باوجود ان کی اسدرجہ بربریت کے ان کیلئے مشکل تھا۔
خدا نہ کرے کہ ہمارے ناظرین کو اس قسم کا موقع ملا ہو یا ملے۔ لیکن میری اس عاجزی اور خلوصِ دل کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے عین موت کا یقینی قرب سمجھ کر ؏

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

خدا کے حضور میں پیشانی رگڑی ہو۔ اور گڑگڑائے ہوں۔ کیا میری عاجزی اور خشوع و خضوع اس درجہ تک تھا۔ کہ میرا خیال دنیاوی معاملات سے منقطع ہو کر صرف اللہ ہی کی جانب لگ جاتا۔ انہیں اوہام کو دور کرنے کے لئے باوجود سخت کوشش کے بھی میرا سلسلۂ خیالات منقطع نہ ہوتا۔ اور انتہائے یاس میں دامانِ خشوع و خضوع ہاتھ سے چھوٹا جاتا۔ ؏

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے،
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

نماز میں مقررہ تسبیح و دعا کی بجائے میں خداوند پاک سے یوں عرض کرنے لگ جاتا۔ کہ یا رحیم میں نے تیرے جلال اور تیری ذاتِ بابرکات کی قسم کھائی ہے کہ میں آج رات ضرور بھاگ نکلوں گا۔ یا الٰہی اپنے جلال اور اپنی رحمت کی عزت تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ تو ہر امر پہ قادر ہے۔ اگر آج رات کاٹھ سے بچ جاؤں۔ تو تیرے جلال کی قسم ضرور بھاگوں گا۔ خواہ یہ لوگ دیکھ ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ انہی

خیالات میں نماز پوری کی اور موت کے لئے تیار ہونے کے لئے مغفرت کے واسطے دو نفل پڑھے۔ اور اپنے گناہوں کو سامنے لاکر اللہ سے بخشش طلب کی۔ اس کے بعد بھاگنے میں مدد کے لئے دو نفل ادا کئے۔ اور اللہ کی درگاہ میں گڑگڑایا کہ یا اللہ تیرا وعدہ ہے۔ کہ تو اپنے بندوں کی دُعا کو رد نہیں کرتا۔ آج کا ٹھ سے بچائیو۔ میں یہ دُعا کر ہی رہا تھا۔ کہ خوتے نے بندوق لے کر میرے لئے کاٹھ لانے کو اٹھا۔ کاٹھ ابھی تک اسی پہاڑی پر پڑا تھا جہاں تلورام کو لگا کر دھوپ میں رکھا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ خوتے کی ماں نے کہا کہ بیٹا اس اندھیری رات خطرہ میں پڑنے کے لئے کیا تم ہی رہ گئے ہو۔ اتنی بھی کیا جلدی پڑی ہے۔ صبح لے آنا۔ خوتے بیٹھنے کو ہی تھا۔ کہ اس کی ڈائن صورت بھاوج بولی۔ کہ اس میں خطرہ ہی کیا ہے۔ میں لے آؤں گی۔ یہ سن کر خوتے نے پھر چلنے لگا۔ لیکن مہرماد ری نے اسے پھر روک لیا۔ اور نہ جانے دیا۔ ؎

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود

ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود

دیر تک میں مصلّے پر بیٹھا اپنی حالتِ زار پر غور کرتا رہا۔ وہ کون دوست تھا۔ جس سے خیال میں میں بغلگیر نہ ہوا۔ وہ کون عزیز تھا جس کی صورت آئینہ تصور میں دیکھ کر میں نے دو آنسو نہ ٹپکائے۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ میری نکمی زندگی کی ضرورت نہیں رہی۔ موت کا پیغام پہنچ گیا ہے میں دوستوں کی مجلس میں بیٹھنے کے لائق نہیں رہا۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے

ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

تھوڑی دیر اسی ناامیدی کی حالت میں رہ کر اٹھا۔ ایک آہ کھینچی۔ اور
خوتے نے کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ اللہ کی قدرتوں کا ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں کی مجلس
کا رنگ ہی بدل گیا۔ وہ جی کے ستانے والے اٹھ گئے۔ صرف خوتے نے ایلادار
اور مادرے بیٹھے تھے۔ میں پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ تو خوتے نے نے بازو سے پکڑ کر کہا
کہ اوپر چارپائی پر بیٹھو۔ میں نے جواب دیا۔ کہ ہم قیدی زمانے کے خوار۔ اس
لائق کہاں کہ چارپائیوں پر بیٹھیں لیکن اس نے نہ مانا۔ اور میرے اصرار کے
باوجود اپنے پاس چارپائی پر بٹھالیا۔ وہ کیا طاقت تھی جس نے ایک لمحہ میں اس
کے دل کو اتنا نرم کر دیا۔ میرے خون کا پیاسا میرے ساتھ محبت کی گفتگو کرنے
لگا۔ اس راز کو اللہ ہی سب سے بہتر جانتا ہے[۱]۔

اس وقت کتے بھونکنے لگے۔ اور معلوم ہوا کہ کوئی آ رہا ہے۔ خیال تھا
کہ ہماری مصیبتوں کو بڑھانے کے لئے وسیم گل اور معظم آ رہے ہوں گے۔ خوتے نے
دیکھنے کے لئے گیا۔ اور بہت ترش رو ہو کر واپس آیا کہنے لگا کہ قوم وزیر کے
چھ مسافر ایسے ناوقت آ گئے ہیں۔ ہمیں تو اس مہمان داری نے بہت تکلیف
دے رکھی ہے۔ وزیر فراریوں کو چاہیئے کہ اپنی قوم کے مہمان وہ خود سنبھالا کریں
پھر اپنی بھاوجہ سے کہا۔ کہ ایک روٹی پکالے اور خود دوسرے فراریوں سے
بچے کچھے ٹکڑے اکٹھے کر کے لے آیا۔ اس کی بھاوجہ روٹی پکانے لگی۔ اور
وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ چارپائیاں کھینچ کر ہمارے کل والے سونے کے مقام
پر کر دی گئیں۔ بلکہ معظم کے چھپر کے مغرب میں اور بھی شمال کو سرکا دی گئیں۔ اس

۱؎ میں آج تک بھی اس معمہ کو حل نہیں کر سکا۔ کہ خوتے نے کی میری طرف سے کدورت بھری طبیعت میں
یہ اچانک تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی۔

طرح خوسےنے کی دائم بیدار والدہ کی للچائی ہوئی دوربین نگاہوں سے قسمت کی یاوری نے ذرا اور بھی پرے کر دیا۔ خوسےنے اصرار کرنے لگا۔ کہ تم آج بھی چارپائی پہ سوؤ۔ لالہ سندرلال سے یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ چارپائی پہ ہرگز نہیں سونا۔ کیونکہ اس طرح ہلنے جُلنے سے آواز نکلتی تھی۔ میں نے بہت بہانے کئے اور بہت اصرار کیا۔ اور کہا کہ تمہارے چھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ کہ میں چارپائی پر سوؤں اور وہ زمین پر لیٹیں لیکن خدا جانے کیا راز تھا۔ کہ اس نے ایک نہ مانی۔ اور کہا مہمان کے لئے میسر ہو سکے یا نہ تم ضرور چارپائی پر سوؤ گے۔ بلکہ اتنا ہی مجبور کر کے چارپائی پر چٹائی بھی بچھوائی۔ مجبوراً مجھے ماننا پڑا۔ جو چارپائی مجھے دی گئی اس کی چولیں بہت ڈھیلی تھیں۔ اور ذرا ہلنے سے بہت آواز نکلتی تھی۔ خوسےنے کے اِدھر اُدھر پھرنے میں لالہ صاحب نے جھٹ وہ چارپائی کھسکا دوسری بدل دی اور چٹائی ڈال کر کہا لیٹ جاؤ۔ خوسےنے نے روٹی لے کر جانے سے پہلے دوسری زنجیر نکالی اور ایک دن پہلے جس طرح میں نے بتایا تھا۔ اسی ڈھنگ سے اپنی چارپائی کے بازو سے باندھ دی۔ اور آپ چلا گیا۔ لالہ سُندرلال بھی ایلاّدار کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیئے گئے۔ اور میری چارپائی کے ساتھ شمال کی طرف زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔

آج رات ہم بھاگنے پر تُلے ہوئے تھے۔ ہم نے خوسےنے اور ایلاّدار کے آنے سے پہلے ہی زنجیروں کو ایڑیوں سے نکال لیا۔ اور دو انگلی کا اشارہ دے دیا۔ مہمانوں سے فراغت پا کر خوسےنے اور ایلاّدار آئے۔ رائفلوں کو

تکیہ کی جگہ سر کے نیچے سنبھالا۔ کارتوسوں کے کمربند پائے سے آویزاں کیئے۔ ہماری زنجیروں کو جھٹکا دیا۔ اور لیٹ گئے۔ ؎

خدارا اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ
کہ با زنجیر پائے خود نہانی یک سخن دارم

کچھ بھنگ کا خمار کچھ لالہ پیر[1] کی مہمان نوازی میں شب بیداری۔ پھر اس کے پیغام کی وجہ سے سارا دن بیقراری کے باعث سونے کی فرصت نہ ملنا۔ پڑے اور پڑتے ہی خراٹے لینے لگے۔ میں نے لالہ صاحب کو ایک انگلی کا اشارہ دیا۔ جس کا جواب انہوں نے بھی ایک انگلی میں دیا یعنی ہمارے محافظ سو گئے۔ اب ہم ادگرد کی آہٹ لینے لگے۔ جب سب طرف سنسان ہوگیا۔ تو ہم نے دوسری زنجیروں کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ لالہ سندر لال کی دوسری زنجیر بہت پتلی تھی۔ وہ آسانی سے علیحدہ ہوگئی۔ اور انہوں نے مجھے اشارہ دے دیا۔ کہ وہ بالکل تیار ہیں لیکن میری دونوں زنجیروں کے پیچ آپس میں اس طرح اُلجھ گئے۔ کہ علیحدہ نہ ہو سکتے اس کوشش میں میرا سانس پھول گیا۔ آنکھوں کے سامنے تارے سے پھرنے لگے میرے پاؤں خوتنے کی چھاتی کے قریب تھے۔ زنجیر چھوٹی تھی۔ اور کھینچ نہیں سکتا تھا۔ اٹھا ہو کر پائنتی پر پہنچا۔ سر سے پاؤں تک چادر کو اوڑھ لیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے الجھنوں کو کھولنے کی کوشش کی مگر قسمت کے بل تھے نہ نکلے۔ اسی کشمکش میں زنجیر سے آواز نکلی۔ اور ساتھ ہی خوتنے اُٹھ بیٹھا۔ میں جہاں پائنتی پر سکڑا پڑا تھا

---

[1] خدا کی شان ہے کہ لالہ پیر جو کہ ہمارے قتل کا حکم لے کر آیا تھا۔ قدرت نے اس کی آمد کو ہی ہمارے جیل خانے میں سہولت پیدا کرنے کا باعث بنا دیا۔ ؎
فلک شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

وہیں سرد ہو گیا۔ کہ دیکھئے قسمت کیا رنگ دکھاتی ہے۔ خون سارا دماغ کو چڑھ گیا۔ ہاتھ جو زنجیر پر پڑا تھا اسے وہیں مضبوط کر لیا۔ تاکہ زنجیر کھینچنے سے یہ شک نہ ہو کہ پاؤں سے اترا ہوا ہے۔ خوت نے نے آنکھیں ملیں مجھے چارپائی پر دیکھا۔ زنجیر کو جھٹکا دیا۔ اور پھر لیٹ گیا۔ اب آہستہ آہستہ پھر اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی جس سے مجھے یقین ہوا کہ یہ بناوٹی نیند نہیں۔ میں نے کچھ دیر میں اپنے دل کو سنبھالا۔ اور اپنی بیقراری کو ٹھنڈا کیا۔ پھر ایسے اطمینان سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوں۔ ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر اطمینانِ قلب سے پیچوں کو کھولنے لگا۔ اللہ کی عنایت سے پیچ نکل گئے اور زنجیر اتر گئی۔ میں نہایت خوش ہوا۔ اور لیٹ کر لالہ سندر لال کو اشارہ دیا۔ دیکھا تو وہ مرے پڑے ہیں۔ اللہ غنی نیند کا یہ غلبہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ کہ خنجر تلے کسی کو نیند آگئی ہو۔ موت سرہانے کھڑی منڈلا رہی ہے۔ اور آپ گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تیاری کا اشارہ تو پہلے ہی کر دیا تھا۔ میں نے بھی اپنی زنجیر ٹانگ کے گرد لپیٹی۔ اور دوسری ٹانگ کی دھجیاں اتار کر اس کو اوپر سے خوب باندھ لیا۔ تاکہ آواز نہ نکلے۔ اور کروٹ لے کر چمگادڑ کی طرح چارپائی سے لٹک کر لالہ صاحب کے پاس آ رہا اور ایک گھونسا لالہ صاحب کے منہ پر رسید کیا۔ مجھے پہلے تجربوں سے یقین تھا۔ کہ میرے گھونسے پر وہ چلا نہ اٹھیں گے۔ بلکہ جاگتے ہی مطلب سمجھ جائینگے چنانچہ جاگتے ہی انہوں نے بھاگنے کا اشارہ دیا۔ اور اشارہ ملنے کے ساتھ ہی ہم زمین پر کروٹیں لینے لگے۔ لالہ سندر لال نے چپلیاں قابو میں کر لیں۔ اور روٹی کا چارج بھی انہی کو دے رکھا تھا۔ جو چادر میں بندھی پڑی تھی۔ وہ بھی لے لی۔
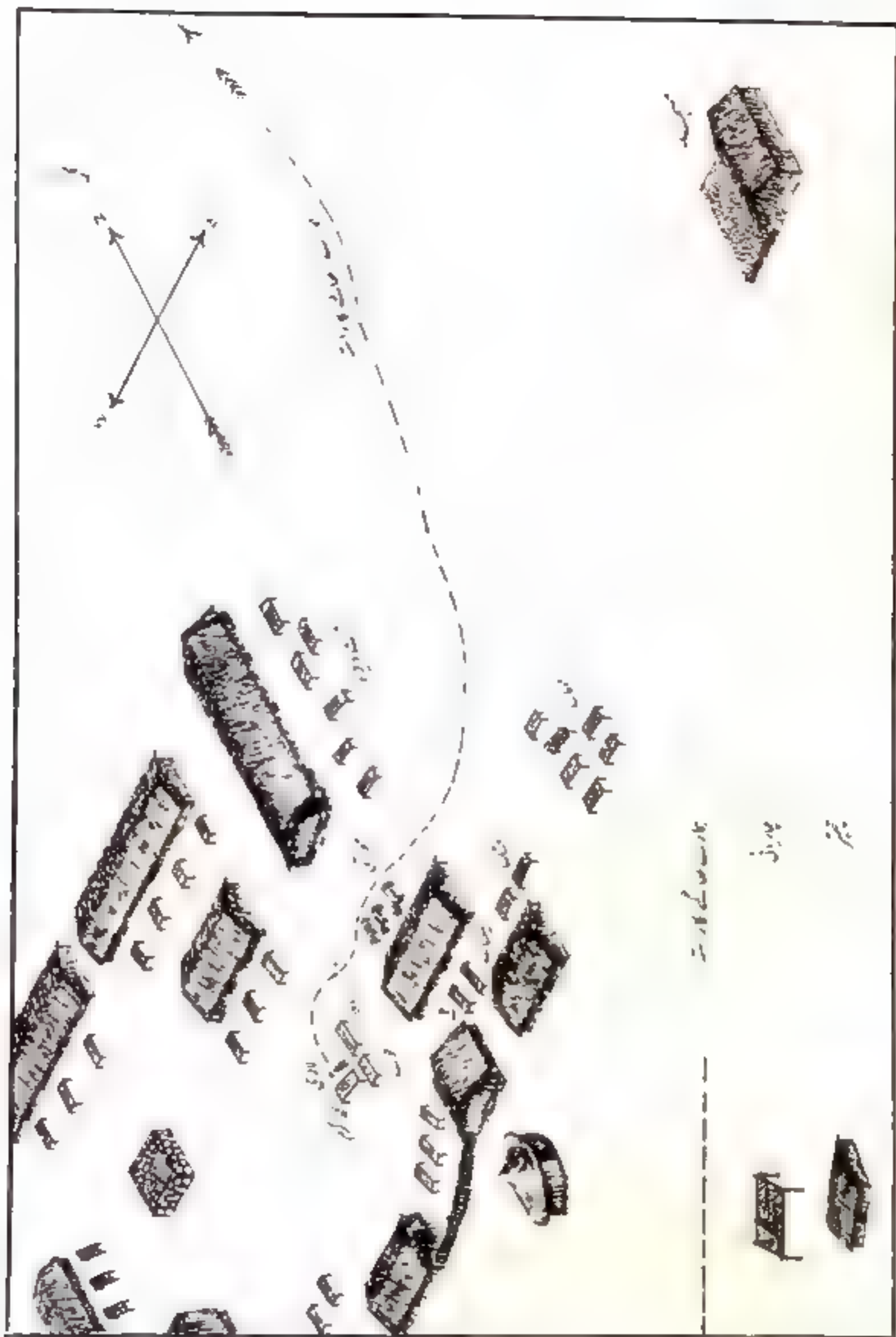
زمین پر کروٹ نہایت آہستگی اور چالاکی سے لیتے گئے کیونکہ ذرا سی
آہٹ کتوں کو چوکنا کر دیتی۔ ساری ساری راتیں جاگ کر کتوں کا مجھے اچھا تجربہ
ہو گیا تھا۔ وہ جو بھونکنے پر آتے تو گھنٹہ گھنٹہ بھونکتے رہتے۔ اور جو چُپ ہوتے
تو آدھ آدھ گھنٹہ پتہ ہی نہ تھا کہ یہاں کوئی کُتا بھی ہے۔ چنانچہ میں نے بھاگتے وقت
اس امر کا لحاظ رکھ لیا تھا۔ کہ کتے بھونک کر کب چُپ ہوئے۔ کروٹیں لیتے
لیتے ہم وسیم گل والے چھپر کے شمال کی طرف پہنچ گئے۔ وہاں مویشی بندھے کھڑے
تھے۔ ان کے درمیان ہمیں چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنے کا موقع مل گیا اس کے
بعد دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اور جسم کو جھولے کی طرح جھلاتے جھلاتے چلنا شروع
کیا۔ اس حالت میں میں بہت تیز نکل گیا۔ ہمیں مہمانوں کے قریب سے ہو کر
گذرنا پڑا۔ حالانکہ ان کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بہت جلد پہاڑی سے
نیچے اتر گیا۔ اور تھوڑی دیر میں لالہ صاحب بھی آ ملے۔ یہاں سے ہم نے پہاڑی
کے دامن کے ساتھ ساتھ ایک نالی میں بھاگنا شروع کیا۔ حتےٰ کہ ہم اس چشمے
تک پہنچ گئے۔ جہاں سے عورتیں پانی لایا کرتی تھیں۔ چونکہ یہ جگہ میری دیکھی بھالی
تھی۔ اس لئے چشمے کی بلند کچی دیوار پر چڑھنے کے لئے فوراً راستہ مل گیا۔ اور
ہم کیتی نالہ کی تہ میں ہو لئے۔ نالے کے پتھروں پر ہمارے نرم پاؤں بہت کم آواز
دیتے لیکن جب نالے کے پانی تک پہنچے تو بغیر آواز نکلنے کے پار ہونا مشکل تھا
ہم آہستہ آہستہ پاؤں نکال کر رکھتے رکھتے پانی عبور کر گئے۔ اور ایک چھوٹی سی
پہاڑی کے گرد چکر لگا کر اس درہ میں داخل ہوئے جسے دُور سے حسرت کے
ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ اس درہ کے دونوں طرف بہت بلند گھاٹیاں تھیں۔

ایک چوتھائی میل تک اس میں بھی دوڑے گئے۔ میرے دل میں یہ خوف سمایا ہوا تھا۔ کہ اژدھا نگیے چند قدموں کے فاصلے پر آرہا ہے۔ اور ابھی اس نے ہمیں آلیا۔ اس درّہ میں چلنا خطرناک خیال کیا۔ اور سیدھا جنوب والی گھاٹی کے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ خوف سے ہمارے حلق خشک ہو رہے تھے۔ اور اس پہاڑی پر درختوں کی خشک شاخیں۔ کانٹے اور نوکدار پتھر اتنے تھے۔ کہ پہلی دوڑ میں ہی میرے پاؤں زخمی ہو گئے۔ ؏

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ہم اس پہاڑی کی نصف بلندی تک پہنچے ہوں گے کہ کتوں کے بھونکنے اور شور و غوغا کی آواز نے ہمیں لرزا دیا تھوڑی اوپر جا کر جو دیکھا۔ تو سارا گاؤں آگ کے شعلوں سے روشن نظر آیا۔ جن میں سے کچھ شعلے اِدھر اُدھر حرکت کرتے تھے۔ اس نظارے کی ہیبت کے اثر سے ہم نے ایک ہلّہ کیا اور پہاڑی کے سر پر پہنچ گئے۔ یہ وہ مقام تھا۔ جسے دیکھ کر ہم کہا کرتے تھے۔ کہ اگر دن کو بھی یہاں تک ہم پوشیدہ پہنچ جائیں۔ تو پھر کسی کے قابو میں نہیں آسکیں گے۔ یہاں پر ہم نے چلتے پھرتے شعلوں کا بغور مطالعہ کیا۔ کہ کدھر کدھر جاتے ہیں۔ اور اپنے قفس پر ایک آخری نظر ڈالی۔

قدرت نے انسانی محسوسات کو ایک ہی بنیاد پر رکھا ہے۔ خواہ بعض میں کم اور بعض میں زیادہ ہوں۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر ایک ہی خیال ہم دونوں کے دل میں پیدا ہوا۔ جسے میں نے تو دبا لیا۔ لیکن لالہ صاحب نے اس کا اظہار کر دیا

رات سخت اندھیری تھی جس پہاڑ پر ہم چڑھے تھے۔ اس کی دوسری جانب ایک گہری کھڈ تھی۔ اس کھڈ کے پار ایک بہت بلند پہاڑ کھڑا دیو کی طرح ڈرا رہا تھا۔ ہمیں راستہ میں پانی کا دستیاب ہونا ایک امرِ موہوم تھا۔ اور خوف مزاس سے پیاس کا یہ عالم تھا۔ کہ حلق کی خشکی کے باعث دم ابھی سے رُک رُک کر نکل رہا تھا۔ ادھر تو یہ تکلیف تھی۔ اور اُدھر شور و غوغا دم بدم بڑھ رہا تھا۔ بلکہ ساتھ والے گاؤں بھی روشن ہونے لگے تھے۔ جس سے یہ خیال کرنا بیجا نہ تھا۔ کہ شاید ہم جلدی پکڑ لئے جائیں ان خیالات اور واقعات نے ہم دونوں پر ایک جیسا اثر کیا۔ یعنی ہماری گذشتہ تکالیف اور مصائب ان پیش افتادہ ہیبتناک حالات کے مقابل آسان معلوم ہونے لگے۔ اور کوئی طاقت مجبور کرتی۔ کہ ہم پھر لوٹ کر ان کے قدموں پر جا گریں۔ چنانچہ لالہ صاحب نے فرمایا۔ بابو صاحب ہم نے غلطی کی کہ بھاگ آئے۔ ہم کہاں جا ئیں۔ ابھی سے تھک کر چور ہو گئے۔ چلو ان کے پاس چلیں اور معذرت کریں کہ ہم اپنی حرکت پر پشیمان ہو کر واپس آپ کے پاس آ گئے ہیں۔ اب جس طرح آپ لوگوں کی مرضی ہمیں سزا دو۔ بعینہٖ اسی نوعیت کے جذبات میرے دل میں بھی پیدا ہو رہے تھے۔ اور لالہ جی کے اظہار نے انہیں اور ابھارا۔ اور میں بھی ان کا ہمنوا ہونے ہی کو تھا لیکن میں فوراً سنبھلا اور نہایت دل بڑھانے والے الفاظ میں لالہ صاحب سے کہا۔ کہ دیکھو ہمارا مرنا یقینی ہے۔ خواہ ہم انکے ہاتھوں نہایت بیرحمی اور بے عزتی سے تلف کئے جائیں خواہ راستہ میں کسی پہاڑ سے گر کر مر جائیں۔ خواہ بھوک پیاس سے سر پٹکتے کہیں ہمیشہ کے لئے سو رہیں۔ سو میں ان کے ہاتھوں سے مارے جانے پر راستے کی موت کو ترجیح دیتا ہوں

کیونکہ اس میں یہ بھی امکان ہے۔ کہ شاید ہم کامیاب ہو کر اپنے درمند عزیزوں سے جا ملیں۔ ؏

جا ملیں پھر سینہ چاکان وطن سے سینہ چاک

میری اس تقریر سے ان کی بھی تشفی ہوئی۔ اور وطن کی یاد نے ایک نئی روح پیدا کر دی۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ ہمارے سخت خطرہ کا وقت گذر گیا ہے رات ابھی بہت پڑی ہے۔ اگر کوئی ہمارے بالکل پاس بھی پہنچ جائے۔ اور ہم صرف زمین پر لیٹ ہی جائیں تو بھی ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ ذرا دم لے لو۔ اور پھر آہستہ آہستہ میرے پیچھے ہو لینا۔ کیونکہ اب بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ہم بیٹھ گئے۔ اس وقت لالہ صاحب کے پاس مفصلہ ذیل اشیاء تھیں۔ (۱) سیاہ رنگ کی چھوٹی سی پگڑی۔ (۲) قمیص۔ (۳) چادر۔ (۴) پاجامہ۔ (۵) چپلی (۶) ایک پاؤں والی زنجیر۔ میرے پاس۔ (۱) کلاہ۔ (۲) چادر۔ (۳) قمیص (۴) پاجامہ (۵) تسبیح۔ (۶) پانسورہ۔ (۷) والد بزرگوار کا خط۔ (۸) ایک پاؤں میں زنجیر۔

میں نے اپنی چادر کو پھاڑا کچھ ٹکڑے زنجیر پر کس کر باندھے کیونکہ وہ لگ لگ کر پاؤں کو زخمی کر رہی تھی۔ اور باقی کو اپنے پاؤں کے گرد خوب لپیٹا قطب کی طرف دیکھا بھالا اور خدا کا نام لے کر قدم اٹھائے اور وہاں سے چل دئے۔

ہمتم بدرقۂ راہ کن اے طائر قدس

کہ دراز ست رہ مقصد و من نو سفرم

یہاں سے ہم نے سیدھا شمال کی جانب رُخ کیا۔ تاریکی کی وجہ سے چڑھائی کی نسبت اترائی زیادہ مشکل تھی۔ اس پہاڑی پر سے مشرق کیجانب ایک بلند کوہ

آسمان سے باتیں کرتا رات کی تاریکی میں دیو کی طرح نظر آتا لیکن فاصلے کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ان پہاڑوں کے درمیان ایک گہری کھڈ تھی۔ جس کی گہرائی کا اندازہ تاریکی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیئے ہم نے کھڈ میں اترنا شروع کیا۔ لیکن بہت نیچے اُتر کر اس تک پہنچنا محال معلوم ہوا۔ اسلیئے اسی سلامی پر شمال مشرق کا رُخ کیا۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ اور سانس بدن میں نہیں سماتے تھے۔ خیالی شکلیں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگی چلی آرہی تھیں اور ہر قدم ہمارا پہلے سے زیادہ تیز اور گھبرایا ہوا اُٹھتا تھا۔ ع

شب تاریک درہِ وادئ ایمن درپیش
آتش طور کجا جلوۂ دیدار کجاست

باوجود سخت احتیاط کے پتھر ہمارے پاؤں سے لڑھک کر نیچے گرتے جن کی آواز ہم اپنے لئے پیغامِ اجل سمجھتے۔ میرے پاؤں سے کپڑا اُتر گیا۔ زنجیر ڈھیلی ہو گئی۔ اور دائیں پاؤں کے ٹخنے پر لگ لگ کر زخمی کرنے لگی۔ گرگرے کی خار دار شاخوں پر ننگے پاؤں پڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں کچھ اندازہ نہیں لگ سکتا۔ کہ ہم کتنی دور نکل آئے۔ کہ یکایک ہمارا راستہ ایک گہرے غار نے روک لیا۔ جو بہت دُور تک چلا گیا تھا۔ اس میں اترنے کے لئے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک پگڈنڈی اس کے کنارے پر نظر آئی۔ ہم اسی پر ہو لئے نصف میل چل کر یہ راستہ نہایت صاف نظر آنے لگا۔ اور دونوں طرف کی بلند پہاڑیوں کے درمیان باراتی پانی نے جو اپنا راستہ بنایا ہوا ہے۔ اسی میں یہ پگڈنڈی چلی گئی۔ یہ جگہ نہایت سرسبز تھی۔ اور راستہ بالکل سفید اور گھاس سے پاک ہونیکی

وجہ سے ضرور تھا کہ اس پر عام آمد و رفت جاری ہے۔ اس راستے چلتے چلتے ہم اپنے اصول کو بھول گئے۔ جو ایسے راستوں پر چلنے کے لئے پہلے سے تجویز کر رکھا تھا۔ اس لئے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ عین اس وقت جب ہم ایک پہاڑی کے گرد چکر لگا کر مڑے تو کتے یکایک چونک پڑے۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے اور ہم دمِ آخریں کی طرح رُک کر رہ گئے۔ مزید براں ہمارے سامنے آگ کے شعلے[1] نمودار ہوئے جس سے آبادی کا پتہ ملتا تھا۔ ہماری مصیبت کو انتہا تک پہنچانے کے لئے یہی کافی نہ تھا۔ بلکہ ہمارے دائیں جانب والی پہاڑیوں کی چوٹیوں سے صبح کا روشن ستارہ ہم پر روشنی کی تلوار کھینچے ہوئے نکلا کتنی مصیبتیں یکایک ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ آگے پیچھے دائیں بائیں سب موت ہی موت نظر آنے لگی۔ اگر سہارا تھا۔ تو صرف اس ذاتِ پاک کا۔ اس پہ یہ ستم ہوا کہ لالہ صاحب کو طاقتِ رفتار جواب دے گئی۔ میں نے ان سے مشورہ کرنا چاہا تو بالکل مخبوط الحواس پایا۔ لالہ صاحب سے میں نے دریافت کیا۔ کہ جنوب[2] اور مغرب کی طرف تو ہمارے دشمنوں کی فوجیں چڑھی ہوئی ہیں۔ سامنے شمال[3] میں موت ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ اگر ہمت کرو تو اس مشرق والی پہاڑی پر چڑھ جائیں لالہ صاحب نے پہاڑی کی چوٹی کی طرف نظر کی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا جدھر مرضی ہے چلو یہ پہاڑ گرگرے کے زمین سے ملے ہوئے درختوں اور عام جھاڑیوں سے ڈھنپا ہوا تھا۔ چڑھائی بہت سیدھی تھی۔ میں نے اپنی طاقت کو جمع کیا۔ اور طبیعت میں جوش پیدا کر کے حملہ سے اس پر چڑھنا شروع کیا۔ صبح کے ستارے نے

---

[1] ان شعلوں کی نسبت کوئی خاطر خواہ حل مجھے نہیں ملا کہ وہ کیا تھے اور کیوں تھے۔ [2] وزیریوں کی آمد کا خطرہ
[3] شمال میں کوئی بستی معلوم ہوئی۔

جو غالباً مشتری تھا۔ اپنی روشنی کے بھالوں کو ناکافی سمجھا۔ اور عمر رسیدہ خمیدہ پشت آخری رات کے مہمان چاند کو کمک کے لئے تکلیف دی۔ وہ اپنی کمان سے روشنی کے تیر پھینکتا ہوا ستارہ سے نصف گز کے فاصلے پر آموجود ہوا۔ اور ساتھ ہی صبح کاذب ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی میں اوپر چڑھ کر لالہ صاحب کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ لالہ صاحب پہنچے تو سہی لیکن بہت بُری حالت میں چہرہ ہلدی سا زرد۔ آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اور زور زور سے ہانپ رہے تھے۔ لالہ صاحب نے کہا کہ مجھ میں چلنے کی ہمت باقی نہیں رہی۔ ؏

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نہ بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

تم جاؤ اگر نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ۔ یہ لفظ نہایت مؤثر لہجہ میں ادا کئے گئے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ لالہ صاحب ہم پکڑے گئے تو اکٹھے۔ قید رہے تو اکٹھے۔ نکلے تو اکٹھے۔ اب مریں گے تو انشاء اللہ اکٹھے۔ ہم دونوں کی لاشیں ایک ہی جگہ تڑپتی ہوں گی۔ یہ ہرگز خیال نہ کرو۔ کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لالہ صاحب نے دریافت کیا۔ کہ ہم کتنا نکل آئے ہیں۔ میں نے ان کی تکان دُور کرنے کے خیال سے کہا۔ کہ ابھی ہم پانچ چھ میل ہی آئے ہیں۔ اور ممکن ہے وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے ہی لگے آ رہے ہوں۔ اگر آپ نہیں چل سکتے۔ تو آؤ اس درخت کے نیچے لیٹ جائیں۔ یا تو دھوپ اور پیاس نے کام تمام کر دیا۔ یا کوئی مویشی چراتا ہم تک پہنچ گیا۔ اور اگر زندگی ہے۔ اور شام تک کسی آفت نے نہ آلیا۔ تو انشاء اللہ رات کو نکل چلیں گے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ

خیال نہ کرنا کہ میں آپکو چھوڑ کر اکیلا نکل جاؤں گا۔ ؎

نہ یارے سست پیمان است سعدی
کہ در سختی کند یاری فراموش

میرے اس تسلی دینے پر لالہ صاحب جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اور چند منٹ کے بعد سانس درست کر کے فرمانے لگے کہ چلو بھاگ چلیں۔

اس وقت روشنی کچھ تیز ہو چکی تھی۔ اور خطرہ تھا کہ بستی والوں کے دل میں کتوں کے بھونکنے سے اگر کچھ شبہ پڑ گیا ہو۔ اور تفتیش کرنے لگیں۔ تو ضرور ہم ان کو نظر آجائیں گے۔ میں نے لالہ صاحب سے کہا کہ بالکل میرے قدموں پر چلے آئیں۔ اور اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ اور خود میں روشنی والی جگہ کی طرف سے درخت کی آڑ لیتا اور اوپر کی طرف دوسرے درخت کی جانب دوڑتا۔ اسی طرح پھر اس کی آڑ لے کر اور درخت کی طرف بھاگتا حتیٰ کہ ہم قریباً پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس وقت روشنی پھر مدہم پڑنے لگی۔ میں نے لالہ صاحب سے کہا خوب غور سے دیکھو ہمارا کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لالہ صاحب نے غور کرنے کے بعد کہا کہ ضرور ہمارے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ میں نے آگ اپنی طرف چلتی دیکھی ہے۔ میں نے پھر زور دیا کہ لالہ صاحب بھاگو وقت ہے۔ شاید بچ نکلیں۔ ساری رات پتھروں پر چلنے اور کانٹوں پر کودنے سے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ اور مجھے لالہ صاحب کی نصیحت چپلی کے متعلق یاد آرہی تھی۔ مجبور ہو کر میں نے لالہ صاحب سے درخواست کی کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے مجھے چپلیاں دیدیں۔ تو نہایت عنائت ہو گی۔ لالہ صاحب نے جھٹ چپلیاں اتار کر مجھے دے دیں۔ غرض ہم

پہاڑ کے سر پر پہنچ گئے۔ اس کی دوسری طرف پھر ہم کو ایک راستہ ملا۔ اس خطرہ
کے مقام سے جلدی نکل جانے کا خیال کر کے ہم اسی راستہ پر ہو لئے۔ تاریکی
پھر کچھ بڑھ گئی تھی لیکن اب دوبارہ روشنی ہونے لگی[1]۔ ہمارا راستہ ایک مدور
پہاڑی کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ یکایک ہماری رفتار ایک گڑگڑاہٹ کی آواز سے
رُک گئی۔ سامنے سے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی ہماری طرف بھاگا چلا آ رہا ہو
اور اس کے پاؤں سے پتھر لڑھک کر نیچے گر رہے ہوں۔ ہمارا خون ہمارے
دماغوں کو چڑھ گیا۔ اور ہم حواس باختہ ہو گئے۔ روشنی اتنی کافی نہیں تھی۔ کہ ہم
دُور سے دیکھ سکیں۔ پیچھے گاؤں والوں کا خوف۔ آگے دشمن کا اندیشہ بائیں طرف
پہاڑ کی بلندی۔ دائیں طرف کھڈ جس کے گرد راستہ چکر لگا رہا ہے۔ کریں تو کیا کریں
بھاگیں تو کہاں۔ چند لمحہ کی مہلت میں کہاں غائب ہو جائیں تین چار لمحہ کے
تردد کے بعد جھٹ ہم نے نیچے کا رُخ کیا۔ اور دس بارہ قدم کے فاصلے پر
ایک سوکھی ہوئی جھاڑی کے اندر جا گھسے۔ اس کی خاردار ٹہنیاں زمین سے
لگی ہوئی تھیں۔ میں جھٹ رینگ کر ان کے اندر ہو لیا۔ لالہ صاحب کانٹوں کی
پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کی شاخوں پر جانور کی طرح ہو بیٹھے۔ سانس ہمارے
سینوں میں نہ سماتے تھے۔ اور دھڑکتے دلوں سے آنیوالی آفت کا انتظار
کر رہے تھے۔ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے لیکن کچھ نظر نہ آتا۔ پاؤں کی آہٹ
سے معلوم ہوتا کہ کوئی کھڈ میں اتر رہا ہے۔ جب روشنی ذرا تیز ہو گئی۔ تو کھڈ کے
تحت الثرا ے میں جھاڑیاں نظر آنے لگیں۔ خیالی شکلیں ان جھاڑیوں کو تلاش

---

[1] صبح صادق اور صبح کاذب کا جو نظارہ ہم نے وہاں مشاہدہ کیا۔ وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ گویا یہ اسی جگہ یا اسی وقت کے لئے مخصوص تھا۔

کرتی دکھائی دینے لگیں۔ سفید پتھر آدمی معلوم ہونے لگے۔ اس اثنا میں لالہ صاحب پر کھانسی نے آزور دیا۔ وہ ہزار روکتے اور جان کے خوف سے گلا گھونٹتے لیکن کھانسی بند نہ ہوتی۔ اپنے دامن سے تمباکو کھول کر انہوں نے ایک خوراک مُنہ میں رکھ لی۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک ہرنی اپنے بچوں سمیت جھاڑیوں میں سیر کر رہی ہے۔ جسے ہم دشمن سمجھتے تھے۔ وہ وحشت میں ہماری آشنا نکلی جس کی آہٹ سے ڈر لگتا تھا۔ لالہ صاحب نے اسے نیک شگون تصور کیا۔ تاہم اس کمین گاہ سے باہر نکلنا ابھی خلافِ مصلحت تھا۔ ہمارے چاروں طرف کانٹے نوکیں نکالے کھڑے تھے۔ میرا سر میرے زانوؤں میں گھُسا ہوا تھا۔ اور ہم بالکل حرکت نہیں کر سکتے تھے بمشکل تمام وہیں پیشاب کی حاجت رفع کی۔ اور تیمم کر کے سر کے اشاروں سے زانو پر سجدے کرتے ہوئے نمازِ فجر ادا کی۔ پھر اپنی جیب سے اپنے دوست شاد آمین کا پنجسورہ نکال کر تلاوت کی اتنے میں سورج کی کرنوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو سنہری تاج پہنا دیا۔ دن کی روشنی سے دشمنوں کا خوف ہم پر غالب ہونے لگا۔ میری یہ مرضی تھی کہ دن وہیں کسی طرح گذاریں لیکن لالہ صاحب نے فرمایا۔ کہ یہ جگہ راستہ کے بالکل قریب ہے۔ بہتر ہے کھڈ میں اتر کر کہیں چھپ جائیں۔ غرض کہ کھڈ میں اس ترکیب سے ہم اترے کہ ہم میں سے ایک راستے کی طرف دیکھتا رہتا۔ اور دوسرا نیچے اترتا۔ پھر وہ درخت میں چھُپ کر راستے کی طرف دیکھتا اور پہلا نیچے اترتا۔ اسی طرح ہم کھڈ میں بہت ہی نیچے اتر گئے۔ اور ایک پناہ کی جگہ لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ہم نہایت پریشانی کے عالم میں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر آزادی کے

خیالات نے میرے چہرے پر بشاشت پیدا کرنی شروع کی۔ اور وطن اور خویش و اقارب کی یاد میٹھے میٹھے احساسات کے ساتھ دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اپنی اس بیکسی اور تنہائی اور جنگل پہاڑوں کی وحشت سے دل بھر آیا۔ مگر میں اسوقت اپنے آپ کو آزاد سمجھتا تھا۔ امنگوں کی مردہ امید تازہ ہو کر گئی تھی۔ ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

اپنا غم غلط کرنے کے لئے ہم نے فراریوں کا تذکرہ شروع کیا ہمارے بعد ان کے گاؤں میں کیا کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ان کی عادات کے مطابق علیحدہ علیحدہ آدمیوں کی نقلیں ہم نے اتاریں۔ ہمیں یقین تھا کہ پہلا خیال ان کے دل میں یہی گذرا ہو گا۔ کہ ہم گردونواح کیتی نالا کی جھاڑیوں میں چھپ گئے ہونگے سو ایک گروہ آگ روشن کر کے ہماری تلاش میں ان جھاڑیوں کی چھان بین کر رہا ہوگا۔ باقی بڑے بڑے فراری اس راستے کی جانب بھاگے ہونگے۔ جس سے ہم کو لائے تھے۔ اور چند ایک فراری شاید ہمارے تعاقب میں اس طرف بھی آئے ہوں گے۔ خونے کی والدہ کے دل پر سخت صدمہ گذرا ہو گا او۔ وہ ہمہ تن چشم بن کر راستہ کو دیکھ رہی ہوگی۔ کسی مسافر کو دور سے دیکھ کر اس کے دل میں یقین ہو جاتا ہو گا۔ کہ وہ بالو اور ٹھیکہ دار کو پکڑ لائے۔ اور یہ خبر آناً فاناً بجلی کی طرح سارے گاؤں میں اثر کر جاتی ہوگی۔ اور دیکھنے کے لئے ساری عورتیں جمع ہو جاتی ہوں گی۔ لیکن ان کی مایوسی کی کوئی حد نہ ہتی ہوگی۔ جب ان کو معلوم ہوتا ہو گا کہ کوئی اور ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ صبح کے وقت بہت سے لوگ

واپس آئے ہوں گے۔ اس خیال سے کہ غالباً کسی گروہ نے ہمیں پکڑ لیا ہوگا اور ناامیدی کی خبر سنتے ہی پھر بھاگ نکلے ہوں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری کے لئے تین چار گاؤں گھربار چھوڑ پہاڑوں میں ٹکریں مار رہے ہونگے اس وقت لالہ صاحب نے خوش نصیبی کی ماں کا جو پارٹ ادا کیا۔ وہ انہی کا حصہ تھا۔ ہمارے چہرے ان باتوں سے بشاش ہو گئے۔ اور ہم میں نئی روح آنے لگی۔ میرے دل میں جوش پیدا ہوا۔ اور میں نے زنجیر کو دوسرے پاؤں سے بھی نکالنا شروع کیا۔ لالہ صاحب مانع ہوئے کہ آواز پیدا ہوتی ہے لیکن میں نے ایک نہ سُنی۔ اور تعجب ہے کہ وہ زنجیر جن کو ہتھیاروں کے ساتھ کھولنے کے لئے فراریوں کو آدھ گھنٹہ سے زیادہ وقت لگتا۔ میں نے دس منٹ میں اتار کر پھینک دی۔ اس سے فارغ ہو کر لالہ صاحب کی طرف مشغول ہوا۔ اور ان کی زنجیر کو بھی اتار کر جدا کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ زنجیریں اتار کر بطور یادگار ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھوں گا۔ لیکن لالہ صاحب نے کہا کہ اگر خدانخواستہ راستہ میں ہم پھر کسی کے ہاتھ پڑ گئے۔ اور اس نے دیکھا کہ ان زنجیروں کو توڑ کر ہم بھاگیں ہیں۔ تو خدا جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ سو بہتر ہے کہ ان کو خیرباد کہی جائے۔ لہٰذا انہی دھجیوں میں لپیٹ کر جو ان پر لپٹی ہوئی تھیں ان کی تجہیز و تکفین کی گئی۔ اور باقاعدہ طور پر ایک گڑھا کھود کر ان کو وہیں دفن کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

سورج زیادہ چڑھ جانے پر لالہ صاحب نے یہاں بیٹھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اور ہم دونوں کھڈ کی دوسری طرف تھوڑا اوپر چڑھ کر درختوں کے ایک

جھاڑیں جا چھپے۔ یہاں کی حالت یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ درخت کی شاخیں زمین تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اور خشک خاردار ٹہنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کانٹوں پر ہم اس طرح پڑے تھے کہ ذرا بھی حرکت کرنے پر سینکڑوں کانٹے ہر طرف سے جواب دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بالکل بے حس وحرکت پڑے رہے۔ لیکن قسمت میں لیٹنا کہاں لکھا تھا۔ پیاس کی شدت بڑھ گئی۔ اور تھوڑی دیر میں ہم العطش العطش پکارنے لگے۔ ؎

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

لالہ صاحب چونکہ مجھ سے زیادہ بدحال تھے۔ اس لئے پانی لانے کا قرعہ میرے نام پڑا۔ جاتی دفعہ لالہ صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا۔ کہ دیکھو تم جاتے ہو اور روزِ روشن میں پکڑا جانا خدانہ کرے ممکن ہے۔ ایسی صورت میں قسم ہے تم ہرگز اپنے ساتھی کا پتہ نہ بتانا۔ جو ممکن ہے اگر ہم میں سے ایک بچ جائے تو شاید دوسرے کی مدد کر سکے۔ میں نے جواب میں لالہ صاحب کو تسلی دی۔ اور کہا کہ اگر میں پکڑا گیا تو میری جانب سے آپ نے کوئی اندیشہ دل میں نہ لانا۔ اور آپ کی منزلِ مقصود فلاں جانب کو ہوگی۔ اللہ کا نام لیکر اسی طرف چلتے جانا۔ ؎

دادیم ترا گنجِ مقصود نشان

گر ما نرسیدیم تو جائے برسی

اس وعدہ لینے کے بعد لالہ صاحب نے اپنی چپلیاں مجھے دیں۔ اور ہم ایک دوسرے سے وداع ہوئے۔ میں نے نیچے کا رُخ لیا۔ کیونکہ بلندی

کی طرف پانی کا ملنا تو محال تھا۔ کھڈ میں نیچے اور نیچے اترتا گیا۔ مڑ مڑ کر لالہ صاحب
کی جانب دیکھتا جاتا۔ وہ بھی میری پشت پر ٹکٹکی باندھے صورتِ بت بیٹھے تھے
حتیٰ کہ ہم ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ لالہ صاحب والی کھڈ مجھے
آسمان پر بلند نظر آنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ میرا راستہ نالے کی صورت اختیار
کرنے لگا۔ میرا رخ اسی طرف تھا جس طرف سے ہم جان بچا کر بھاگے تھے۔
اس نالے میں ہر طرف سے آکر اور نالے ملتے۔ اور اس کو وسیع بناتے جاتے
ہر تقاطع پر میں اپنے ذہن میں راستہ کی پہچان کے لیئے کوئی نشان مقرر کرتا جاتا
خدا جانے میں کتنے میل نکل آیا پیاس سے زبان سوکھے چمڑے کی طرح ہو گئی۔
اس نالے کے دونوں جانب بلند بلند پہاڑ تھے جن کی چوٹیوں پر میری بیتاب
نگاہوں کے سامنے ذاریوں کی شکلیں نمودار ہوتیں۔ اور ہیبت سے ہر گھڑی کئی
اٹھتے اور کئی مداخیل پیدا ہو ہو کر غائب ہوتے جاتے۔ بایں ہمہ عقلِ حیوانی یہ بھی جانتی
تھی۔ کہ واپسی بھی یقینی ہلاکت ہے۔ کیونکہ خدا جانے کتنی چڑھائی چڑھ کر اور
کتنا دوسری طرف اتر کر پانی ملے گا۔ عقل حیوانی اس وقت عقلِ انسانی پر غالب تھی
اور پتھروں پر سے کودتا اڑا جا رہا تھا۔ نالے کے دونوں طرف کائی کے آثار
نمودار ہوئے۔ ایک جگہ وسط میں کچھ راکھ ملی جس سے کسی مسافر کی شب گذاری
کا گمان ہوتا تھا۔ بے تحاشا بھاگتے بھاگتے پہاڑیوں کے گرد گھومتے گھومتے
پُر آب آنکھوں کی روح زمین کچھ نمدار معلوم ہوئی تھوڑی دور آگے جا کر میری
خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے ایک چشمہ دو ڈھائی فٹ مربع کا پایا۔ اس
کا پانی ذرا گرم تھا۔ اور اس پر سبز جالا آیا ہوا تھا۔ میں نے اسے آبِ حیات

سمجھا۔اور سیر ہو کر پیا۔ پھر میں نے کپڑے اتار کر غسل کیا۔ اور قمیص اور پاجامے کو تر کر لیا۔ بعد اس کے جالا اور کیچڑ لے کر اپنی کلاہ میں پلستر لگایا۔ اور پانی سے بھر کر اور اپنا پیٹ پھر سیر کر کے واپس بھاگا۔ میں اس خیال سے دل میں خوش ہو رہا تھا۔ کہ اپنے دوست کے پاس انشاء اللہ سرخرو ہو کر پہنچونگا۔ قریب ایک میل کے واپس آکر مجھے ایک اور چشمہ دستیاب ہوا۔ جو میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ آیا آتی دفعہ نظر سے اوجھل رہا تھا۔ یا میں کسی دوسرے راستے ہو لیا ۔ یہاں میں نے پھر غسل کیا۔ پانی پیا اور کلاہ کو بھر کر پھر روانہ ہوا۔ یہ نالہ جہاں پہاڑوں کی بلندی پر سے اترتا تھا وہاں بڑی بڑی ضخامت کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور میں ایک پتھر سے دوسرے پر کودتا چلا جا رہا تھا۔ دائیں پاؤں کی چپلی مجھے بہت تکلیف دیتی تھی۔ بڑی ہونے کی وجہ سے پاؤں کے نیچے دہری ہو جاتی۔ اسلئے کبھی اتار لیتا اور کبھی پہن لیتا۔ اس وقت میں اپنے خیال میں بالکل ٹھیک راستہ پر جا رہا تھا۔ ہر موڑ پر غور کرتا اور ہر مقررہ پتھر کو جانچتا لیکن پتھروں کی شناخت کیا ہو سکتی تھی۔ کھڈ اور پہاڑیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ کافی دور جا کر مجھے احتمال ہوا کہ کہیں راستہ بھول تو نہیں گیا۔ غرض جب اپنے اندازے کے موافق میں اس جگہ پر پہنچا۔ جہاں لالہ صاحب کو ہونا چاہیئے تھا۔ اور اپنے آپکو کسی اور پہاڑی پر پایا تو نہایت بیتاب ہوا۔ کلاہ سے پانی ٹپک ٹپک کر تھوڑا سا چلو بھر رہ گیا تھا۔ دل سینے میں ایسا تڑپا کہ ابھی باہر نکل جائے۔ گھبرا کر میں نے بلند آواز سے لالہ صاحب کو پکارا۔ میری آواز پہاڑوں میں گونجتی ہوئی بہت دور تک چلی گئی لیکن سوائے اپنی آواز کی گونج کے کوئی اور جواب نہ آیا۔ ایک

درخت کی اوٹ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ کہ میری آواز بجائے آشنا کے کہیں دشمن کو تو نہیں بُلا لاتی ایک دو منٹ کے بعد پھر چلّایا لیکن وہی نتیجہ رہا۔ پھر شور کیا لیکن بے فائدہ۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ابھی میرا مقصود آگے ہے اس لئے آگے چل دیا۔ کھڈ کے بائیں جانب خفیف سا نشان پگڈنڈی کا معلوم ہوا۔ یہی کھوج دبائے میں اُوپر اُوپر چڑھتا گیا تھوڑی دُور جا کر اپنے گم گشتہ کو ایک آواز دے لیتا۔ اور ہراساں ہو کر بھاگتا۔ اس وقت کی میرے دل کی حالت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اُدھر گم شدہ رفیق تنہا میری انتظار میں چشم براہ۔ اِدھر میں تنہا اس کی تلاش میں سرگرداں۔ ؏

مگر خضرِ مبارک پے تواند
کہ ایں تنہا بآں تنہا رساند

اسی اضطراب اور اضطرار کی حالت میں بلند ترین چوٹی پر پہنچ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں لالہ صاحب سے بہت دور نکل آیا۔ یاس و حرماں کی کوئی حد نہ رہی۔ پانی سارا قطرہ قطرہ گر کر ٹپک چکا تھا۔ پیاس شدت پر تھی۔ اور دھوپ کی سختی ناگفتہ بہ۔ کپڑے جو بھگو کر پہنے تھے خشک ہو چکے تھے قمیص اپنے سر پر دھوپ کے بچاؤ کے لئے ڈال رکھی تھی۔ میں نے کلاہ کی نمی کو زبان سے چوسا اور سر پہ رکھ لیا۔ یہاں کا نظارہ نہایت حسرت بھرا تھا۔ اپنے پیارے ساتھی کی جدائی نہایت شاق گذر رہی تھی۔ تلاش ناممکن تھی۔ دھوپ سے کام تمام ہو رہا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ اس کے دونوں جانب نظر میلوں تک کام کرتی تھی۔ پیچھے کی طرف دُور و دراز ایک میدان سبز دھبہ کی طرح پہاڑوں کے

درمیان نظر آرہا تھا۔ اور آگے کی جانب ایک لامتناہی سلسلہ کوہ نیچے اور نیچے چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کھڑا ہو کر میں نے سوچنا شروع کیا۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ ممکن ہے لالہ صاحب مجھے غدار سمجھیں۔ کہ کمزور سمجھ کر چھپیاں لیکر غائب ہو گیا ہے لیکن یہ خیال ان کے دل میں کیسے آسکتا تھا۔ جبکہ پانی کے لئے میں میلوں واپس موت کے مُنہ کی طرف گیا۔ یہ خیال ان کے دل میں تب گذرتا کہ میں آگے کی طرف جاتا۔ دوسرے میرا پہلا سلوک ان کے دل میں کبھی ایسا گمان نہ آنے دے گا۔ ممکن ہے کہ لالہ صاحب نے میرے دیر کرنے کا سبب میرا پکڑا جانا خیال کیا ہو۔ اور اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ اور اگر میری آواز ان تک پہنچی بھی ہو تو اسی خیال سے خاموش ہو رہے ہوں کہ کہیں کوئی دشمن بھی میرے ہمراہ نہ ہو۔ آہ بالکل ممکن ہے کہ خوابِ غفلت میں ہی چلے گئے ہوں۔ یا شدتِ پیاس سے بھاگ ہی نکلے ہوں۔ ان خیالات نے مجھے پریشان کر دیا۔ اپنی تنہائی بہت بُری محسوس ہونے لگی۔ سورج کی تپش نے کڑک کر آواز دی۔ کہ ہاں بڑھے چلو۔ ان نچلی پہاڑیوں پر جنہوں نے میرے آخری ہمراز و غمخوار کو چھپا لیا ہے۔ اور اس سبز دھبے پر جس کو اپنی قید گاہ ہونے کا امکان خیال کرتا تھا۔ ایک آخری حسرت بھری نظر ڈالی اور اللہ بہتر کا نام لے کر اُتر پڑا۔ افسوس ہماری لاشیں بھی ایک جگہ نہ ملیں گی۔

میری رفتار اس وقت بہت تیز تھی۔ ایک تو اُترائی دوسرا روزِ روشن تیسرا اپنا چلانا اور شور کرنا۔ خیال کر کے دل خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کھڈ میں بھی آمد و رفت کے نشان پائے جاتے تھے۔ پیاس بہت تنگ کرنے لگی لیکن

مجھے یقین تھا کہ اسی کیوں پر جا کر جہاں دوسری جانب پانی ملا تھا۔ اس طرف بھی ضرور ملے گا حتیٰ کہ میں بہت نیچے اتر گیا۔ لیکن پانی کا کوئی نشان دستیاب نہ ہوا۔ بعض بعض جگہ راستہ سے پھوٹ کر ایک پگڈنڈی مجھے ایسے گڑھوں کے سر پر لے جاتی جو کسی موسم میں ضرور چشمۂ آب ہوتے ہوں گے۔ ان کو دیکھ کر ڈھارس بندھتی کہ ضرور کوئی چشمہ قریب مل جائے گا۔ یہ عین نصف النہار کا وقت تھا۔ اس ساری اترائی اترنے میں قریب دو یا ڈیڑھ گھنٹہ کا عرصہ صرف ہوا۔ میں سوچتا جا رہا تھا کہ اس کھڈ کا بارانی پانی ضرور کسی دریا میں جاتا ہوگا۔ جو غالباً قرم ہوگا۔ یہ کھڈ ایک مسطح میدان میں جا کھلی جس میں زرد رنگ کی خشک گھاس نظر آئی۔ اور اس وادی کی زرخیزی دیکھ کر اس کے آباد ہونے کا گمان ہوتا۔ چنانچہ میرے خیال کی نگاہیں ایک غائبانہ آبادی کو ڈھونڈنے لگیں۔ اور ہر لحظہ یہی یقین ہوتا کہ میں ابھی کسی آباد گاؤں میں پہنچا کہ پہنچا حتیٰ کہ اس چھوٹے سے میدان کو میں نے بغیر کسی آبادی کے نشان پائے طے کر لیا۔ یہ پگڈنڈی اب ایک شارع نظر آنے لگی۔ اور قرائن سے معلوم ہوتا کہ اس پر کافی آمد و رفت ہوتی ہوگی۔ یہ راستہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے گرد گھومتا ہوا جا رہا تھا۔ اور کہیں کہیں کسی سلسلۂ کوہ کے اوپر چڑھ کر بھی عبور کرنا پڑتا۔ پیاس کی وجہ سے دل میں یہی تصور بندھا تھا کہ ابھی دو چار مسافر ملیں گے ساتھ ان کے گدھا ہوگا۔ اور گدھے کے اوپر اسباب کے ساتھ پانی ہوگا۔ جو میں نہایت شوق سے پیوں گا۔ اسی تصور میں محو جا رہا تھا۔ کہ دُور سے ایک جھنڈ درختوں کا نظر آیا۔ راستہ انہی درختوں کے نیچے سے ہو کر گذرتا تھا۔ میں نے خیال کیا یہ مسافروں کے آرام کرنے کی جگہ ہوگی۔ یہاں ضرور پانی مل جائیگا

وہاں پہنچ کر بھی نا امیدی ہوئی۔ میری ٹانگوں میں انتہا درجے کی تکان محسوس ہو رہی تھی۔ اور اندیشہ ہو رہا تھا کہ میں اپنی رفتار کس طرح جاری رکھوں گا۔ لہٰذا سستانے کے لئے ایک درخت کے نیچے سلامی زمین پر میں پتھر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اور غنودگی سی آ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نہایت سخت پیاس لگی ہوئی ہے۔ اور اضطراب میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ اسی ہاتھ پاؤں مارنے سے میرا ہاتھ زور سے پتھر پر لگا جس سے آنکھ کھل گئی۔ اور معلوم ہوا کہ واقعی میں تڑپ رہا تھا۔ اٹھ کر میں نے درخت کے پتے توڑے اور ان کو چوسا لیکن ان کی تلخی سے زیادہ تکلیف محسوس ہوئی۔ اپنی رفتار کو میں نے تیز کیا۔ ہر پہاڑی جو سامنے آتی یہی خیال گذرتا کہ اس کے دوسری جانب ترّم دریا بہہ رہا ہے۔ اور میں بہت جلد سرکاری علاقے میں پہنچنے والا ہوں۔ اسی امید پر میں نے کتنی پہاڑیوں کو عبور کیا۔ راستہ ایک لمبے سلسلہ کوہ کو یہاں عبور کرتا تھا۔ یہ چڑھائی چڑھنا میرے لئے قیامت تھی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ جب میں قریب پہنچا تو اوپر کے سرپر ایک نیل گاؤ نظر آئی۔ مجھے گمان ہوا کہ حیوان بے آب تو رہ نہیں سکتا۔ ضرور پانی نزدیک ہو گا۔ اس چڑھائی پر چڑھا بھی اور اترا بھی لیکن کوئی نشان پانی کا نظر نہ آیا۔ راستے نے ایک نالے کو عبور کیا۔ اس کی تہ کو میں نے کھودا لیکن دور تک گرم ریت نکلی۔ یہ نالا چکر کھا کر پھر میرے راستے میں آتا تھا۔ اور راستے سے ایک چھوٹی شاخ پھٹ کر ایک چشمے کی طرف جاتی تھی۔ دیکھا تو یہ چشمہ میری زبان کی طرح خشک تھا۔ اسے بھی کھودا اور صدیوں کا خشک پایا۔ یہی نالہ پھر چکر لگا کر راستے کو قطع کرتا تھا۔ اس جگہ اس کے کنارے پہ چند مرنّی کی جھاڑیاں دکھائی دیں۔

میں نے چند شاخوں کو جڑھ سے اکھاڑا اور اس کے گودے کو کھایا۔ اور ڈنڈلوں کو چوسا۔ اس سے تشنگی کو کچھ تسکین ہوئی۔ ایک دو اور شاخیں توڑ لیں اور منہ میں چباتا بھاگا۔ یہاں سرسبز سے پہاڑ پر ایک آہو نظر آیا۔ دل نے جوش کھایا کہ اوپر چڑھ جاؤں شاید کوئی چشمہ حیات چوٹی پر ہو۔ پھر خیال آیا کہ اتنی نیچی زمین خشک ہے۔ اوپر پانی کہاں ملے گا۔

راستہ پہاڑیوں کو عبور کر کے اب ایک وسیع پتھریلے میدان میں جا کھلا جس میں دھوپ کی شدت سے پریاں اور بھوت ناچتے نظر آ رہے تھے۔ نالا راستے کے قریب قریب ہی جاتا تھا۔ اس میدان میں کتنی دفعہ ایسا ہوا۔ کہ سفید پتھروں پر مجھے دور سے بھیڑوں کا شک ہوا۔ اور میں ان کی طرف لپکا۔ اور مایوس ہو کر پھر راستے کی طرف بھاگا۔ میرے کان آہستہ آہستہ گونجنے لگے اور آخر بے حس ہو کر رہ گئے۔ میری زبان بے حرکت ہو گئی۔ میں نے منہ کو بند کر رکھا تھا کیونکہ سانس کے منہ کے راستے آنے جانے سے منہ اور حلق زیادہ خشک ہو جاتے۔ اب نتھنے بھی خشک ہو گئے۔ اور خود بخود منہ کھل گیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پیاس سے آدمی کس طرح جان دیتا ہے۔ میں نے یہ خیال کر رکھا تھا۔ کہ تکلیف بدن پر اثر کر سکتی ہے۔ لیکن دل پر نہیں۔ کتنی دفعہ اس تکلیف کو اس طرح محسوس کرتا جیسے کسی دوسرے آدمی کو ہو۔ اور میں خود اسے دیکھ رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میری بینائی میں فرق آنے لگا۔ اس اثنا میں ایک اُجڑے ہوئے چھپروں کے گاؤں میں پہنچ گیا۔ جو اسی نالے کے کنارے پر کبھی آباد ہوتا ہوگا۔ زمین پر پتھروں کے نشان بتا رہے تھے۔ کہ یہاں کبھی چھپر کھڑے

ہوں گے۔ ایک چھپر کے آثارات میں محراب کا نشان پایا جاتا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ مسجد ہوتی ہوگی۔ اس کے وسط میں ایک گڑھا تھا جو موسم سرما میں آگ جلانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہوا کہ اب پانی ضرور مل جائیگا میں نالے میں اُتر گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریت کو کھودا اور بالکل نا امید ہو کر گاؤں میں واپس آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے بہت تاریکی چھا گئی تھی۔ اور میری موت تھوڑی دیر میں یقینی معلوم ہوتی تھی میرا سر چکرایا ہوا تھا۔ اور کوئی خیال کسی آشنا یا بھائی بند کا میرے دماغ میں نہیں آسکتا تھا۔ یادِ وطن بالکل فراموش تھی۔ زندہ رہنے یا وطن تک پہنچ جانے کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں۔ ؎

مخفیا چند بدل حسرتِ دیدارِ وطن

عنقریب است کہ درخاک فنا ئت وطن است

اپنے آخری دم اپنے معبود کے معبد میں ختم کرنا ثواب سمجھا۔ مسِ تفتہ کی طرح تپتی ہوئی زمین پر رُو بقبلہ لیٹ گیا۔ پنجسورہ نکال کر چھاتی پر رکھا اور جناب قبلہ گاہی کا خط ہاتھ میں لے لیا۔ بدیں خیال کہ میری لاش شاید اس کے طفیل ہی پہچان لی جائے اس خط کا میرے دل پر جو اثر تھا۔ اسے ناظرین کی قوتِ احساس پر چھوڑتا ہوں۔ میری زبان صاف نہیں چلتی تھی۔ دل میں ہی کلمہ طیب دہرا رہا تھا۔ اور آنکھوں سے خط کو دیکھتا جا رہا تھا۔ جب اس آیت پر پہنچا وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ اور ساتھ ہی تپش نے بدن کو جلا دیا تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ورد دل میں کرتا ہوا اٹھا۔ اپنی طاقتوں کو ایک دفعہ پھر جوش میں لایا۔ اور دل کو مخاطب ہو کر کہا۔ ؎

اب تو دو چار ہی نالوں کا رہا ہے جھگڑا ہاں ذرا حضرتِ دل آپ نے ہمت کیسی

اے اکرم عورتوں کی طرح مت لیٹ۔ موت خود گرا دے گی۔ اور ساتھ ہی پورا
یقین ہو گیا کہ اللہ ضرور مدد کرے گا۔ میں نے خشک نالے ہی میں اتنی رفتار سے
چلنا شروع کیا جتنی مجھ میں طاقت تھی۔ آنکھوں کے سامنے تقریباً بالکل تاریکی تھی
بیہوشی میں مجھے علم نہیں کہ میرے سر کی کلاہ کہاں گر گئی۔ اور جناب قبلہ گاہی کا خط
کہاں غائب ہو گیا۔ اور میں کتنی دور نکل گیا۔ ناگاہ پاؤں کو ایک جگہ زمین نمدار
معلوم ہوئی۔ میں نے آنکھوں کو پھاڑ کر دیکھا اور واقعی صحیح معلوم ہوا تھوڑی دور
اور آگے جا کر کنارے پر ایک بڑے پتھر کے نیچے ریت بہت تر نظر آئی۔ آگے
جانے کی مجھے تاب نہ رہی بیٹھ کر تھوڑا گڑھا کھودا اور ریت کو تھپکا۔ جب پانی
نمودار نہ ہوا تو مٹھی بھر کر ریت منہ میں ڈال لی۔ اور چہرہ پر مل بھی لی۔ اس تھوڑی سی
تری سے خواہش اور بھڑکی اور میں امید میں بھاگا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی
جب میں نے ایک لمبا چوڑا چشمہ اپنے پاؤں کے نیچے پایا۔ قریب تھا مجھے
شادی مرگ ہو جاتا۔ میرے حواس اس کو دیکھ کر درست ہونے لگے۔ اپنے منہ
سے ریت کو پھینکا۔ اور پانی سے کلی کر کے منہ کو صاف کیا۔ میں نے جلدی
نہیں کی۔ اور خواہشوں کو روک کر تھوڑا سا پانی پیا۔ کپڑے اتار کر آہستہ آہستہ
چشمے میں لیٹ گیا۔ سر کے نیچے پتھر رکھ لیا تاکہ ناک اور منہ باہر رہیں۔ میری چھاتی
کا تھوڑا سا حصہ پانی سے باہر تھا۔ جس پر آفتاب کی مانند شدہ کرنیں عجب لطف
دیتی تھیں۔ میری زبان چل نکلی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں خدا سے لپٹ
رہا ہوں۔ میں اس وقت عالمِ بے اختیاری میں اللہ پاک سے اس طرح باتیں
کرتا جیسے میرے سامنے کوئی کھڑا ہے۔ میرے شکر اور مسرت کی کوئی حد نہ تھی

میں ہاتھ سے تھوڑا تھوڑا پانی جو کہ شیر گرم تھا منہ میں ٹپکا لیتا تھا۔ اسی حالت میں مجھے غنودگی سی آگئی۔ پانچ سات منٹ کے بعد آنکھ کھلی چشمہ سے باہر نکلا تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میرے سر کا کلاہ اور جناب والد بزرگوار کا خط کہیں راستہ کی بیہوشی میں گم ہو گیا ہے۔ ان دونوں کی جدائی مجھ پر بڑی شاق گذری۔ کلاہ تو دھوپ کی شدت سے سر کے بچاؤ کے لئے خود کا کام دیتا تھا اور خط اس ویرانہ میں ایک واحد ذریعہ تسکین کا تھا۔ اصل میں مسجد سے لے کر مدا۔ زمین تک پہنچنے میں جو وقت صرف ہوا اس کی یاد سے میرا ذہن بالکل کورا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی تھی۔ میرے خیالات میں تاریکی تھی۔ گویا مسجد سے اٹھ کر میں ایک سیاہ تاریکی میں گم ہو گیا۔ اور نالے کی نمدا۔ ریت پر پہنچ کر اس تاریکی سے نکل آیا۔ خط میرے ہاتھ سے کہاں گیا۔ کلاہ کس طرح سر سے غائب ہو گیا۔ کتنا فاصلہ طے کیا۔ اور کتنا وقت صرف ہوا۔ یہ سب میرے لئے اب تک ایک راز اور ایک معمہ ہے۔

غرض چشمے سے باہر نکل کر میں نے کپڑوں کو دھویا اور سجدہ شکر بجا لایا۔ تمام عمر میں مَیں نے نہ اتنی بڑی خوشی دیکھی تھی اور نہ دیکھنے کی امید ہے۔ جو اس آبِ حیات کو پا کر نصیب ہوئی۔ اس لئے جو الفاظ شکریہ کے میرے منہ سے نکلے وہ بہت ناکافی تھے۔ البتہ میری حالت ہمہ تن شکر و سپاس تھی۔ اور میں صرف خدا کے بھروسے پر اس جنگل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس چشمے کے کنارے سرکنڈے کا ایک چھوٹا سا پودا اگا ہوا تھا۔ نماز ادا کر کے میں اس نالے میں چل دیا اس کا رُخ عین شمال کی جانب تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک اور۔ اس سے بھی

بڑا چشمہ ملا۔ یہاں بھی سیر ہو کر پانی پیا لیکن مستسقی کی طرح ایسی حالت ہوگئی تھی۔ کہ پیاس بجھتی ہی نہ تھی۔ زبان طراوت ہی نہ پکڑتی تھی۔ پانی اس پر سے پھسل کر اندر چلا جاتا اور تھوڑی دیر میں ویسی ہی خشک ہو جاتی۔ اب میں اس نالے کے بائیں کنارے پر چڑھ گیا۔ چشمے پر چشمے آنے لگے۔ اور میں ہر ایک سے تھوڑا بہت پانی پیتا۔ اس کے کنارے پر نرسل کی عام پیداوار تھی۔ نالا مشرق کی طرف مُڑا۔ اس موڑ پر ایک بہت بڑا چشمہ ملا جس کی تہ میں چکنی مٹی ہونے کے باعث اس کا رنگ سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ قریباً بیس فٹ لمبا دس فٹ چوڑا اور پانچ فٹ گہرا تھا۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ کپڑے اتار کر میں اس میں گھس گیا۔ طبیعت نہایت بشاش ہوئی کچھ دیر اس میں کھڑا رہا۔ تیرنے کے لئے بھی دو چار ہاتھ پاؤں مارے۔ پانی بہت ہی شفاف تھا۔ آخر کپڑے تر کر کے یہاں سے بھی رخصت ہوا۔ تھوڑی دُور چل کر نالے میں ایک آدمی نظر آیا۔ اور ساتھ ہی مارے خوف کے جسم پر سنسنی سی طاری ہوگئی چھپ کر اس کی حرکات کو دیکھتا رہا۔ لیکن وہ جگہ سے نہ ہلا۔ آڑ میں ہو کر قریب گیا تو ایک درخت کا سوکھا سفید رنگ کا تنہ کھڑا تھا۔ جس پر دُور سے آدمی کا دھوکا ہوتا۔ سامنے نظر کرنے سے نصف میل کے فاصلے پر نہایت سرسبز زمین نظر آئی تھی۔ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے۔ جس سے مجھے احتمال ہوا کہ یہاں ضرور ہی آبادی ہوگی۔ اور میرا خیال تھا۔ کہ دریائے تُرم اب نزدیک ہی ہوگا۔ اگر اچانک کسی گاؤں کے سر پر پہنچ گیا اور لوگوں نے حال دریافت کیا تو کیا کہوں گا۔ مجھے علم نہیں ہوگا کہ علاقہ امیر صاحب میں ہوں گا یا غیر علاقہ میں۔ اور غیر علاقہ انگریزوں کا طرفدار ہوگا یا دشمن بسوا اپنے

بچاؤ کے لئے میں نے یہ کہانی گھڑ لی۔ کہ میں چھاونی خوست سے آ رہا ہوں۔ وہاں
میرا چچا مسجد میں ملا ہے۔ میں اسے ترم کے راستے ملنے گیا تھا۔ ٹل میں میرا بھائی
ڈاکخانہ میں نوکر ہے۔ اس کی سخت بیماری کی خبر پہنچی تھی۔ میں اس وقت تیلکی کی
سیر کے لئے آیا ہوا تھا۔ وہیں سے میرے چچا نے چار آدمی جو ٹل کو آ رہے
تھے۔ ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ راستے میں رات کو ہم پر ڈاکہ پڑا۔ دو آدمی مارے
گئے اور ہم تین بھاگ گئے۔ پہاڑوں میں ٹکریں مارتا مارتا بمشکل یہاں پہنچا ہوں
میرا خیال تھا کہ میری یہ حکایت سن کر وہ نرم ہوں گے۔ اور حتی الوسع مجھے ٹل پہنچا دیں
گے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو کم از کم میرا حال دریافت کرنے کی کوشش کرینگے
رات کو کھانا دیں گے۔ چارپائی دیں گے۔ اور میں نصف شب چپکے سے نکل
کھڑا ہوں گا۔ انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ سورج غروب ہونے لگا۔ اور میں
اس مفروضہ آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں مجھے نالے میں ایک ایسا چشمہ ملا۔
جس کے گرد پتھر لگائے ہوئے تھے۔ اس کا پانی نہایت شفاف اور ٹھنڈا
تھا۔ اس کے پاس آگ کے نشان تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ قریب ہی آبادی
ہے۔ میں چپکے چپکے وہاں سے تیز قدم نکل گیا۔ اور آبادی کا سراغ لگانے لگا۔
مگر بے سود کوئی آواز کتے کی ہو یا آدمی کی کان میں نہ آئی۔ پھر ذرا دیر ہی سے میں
نے جستجو کی اور بلند آواز سے پکارا۔ کہ اگر کوئی سنتا ہے تو میں ایک مسافر ہوں
مجھ سے آ کر ملے۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اصل میں موسم گرما میں یہ پہاڑ اور
راستے آدمیوں سے قطعی خالی ہو جاتے ہیں۔ ان کے ڈیرے کافور ہوتے
ہیں۔ اس موسم کی گرمی پہاڑوں میں ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ پانی خشک

ہو جاتے ہیں۔ جانوروں کے لئے چارہ نہیں ملتا۔ سو یہ لوگ ٹھنڈے اور سبز پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔

سُورج کے غروب ہوتے وقت میں اس جھنڈ میں پہنچ گیا جو مجھے دُور سے نظر آ رہا تھا۔ اس میں دو چار پگڈنڈیاں نظر آئیں۔ پہلے دل میں خیال آیا کہ اگر ہو سکے تو ان کے ذریعے آبادی میں پہنچنے کی کوشش کروں لیکن دوبارہ قید میں پڑ جانے کے خوف نے باز رکھا۔ یہ جگہ نہایت سرسبز تھی۔ بلکہ ایک قدرتی باغ تھا۔ میں نے کسی میوے کی تلاش کی۔ ایک درخت ملا جس میں چھوٹا چھوٹا پھل تھا جو پیلو کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ پھل دو چار دفعہ فراریوں کے گاؤں میں بھی عورتیں لائی تھیں۔ میں نے اس کی ٹہنیاں توڑ کر ہاتھ میں لے لیں آگے چل کر ایک چھوٹی سی جھاڑی ملی جس میں ایک عجیب قسم کا پھل لگا ہوا تھا۔ خرمانی کی شکل کا لیکن سُرخ چھلکا سخت اور پکے ہوئے پھل کا چھلکا پھٹ کر اس کے اندر سے بادام نکلا ہوا تھا۔ اس جھاڑی میں یہ نہایت بہتات سے لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کی گری نکال کر کھائی تو خرمانی کی گری کی طرح لیکن ترشی مائل یہ پھل اکٹھے کر کے میں نے قمیص کی جیب بھر لی۔ اور جیب میں سے تسبیح اور کتاب نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ مجھے اگرچہ اشتہا محسوس ہوتی تھی لیکن دل میں ایک عجیب اضطراب تھا۔ جو دم بھر ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ ایک اور عجیب بات میں نے دیکھی۔ کہ دن کے دو بجے کے قریب میں اس قدر تھک گیا تھا۔ کہ ٹانگیں نہیں چلتی تھیں لیکن اب ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی مشین کے پرزوں کو تیل دے دیا جائے۔ اور وہ ہلکے ہو جائیں۔ مجھے ٹانگوں کا بوجھ تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔

میں نے غور کیا تو نالے کا رُخ مغرب کی طرف ہوتا جاتا تھا میرے سامنے نہایت بلند پہاڑ شمال مغرب کی طرف کھڑے نظر آتے تھے۔ اور دائیں یعنی مشرق کی جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ یہاں ایک اور نالہ مشرق سے آکر اس میں ملتا تھا۔ جس کے کنارے پر ایک راستے کا نشان نظر آیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد اپنے پہلے پیارے نالے کو میں نے الوداع کہا جس سے چشموں کے باعث مجھے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اور میں دوسرے نالے میں ہو کر پہاڑیوں میں گھس گیا۔ اس نالے کے کنارے نہایت سرسبز تھے۔ کاہی برابر دونو طرف گنجان تھی۔ ہوا ایسی تازہ اور فرحت بخش تھی کہ میرے جیسے مُردہ دل میں مسرت کی جھلک نظر آنے لگی۔ میرے دل کو اس وقت اپنے خالق و مالک سے خاص تعلق محسوس ہوتا تھا۔ ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے میرے خیالات پاک تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی تمام آلائشوں سے منزہ ہو کر میں بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوں۔ اور اس کی رحمت ہر طرف سے مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ ذرہ بھر خوف میرے دل میں ہرگز نہ تھا۔ اور میں اس رحیم و کریم خدا کے ساتھ ہمکلام ہونے کی لذت اٹھا رہا تھا۔ اور یہی جی چاہتا کہ اسی لذت و پاکیزگی میں آخری لمحوں کا خاتمہ ہو جائے۔ ؏

ہمیں تا حلت باشد از عمر باقی
اگر ہم چنینش بآخر رسانی

میں اس خوشنما نظارے کا پورے طور پر لطف اٹھا رہا تھا موت کو میں نے بالکل ناچیز سمجھ لیا۔ اور خدا کی قسم مرگ کا خیال مجھے ہرگز ہرگز پریشان نہیں کر سکتا

تھا میرے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ نالے نے پتھروں کو ایسا کاٹ رکھا تھا۔ جیسے بڑے بڑے ڈائنامیٹ لگا کر ہزارہا سال کی کوشش کے بعد راستہ پیدا کیا گیا ہو۔ ناگاہ نالے کا تمام پاٹ ایک سیدھی پتھر کی دیوار سے رُک گیا۔ جو قریب میں فٹ کے بلند ہوگی۔ یہ دیوار جو برسات میں ایک خوشنما آبشار ہوتی ہوگی۔ ایسی صاف اور عمودی تھی کہ اس پر چڑھنا ناممکن تھا۔ نالے کے دونوں ساحل بھی عمودی تھے۔ میرے دل میں یقین تھا کہ میں ضرور اُوپر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس دیوار کی بنیاد میں ایک چھوٹا سا لیکن گہرا چشمہ تھا۔ وضو کر کے میں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ کپڑوں کو بھگویا اور غسل شکرانہ بجا لایا۔ اپنی جیب سے ان گرلیوں کو نکالا اور توڑ کر کچھ کھائیں۔ میرے حلق سے وہ اترتی نہیں تھیں بلکہ ایک لعاب جیسے میں پھنس کر حلق کے اندر ہی رہ جاتیں غرض کہ میں نے پانی سے معدہ پُری کر لی۔ اور اُوپر چڑھنے کو راستہ تلاش کیا۔ تاریکی زیادہ ہو چکی تھی۔ میرے دائیں جانب ساحل پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہاں سے ایک راستے کے ذریعے میں اُوپر چڑھ گیا۔

تارے روشن ہو چکے تھے۔ اور میں بخوبی معلوم کر سکتا تھا کہ شمال مشرق کو جا رہا ہوں۔ اب کوئی نشان راستہ یا پگڈنڈی کا نہیں جس سے تسکین ہو پہاڑ پر چڑھنا اب شروع ہو گیا۔ نصف میل جا کر ایک اور چشمہ ملا۔ میں نے نذر کر رکھی تھی کہ ہر چشمے پر وضو کروں گا۔ اس سے بھی وضو کیا۔ اور پانی پی کر چل دیا۔ تھوڑی دور جا کر ایک اور چھوٹا سا چشمہ ملا۔ چونکہ ہر چشمے پر یہی گمان ہوتا تھا کہ خدا جانے اس کے بعد پانی ملے گا یا نہیں۔ اس لئے جتنا پی سکتا پی لیتا۔ نالے نے

اب پیچ و تاب کھانے شروع کئے۔ اور چھوٹے چھوٹے نالے ہر طرف سے آکر اس میں ملنے لگے۔ سامنے کا پہاڑ کوئی بہت بلند اونچا نہیں اس لئے میں نہایت خاطر جمعی سے جا رہا تھا میری دلجمعی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ کا ہی بیدمیں میں نے ایک جگنو اڑتا دیکھا۔ اس چراغ بے آتش نے میرے دل کو ایسا لبھایا کہ میں پروانے کی طرح اس پر گرا۔ اور اس کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اگرچہ فوراً خود ہی اپنی اس حرکت پر مجھے تعجب ہوا۔ جب میں چوٹی کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اس سے زیادہ بلند ایک اور پہاڑ پر چڑھنا ہے۔ تاہم میری ہمت پست نہیں ہوئی۔ اور میں نے اپنی رفتار کو جاری رکھا۔ نالا اگرچہ بل کھاتا جا رہا تھا۔ لیکن مجھے خوب معلوم تھا کہ پانی نے ایسی جگہوں کو کاٹ کر قابل گذر بنا رکھا ہے۔ جن کو طے کرنا انسان کے لئے مشکل تھا۔ البتہ ایک سخت غلطی جو مجھ سے سرزد ہوئی ممکن ہے کہ وہ غلطی نہ بھی ہو، یہ تھی۔ کہ میں بڑے نالے کا کھوج دبا تا گیا۔ اور کسی چھوٹے کی طرف رخ نہ کیا۔ یہ سوچنا چاہیئے تھا۔ کہ اتنا بڑا نالا جو بنا ہے۔ تو یہ پانی کسقدر بلند پہاڑوں سے جمع ہو کر آتا ہو گا۔ اور چھوٹے نالے ضرور چھوٹی بلندی سے شروع ہوتے ہوں گے۔ غرض کہ میں اسی نالے کے کنارے چلا گیا۔ اب مجھے یہ خیال بھی گذرنے لگا۔ کہ ممکن ہے اس بلند پہاڑ پر لوگوں نے آبادی اختیار کی ہو۔ درختوں کے جھنڈوں کو دیکھ کر مجھے آبادیوں کا شک گذرتا۔ لیکن یہ ایک محض جنون تھا۔ تاریکی بہت زیادہ ہو گئی ہیں اگرچہ آسمان کا صرف تھوڑا سا حصہ دیکھ سکتا تھا۔ تاہم معلوم کر لیتا۔ کہ سمت مقررہ کو ہی جا رہا ہوں۔ پہاڑ کی چوٹی مجھے صاف نہیں دکھائی دیتی تھی۔ کہ میں اس کی بلندیکا

اندازہ لگا سکتا۔ البتہ چوٹی پر پہنچ کر اتنی ہی بلند ایک اور تیار ہوتی۔ ایک ایسے مصیبت زدہ کے لیے جس نے ڈیڑھ ماہ کے لیے ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھائی ہوں جس نے پہاڑی راستے کی مسافت کبھی پیدل طے نہ کی ہو۔ اور جسے کھانا کھائے چوبیس گھنٹے سے زیادہ عرصہ گذرا ہو۔ جسے خوف عمر اس سے بھاگتے ایک دن رات گذر چکا ہو۔ یہ چڑھائی کیا معلوم ہوتی ہوگی۔ اس کا اندازہ کرنا میں ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ لیکن بایں ہمہ میں نے اپنی ہمت کو ہرگز پست نہیں ہونے دیا۔ ٹانگوں کو گھسیٹتا گیا۔ کتنی دفعہ خیال آیا۔ کہ دس پندرہ منٹ کہیں آرام لے لوں۔ لیکن پھر دل کو سمجھاتا۔ کہ یہاں ہوا بالکل بند ہے۔ چوٹی پر پہنچ کر خوب مزے سے رات گذاروں گا۔ ان امیدوں کو اُبھار اُبھار کر میں ہمت کو قائم رکھتا۔ میں معلوم کرتا تھا۔ کہ جوں جوں اُوپر جاتا ہوں۔ نالے کی چوڑائی کم ہوتی جاتی ہے۔ نصف شب ہوگئی لیکن چوٹی کا ابھی کوئی پتہ نہیں۔ آخر ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ راستے میں بڑے بڑے پتھر تھے۔ جن پر چڑھنا دشوار ہو گیا۔ البتہ پاٹ بالکل کم ہو جانے سے مجھے خیال تھا۔ کہ چوٹی کہیں نزدیک ہی ہوگی۔ ایک پتھر پر دو تین منٹ بیٹھ لیتا اور پھر چڑھتا۔ پیاس بھی لگی ہوئی تھی وہ ترش بیلو نکے مشابہ میوے مُنہ میں چباتا جب تک اسے چوستا تسلی رہتی۔ لیکن اس کا گودا تالو میں ایسا چپک جاتا۔ گویا گوشت کا حصہ بن گیا۔ اور بڑی تکلیف دیتا۔ اسلئے مَیں نے انکا استعمال صرف پیاس میں کمی کیلئے چوسنے تک محدود رکھا۔

ایک پتھر پر چڑھتے وقت میں نے دونوں ہاتھ اس پر رکھے اور اُچھل کر اُوپر چڑھ گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ سے بھنبھورہ کی

کتاب کھینچ لی۔ میں نے کتاب کی تلاش میں بڑی کوشش کی۔ درختوں کی شاخوں
کو ہٹایا۔ پتھروں کو الٹ پلٹ کیا۔ خدا جانے کہاں غائب ہوئی۔ نہ ملی پر نہ ملی میرا
یقین تھا کہ مجھ سا گنہگار اگر اب تک اتنی مصیبتوں سے بچ نکلتا رہا ہے۔ تو یہ
صرف اللہ ذوالجلال کے کلام کی برکت تھی۔ اس کی گم شدگی کا سخت قلق ہوا اور
دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ الوداع کہہ کر روانہ ہوا۔ چادر پہلی ہی رات جدا
ہو چکی تھی۔ زنجیر صبح کو علیحدہ ہو گئی۔ جناب قبلہ گاہی کا خط میرے لئے آخری نشانی
بیہوشی میں غائب ہو گیا۔ کلاہ جو سر کے لئے دھوپ میں خود تھی۔ وہ بھی کہیں گر گئی
اب یہ تبرک بھی جاتا رہا۔ کس طرح سب ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے
ہیں۔ انہی خیالات میں محو چڑھتا گیا۔ یہاں نالا تقریباً غائب ہو گیا۔ صرف گول پتھروں
کے جمع ہونے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہی نیچی جگہ ہے۔ جہاں سے پانی گذرتا ہے
رات کی سیاہی میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ مرنی کی جھاڑیاں اس بلندی پر بھی کثرت
سے تھیں۔ میں چوٹی کے قریب ہی تھا۔ لیکن یہ تھوڑا سا فاصلہ ایسا گراں تھا۔
کہ قدم اُوپر کو نہ اُٹھتا۔ بصد مشکل میں چوٹی پر پہنچ گیا۔ کیا یہ ایک مسطح جگہ تھی؟۔ نہیں
ایک طرف سے اُوپر چڑھا۔ اور دوسری طرف سے اُترائی شروع ہو گئی ہوا بالکل
بند تھی۔ میری بائیں جانب ابھی اس سے بھی اُونچی چوٹی کھڑی ہے۔ جو دوسرے
پہاڑ سے متعلق ہے۔ اب میں ایسی جگہ ہوں جہاں سے تین کھڈیں نیچے اُترتی
ہیں۔ ایک سے تو میں چڑھ کر آیا ہوں۔ ایک عین اس کے مقابل دوسری طرف
اور ایک شمال مغرب کی جانب اس بلند پہاڑ اور اس چوٹی کے درمیان سے جاتی
ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بقیہ شب قُلّہ کوہ پر بسر کروں گا۔ یہاں پہنچ کر خدا کی قسم

ایک لمحہ تک بیٹھا نہیں۔ ایک قدم اُوپر پڑا۔ اور دوسرا نیچے اُترا۔ مقابل والی کھڈ میں اُترنا شروع کیا۔ دُور سے درختوں کی سائیں سائیں سُنائی دیتی تھی جس سے مجھے خیال گذرا کہ دریائے قُرم دامنِ کوہ میں لہریں مار رہا ہے میں اپنے خیال میں انگریزی حکومت کا قلعہ ایک مُسطح پہاڑی کے سر پر بناتا۔ اور رات کے وقت وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹاتا یہی خوشگوار خواب تھے۔ جو مجھے زور زور سے لکر پُکار رہے تھے۔ کہ ہاں بڑھے چلو۔ اُترائی بڑی تکلیف دہ تھی۔ رات کی سیاہی میں سطح کی گہرائی کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ پاؤں رکھا اور دہم سے نیچے گرا۔ اس کھڈ میں درخت بہت گنجان تھے۔ اور راستہ بالکل تنگ و تاریک تھا بعض بعض جگہ شاخوں کے نیچے سے لیٹ کر گذرنا پڑتا۔ تاہم اُترائی میں چڑھائی کی نسبت رفتار ڈیوڑھی سے کسی حالت میں کم نہ تھی۔ بڑی بڑی ضخامت کے پتھر پڑے تھے۔ ہاتھ لٹکا کر کہنیوں کے بل نیچے لٹکتا۔ اکثر نیچے کے فاصلے کا غلط اندازہ ہونے کے باعث لڑھک جاتا۔ بارہا گرا کئی دفعہ چوٹ سے چیخ نکل گئی۔ ایک دفعہ ہاتھ کی ہتھیلی میں چھوٹی انگلی کے پاس سے گوشت ہی اڑ گیا۔ اور ہاتھ لہولہان ہو گیا۔ پیاس سے بھی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ پھل بھی اب مُنہ میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک جگہ پتھر پہ سے پاؤں رکھ کر میں جو نیچے اُترنے لگا۔ تو سانپ کی پھنکار اس زور سے آئی۔ کہ پہاڑ میں گونج پیدا ہو گئی۔ میں نے جھٹ پاؤں اُوپر کھینچ لئے اور دوسری طرف سے ہو کے نیچے اُتر گیا۔ موت و زندگی کا خیال بالکل میرے دل سے دُور ہو گیا تھا۔ البتہ میں چاہتا تھا۔ کہ گُھل گُھل کر مرنے سے اگر موت اچانک مجھے آ لے تو بہتر ہے۔ رنج بالکل میرے دل سے دُور ہو چکا تھا۔ وطن

اور یادِ والدین کو میں نے بالکل بُھلا دیا تھا۔ اپنی اسی آزادی کو مایۂ ناز سمجھتا تھا
اور اپنی رفتار کو جاری رکھنا میری دلی خوشی تھی۔ راستے کی طوالت سے مجھے کوئی
بحث نہ تھی۔ تکان اور بھوک پیاس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا جنگل کا منظر
اور بلاؤں کا خیال مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں مرنے کے لئے ہر طرح
تیار تھا۔ میرے دل میں ایک لطیف سی نشاط جاگزیں تھی۔ جو کسی مصیبت سے
مغلوب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ صرف ایک خدشہ ایسا تھا جو بار بار دل
میں موجزن ہوتا۔ کہ الٰہی مجھے ہرگز خیال نہیں کہ میں کس موت مروں گا اور کونسی
زمین پر میرا آخری دم نکلے گا۔ مجھے ہرگز فکر نہیں کہ میری لاش درندوں کی خوراک
بنے گی یا بے تجہیز و تکفین پڑی رہے گی۔ مجھے بالکل پرواہ نہیں کہ اخیر وقت
کوئی ہمدرد میرے پاس نہ ہوگا۔ اگر کچھ اندیشہ ہے تو صرف یہ کہ میری مرگ کا
یقینی حال کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا۔ مدتوں میرے والدین حضرت یعقوب کی مانند
رویا کریں گے۔ وہ مجھے زندہ سمجھ کر ساری عمر میری تلاش میں صرف کر دینگے
اور میرے دیکھنے کی حسرت کبھی ان کے دل سے دُور نہ ہوگی۔ اپنے سے
محبت رکھنے والے دلوں کی اس دائمی مصیبت کا خیال کر کے دُعا کرتا کہ یا خدا!

شخصم ار باز نیاید خبرم باز آید

اگر مرگ نے میرے جسم کو پہاڑوں میں ہی نابود کر دینا ہے۔ تو میری موت کی
یقینی خبر پسماندوں تک کسی ذریعہ پہنچا دینا۔ تاکہ وہ مجھے کسی کی غلامی میں زندہ
سمجھ کر تمام عمر مضطرب و سرگرداں نہ رہیں۔ اور میں سچائی سے کہتا ہوں۔ کہ
صرف اسی خیال سے میں اپنی حیات کی ضرورت سمجھتا۔ ورنہ موت کو اس زندگی

پر ترجیح دیتا تھا۔ رنج و غم کی زیادتی نے رنج و غم کا احساس میرے دل سے دُور کر دیا تھا۔ مصیبتیں میرے دل کا بہلاوا بن گئی تھیں۔ ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

سانپ کی پھنکار سے یقین تھا کہ کوئی بہت بڑی آفت ہو گی لیکن کچھ بھی اس کا خوف مجھ پر نہ ہوا۔ مجھے اس کے قریب ہی اُترنا پڑا اور خیال تک نہ آیا۔ کہ یہ مجھے کوئی گزند پہنچائے گا۔

گذشتہ دوپہر کی شدتِ تشنگی کے بعد میری پیاس کی دو قسمیں ہو گئی تھیں۔ ایک قسم تو استسقاء کی مانند کسی وقت بھی بجھتی نہ تھی۔ اور ہر وقت زبان خشک۔ حلق خشک اور دم خشک۔ یہی جی چاہتا کہ کام و دہن میں تھوڑی دیر بعد پانی ٹپکتا رہے۔ دوسری قسم پیاس کی وہ تھی جو دیر تک پانی نہ ملنے کے باعث پیدا ہوتی۔ اور اس سے قوے پر حقیقی اثر محسوس ہوتا۔ اور ایسا معلوم دیتا۔ جیسے حضرتِ دل جواب دے جانے کو ہیں۔ اگرچہ اس وقت سفر رات کا تھا لیکن پھر بھی ماہ جون کی گرمی۔ ہوا بالکل بند۔ سات آٹھ گھنٹہ بغیر پانی کے سفر کے بعد حقیقی پیاس کا اثر قوے پر ہونے لگا۔ علاوہ اس کے جو گریاں وغیرہ شام کو حلق اور تالو میں چمٹ گئی تھیں وہ خشک ہو کر خارپشت کی طرح محسوس ہونے لگیں۔ اور حلق میں ایسی تیز خراش اور زخم سے پیدا ہو گئے جن سے مجھے خیال گزرا۔ کہ شاید "گریوں" میں کسی قسم کا زہر ہو گا۔

تین بجے کے قریب ایک جگہ نمدار ریت آئی۔ پانی کی امید میں میں اور تیز

ہوگیا۔ بعد اس کے ریت کھود کھود کر دیکھتا رہا۔ جو بجائے نمدار ہونے کے الٹی گرم نکلتی۔ حاصل کلام چار بجے کے قریب مجھے ایک چشمہ ملا۔ وضو کر کے سجدۂ شکر بجالایا۔ بدن میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ دل کھول کر نہایا۔ اور ایک بڑے مسطح پتھر پر نمازِ شفقن ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ مطلع صاف تھا لیکن مجھے آسمان کا صرف درمیانی منطقہ ہی نظر آسکتا تھا۔ کھڈ میں اترنے سے پہلے سمت کی اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد میں خیالات میں ایسا مستغرق رہا اور تشنگی سے ایسی حالت رہی کہ دوبارہ سمت پر غور کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ اب نماز کیلئے قبلہ کا رُخ معلوم کرتے ہوئے کیا دیکھتا ہوں۔ کہ میں الٹا مغرب کی طرف جارہا ہوں۔ قسمت میں ہی سرگشتگی لکھی تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ منزلِ مقصود پر پہنچنا نصیب نہیں ہے۔ گاوِ خراس کی طرح چکر کھاتے کھاتے دم نکل جائے گا۔ مجھے موت کا انتظار تھا۔ جو آکر اس کشمکش سے رہائی دلاتی۔ اور آرام سے پہاڑوں میں سُلادیتی ؎

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

واپس جانا محالات سے تھا۔ دس قدم بھی اوپر چڑھنا مشکل تھا۔ اس لئے میں یہی راستہ اختیار کئے رکھنے پر مجبور تھا۔ میری اس وقت کی دلشکنی کو صرف خاص خاص دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اب بہت نچلی پہاڑیاں علیحدہ علیحدہ نظر آنے لگیں۔ جو سلسلۂ کوہ کے قریب الاختتام ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔ ایک پہاڑی بالکل چکی کی طرح گول نظر آتی تھی۔ چشمہ پھر مجھے ایک گھنٹے کی اترائی تک کوئی نہیں ملا۔ پانچ بجے کے قریب نالا اس بڑی اترائی کو ختم کر چکا۔ جو ایک ہی

پہاڑ سے اب تک آ رہی تھی۔ اور ارد گرد کی پہاڑیوں کے گرد گھومنے لگا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ اس کے شمالی ساحل پر ایک پگڈنڈی سی نظر آئی۔ جو ایک میل کنارے پر چل کر پھر نالے میں غائب ہو گئی۔ یہاں ایک بڑا چشمہ ملا۔ وضو کر کے نماز فجر بجا لایا۔ اتنی بڑی مصیبتیں جھیل کر اور اتنی دُور و دراز کی مسافت طے کر کے محنت کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر جو کچھ میرے دل پر گذرنا چاہیئے تھا۔ میں نے گذرنے نہیں دیا۔ ہمت کو میں نے اسی درجہ بلند رکھا۔ اور حوصلے میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔ دن اب نکل آیا۔ نالے کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا۔ اس نے ارد گرد کی گھاٹیوں کو اس طرح کاٹ رکھا ہے۔ کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ پانی اور اتنی طاقت کہ بیس بیس فٹ گہرائی تک پتھر کاٹ کر اس نے اپنا راستہ بنایا ہوا ہے۔ سُورج نکلنے سے ذرا پہلے مجھے ایک اور چشمہ ملا جس کے گرد ہرنوں کے پاؤں کے نشان لگے ہوئے تھے۔ نالے کی تہ میں بھی جا بجا کھروں کے نشانات تھے۔ ایک تازہ کھُرا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بھینس کا ہو۔ لیکن آدمی کے نشانِ پا کا پتہ بالکل نہیں ملتا تھا۔ چلتے چلتے صبح کے ساڑھے چھ بجے کے قریب ایک اور بہت بڑا فراخ نالا جس کی چوڑائی نصف میل سے زیادہ تھی نظر آیا۔ جس میں چکّر کھاتا ہوا یہ نالا جا گرتا ہے۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ وہی نالا ہو جس میں مجھے پہلے چشمے ملے تھے۔ اور اگر میں اس کو چھوڑ کر پہاڑیوں میں داخل نہ ہوتا۔ تو شاید رات کی محنت اس طرح برباد نہ جاتی۔ یہاں ایک ایسی زمین کا ٹکڑا تھا جس میں کبھی کیچڑ میں جانور پھرتے رہے ہوں گے۔ اور اسی طرح ان کے نقشِ پا کیچڑ میں کندہ ہو کر زمین خشک ہو گئی ہو۔ میں نے بہتیرا دیکھا۔

لیکن آدمی کا نقش پا کہیں نظر نہ آیا۔ مَیں نے انتہائے یاس کی حالت میں دو نفل اللہ کی درگاہ میں ادا کئے۔ اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ رات کی غلطی کا تازیانہ لگ چکا تھا۔ اس لئے بڑے غور و خوض کے بعد ایک پگڈنڈی کو انتخاب کیا۔ جو میری مترزہ سمت کو جاتی تھی۔ اتر کر اس پر ہولیا۔ چونکہ دن کا سرد وقت یہی تھا۔ اور زمین بھی ہموار تھی۔ اس لئے چپلیاں اتار کر دوڑنا شروع کیا۔ اس زمین پر پھولیوں کی بہت کثرت تھی۔ میں کوئی دو میل تک آہستہ آہستہ دوڑتا گیا۔ جوں جوں آگے جاتا راستہ فراخ ہوتا جاتا تین میل کے قریب جاکر ایک اور اُجڑا ہوا چھپروں کا گاؤں ملا۔ یہ صرف چند گھر ہی تھے۔ اس سے دو میل آگے جاکر ایک اور گاؤں کے نشان ملے۔ جو غالباً کسی قسم کے خیموں کا ہو گا کیونکہ کھونٹے زمین میں اسی طرح گڑے پڑے تھے۔ میں نے تلاش کی کہ کوئی ٹوٹا پھوٹا برتن دستیاب ہو لیکن وہاں تو ایسی صفائی تھی۔ کہ ٹوٹا ٹھیکرا بھی نہ ملا۔ سامنے شمال مغرب کی طرف لیکن بہت دُور ایک نہایت بلند سلسلۂ کوہ ملک کی اندرونی طرف چلا گیا تھا۔ ہر بلند پہاڑ کو دیکھ کر میرے دل میں یہی خیال گذرتا تھا۔ کہ اس کی چوٹی پر سردی ہو گی۔ اور ضرور لوگ اس کے اُوپر آباد ہوں گے اس خیال سے ایک جوش سا پیدا ہوتا۔ کہ اس طرف مُنہ کروں اور شاید کسی آبادی تک پہنچ کر بچ جاؤں۔ لیکن اب بدن میں طاقت کہاں رہی تھی کہ بلندی کی طرف چڑھنے کا ارادہ کر سکتا۔

میرا راستہ اسی بڑے نالے کے کنارے پر جارہا تھا۔ نالے کی گہرائی یہاں بہت زیادہ تھی۔ اور سواحل بہت سرسبز تھے بعض جگہ جنگلی درختوں

گے جھنڈ اس طرح کھڑے تھے۔ جیسے مصنوعی باغ ہوں۔ یہ قدرتی نظارہ صبح کے سہانے وقت میں نہایت دلفریب تھا۔ ہوا البتہ فرح بخش تھی بعض پہاڑیوں کے سر پر پتھر اس طرح نظر آتے۔ جیسے جھونپڑے ہوں۔ قوت خیالی سے ان میں آدمیوں کی شکلیں بھی پیدا ہو جاتیں۔ اور دھواں بھی اٹھنے لگتا۔ یہ دھوکا مجھے کئی مقامات پر ہوا۔ راستہ گھوم کر اب مشرق کی طرف ہوا۔ اور میں نے ایک بڑا جھنڈ درختوں کا طے کیا میں نے بعض درختوں کے پتے توڑ کر کھانیکی کوشش کی لیکن پھٹے ہوئے حلق میں وہ بہت تکلیف دیتے۔ البتہ ایک چھوٹا سا پھول منہ میں گھل کر نہایت نرم ہو جاتا اور پیاس کی لگاتار شدت میں کسی قدر افاقہ ہو جاتا۔

اب میں اس سلسلۂ کوہ کے گرد چکر لگا رہا تھا جس کے درمیان سے ہو کر رات میں اترا تھا۔ ان کی بھیانک شکل دیکھ کر دل میں اسقدر حسرت بھر آتی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بار بار خیال آتا کہ ممکن ہے۔ اگر میں سیاہئ بخت سے مجبور ہو واپس نہ پلٹ آتا۔ تو شاید اس وقت تک منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہوتا لیکن قسمت میں ابھی اور گردش باقی تھی۔ کیسے ٹل جاتی۔ بڑے نالے سے اب راستہ علیحدہ ہوا۔ اور ایک غار کے گرد چکر لگا کر ایک اور چھوٹے سے نالے میں گھس گیا۔ اس جگہ کی سرسبزی کا خیال اب بھی دل میں وہی فرحت پیدا کرتا ہے۔ دونوں جانب گر گرے کے سبز پوش درخت جھکے پڑے تھے۔ راستہ سبزہ زار کی زیادتی سے کئی دفعہ گم ہو جاتا تھا۔ صبح کے نو بجے کے قریب مجھے ایک چشمہ ملا جس کے پانی کی شیرینی سے اب بھی ہونٹ چپک جاتے ہیں۔ اس چشمے کی زمین ریتلی نہیں تھی۔ بلکہ سیاہ مٹی تھی۔ پانی بالکل شفاف نہیں۔ بلکہ تھوڑا سا گدلا

تھا لیکن ایسا ٹھنڈا اور شیریں کہ مَیں اور سب لذتیں بھول گیا۔ جتنا پی سکتا تھا پیا۔ غسل کیا۔ کپڑے بھگوئے اور روانہ ہُوا۔ راستے کے نشان پر چلنا بہت مشکل تھا۔ تاہم مجھے ایسی مہارت ہو گئی تھی کہ میں کھوج دبائے گیا۔ حتیٰ کہ اس نالے سے بھی جُدائی ہوئی۔ اب میرے خیال میں ٹل کی سڑک جمی ہوئی تھی ہر پہاڑی کی پناہ اور ہر کوہ کی اوٹ میں وہ صاف بل کھاتی دکھائی دیتی۔ آدمیوں کی آمد و رفت اس پر صاف صاف نظر آتی۔ اور مجھے یقین ہوتا کہ میں انشاء اللہ ابھی پہنچ گیا۔ اس وقت کے خیالات کو حرف بہ حرف یا لفظوں کا جامہ پہنانا نہایت مشکل ہے۔ اس کی یاد بھی گھنٹوں از خود رفتہ بنا دیتی ہے۔ اور وہی خیالات جن میں محو ہو کر اپنی منزل کو میں نے جاری رکھا۔ اسی طرح دل میں گذر کر وہی لذّت اور وہی حالت پیدا کر دیتے ہیں۔

یہاں مجھے ڈیڑھ فٹ دو فٹ کا ایک پتّھے کا دُہرا بنا ہوا تھیلا سا ملا۔ جو دھوپ کے بچاؤ کے لئے میں نے سر پر رکھ لیا۔ راستہ اب ایک کوہ کے اُوپر چڑھنے لگا۔ اس کی بلندی یہاں بہت زیادہ نہ تھی۔ لیکن چڑھائی پر چڑھنے کا دم مجھ میں باقی نہ رہا تھا۔ چلنے کو تو چل پڑا لیکن تھوڑی دُور چڑھ کر ہمت ہار گیا۔ زانو درد کرنے لگے۔ سانس چڑھ گیا دم پھُول گیا۔ راستے کا نشان پانی کے بنائے ہوئے راستے میں غائب ہو گیا۔ میں نے بیٹھ کر اور لیٹ کر رینگنا شروع کیا درختوں کی شاخوں کو پکڑ پکڑ کر چڑھتا رہا۔ پتھروں کا سہارا لے لے اور دم ٹھیک کر کر سلسلۂ رفتار جاری رکھا۔ بارہا ہمت ٹوٹ گئی۔ اور نئے خیالوں سے تازہ دم

---

[1] مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خاصہ دور جا کر میں اس چشمے کا پانی پینے کے لئے دوبارہ واپس آیا۔

کر کے اٹھتا بمشکل تمام چوٹی پہ پہنچا تو اس جگہ سے ایک نئی دنیا مجھے نظر آئی۔ مقابل سمت میں جہانتک نظر کام کرسکتی تھی سلسلۂ کوہ اتنا گہرا چلا گیا تھا کہ عمق کا اندازہ کرنا محال تھا۔ نیچے کی بلند اور مرتفع گھاٹیاں ایسی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ کہ گویا ایک وسیع میدان ہے نشیب و فراز سب مسطح نظر آتا تھا۔ بائیں جانب یعنی شمال کو نظر کرنے سے کسی میدانی زمین کے نہایت خفیف آثار نظر آتے تھے۔ جو یقیناً وادیٔ ترم تھی۔ سامنے کا منظر ایک نقشہ کی طرح پیشِ نظر تھا۔ اور میل ۱۰ میل کے فاصلہ تک راستہ کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس بیم ورجا کے حسرت بھرے منظر پہ ایک عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ گذشتہ رات کی تمام محنت رائیگاں جانے کی حسرت بھری داستان کا رنجیدہ سبق پیشِ نظر تھا۔ اسلئے سمتوں کو اچھی طرح جانچا میدانی زمین کے نشان پہ ٹکٹکی جما کر دیر تک دیکھتا رہا اندازاً خیال کیا۔ کہ لگاتار رفتار کے ساتھ نصف شب سے پہلے پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اپنے راستے کی سمت کو خیال میں جمانا شروع کیا۔ یہاں سے راستہ نہائت فراخ ہو جاتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا۔ کہ کسی خاص ضرورت نے انسان کو مجبور کر کے اسے بنوایا ہے۔ دور دراز تک اس کے نشانات کا پتہ چلتا۔ اور نہایت نشیب میں ایک گھاٹی کے پاس سے اس کی ذراسی سفیدی نظر آتی جس کے بعد بالکل غائب ہو جاتا۔ یہ سفیدی یہاں سے تقریباً مشرق کی طرف تھی۔ اس لئے میں بے خطر اس پہ ہو لیا۔ میرے دائیں جانب وہ لامتناہی سلسلۂ کوہ آسمان سے باتیں کرتا چلا گیا ہے جس میں رات بھر میرے نصیب بصورتِ گرداب چکر کھاتے رہے۔ چڑھائی پر چڑھ کر نشیب میں اُترنا مجھے نہایت

آسان معلوم ہوا۔ اور میں لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ زیادہ سلامی کی وجہ سے راستہ زیادہ پیچ و تاب کھاتا تھا۔ اس لئے میں کئی جگہ خطِ مستقیم میں ہو کر اترتا۔ ایک جگہ ایک گدھے کا پالان مع لکڑیوں کے ایک بوجھ کے گرا پڑا تھا۔ جس کے گر کر رہ جانے کی وجہ پر دل میں بہت دیر تک غور کرتا گیا۔ زخمی حلق پیاس کی ذرا سی سختی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بے طرح تنگ کرنا شروع کیا۔ راستے کے بائیں جانب ایک نالا بن رہا تھا جو اب کافی بڑا ہو گیا تھا۔ امید کی آنکھ کسی چشمہ کی تلاش میں نالے کی وسعت کے چپہ چپہ کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ راستہ میں کہیں کہیں چڑھائی بھی آجاتی۔ جسے طے کرنا بہت دشوار ہوتا۔ جھاڑیاں یہاں پر اسقدر گنجان تھیں کہ راستہ بار بار ان میں گم ہو جاتا۔ چوٹی سے چار میل اترائی اتر کر ایک اور گاؤں ملا جو پہلے گاؤں کی بنسبت بہت بڑا تھا۔ چھپروں کے ڈھانچے کھڑے تھے۔ اور مسجد مسقف بے کم و کاست کھڑی تھی۔ اس کا فرش کھود کر نیچا کیا ہوا تھا۔ اور دو حصوں میں منقسم تھی۔ عین وسط میں ایک انگیٹھی بنی ہوئی تھی۔ جس کے گرد سلیقے سے پتھر لگے ہوئے تھے۔ میں سارے گاؤں میں پھرا۔ تاکہ کسی قسم کا کوئی برتن یا کوئی ذریعہ پانی ساتھ لیجانے کا دستیاب ہو۔ لیکن بالکل ناکام رہا۔ بار بار دل میں یقین پیدا ہوتا۔ کہ میں برتن بنا لینے یا پا لینے میں کامیاب ہوں گا۔ یہی ایک امید اور ارادہ ایسا تھا۔ جس میں آخر تک مجھے ناکامی رہی۔ گاؤں کے پاس نالے میں بڑے بڑے چشمے جاری تھے۔ پانی ذرا گرم تھا۔ اللہ کا شکر کر کے پیا اور وضو کیا۔ دن کی نہایت گرمی کا وقت ابھی درپیش تھا۔ اس لئے میری بڑی کوشش تھی کہ کسی طرح پانی ساتھ رکھنے کا

بندوبست ہو جائے۔ برتن سے نا امید ہو کر مسجد میں بیٹھ کر پاجامے کو مشک کی صورت میں بنایا۔ دریدہ جگہوں پر گرہیں دیں۔ اور پانی سے بھر کر کندھوں پر رکھ لیا۔ یہ ایک نہایت بیہودہ کوشش تھی۔ جھٹ خالی ہو گیا۔ البتہ پانی پاجامے سے ٹپک کر بدن پر گرتا تھا جس سے کچھ وقت تک گرمی کا بچاؤ رہا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ پاجامہ چوسنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ کا راستہ طے کر کے نالے میں پھر بہت بڑے چشمے ملے۔ اور میں نے ان کو اپنی بادشاہت سمجھ کر چند منٹ لطف اٹھایا۔ ان کا پانی رواں تھا۔ پتھروں پر خوب مزے سے لیٹتا رہا۔ پاجامہ اور قمیص کو تر کر کے اس جگہ کو بھی الوداع کہا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پیاس نے پھر گلا خشک کر دیا۔ اور نظریں پھر نالے کی طرف دوڑنے لگیں دیر کے بعد ایک پہاڑ کے دامن میں سیاہ رنگ کی چکنی مٹی نمدار پھر نمودار ہوئی۔ میں نے اس کو تھپک کر قمیص کا کپڑا اس پر رکھا۔ اور چوسنا شروع کیا سوائے اس کے کہ حلق میں مٹی جم گئی۔ اور کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بدن کو دھوپ سے بچانے اور تر کرنے کے لئے مٹی کو لے کر اپنے سینے اور پشت پر تھوپ لیا۔ اور چل دیا۔ تھوڑی دیر میں مٹی سوکھ کر وبال جان بن گئی۔ اور ایسی چمٹی کہ کسی طرح اترتی ہی نہ تھی۔ مسام بند ہو گئے اور جی گھبرانے لگا۔ تھوڑی دور اور نکل کر راستہ مسطح زمین پر ہو لیا۔ اب فاصلے فاصلے پر پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں ہر پہاڑی کے پیچھے قوم کا خیالی دریا لہریں لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ میرا اضطراب ایک دفعہ پھر غائت درجے تک پہنچ گیا۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ کر اب ڈھلنے لگا ماہ جون کی دھوپ میں سنگلاخ پہاڑوں کی تپش۔ اس پر دن کا گرم ترین وقت

اور طرفہ برآں جسم پر مٹی کا پلستر۔ ان جملہ اسباب نے میرے شیرازہ جمعیت کو درہم برہم کر دیا۔ شدتِ تپش سے بخار بھوتوں کی صورت میں بن بن کر ناچنے لگے حسرت کو بڑھانے کے لئے تیتر "سبحان تیری قدرت" کے نعرے لگا رہے تھے بڑے بڑے پتھر مختلف صورتوں میں دھوکے دینے لگے۔ ابھی تک میں نے غریب پاؤں کی خبر نہیں لی۔ کہ ان بیچاروں پر کیا گذری۔ اصل میں سارے بدن کا بوجھ تو یہ اٹھائے لیجا رہے ہیں۔ مارے پیاس کے جب میں زمین پر موت کے انتظار میں لیٹ گیا۔ تو انہی کی ہمت تھی کہ پانی تک پہنچا دیا۔ رات بھر اتنی بلند گھاٹیوں اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چوٹیوں کو عبور کرنا انہی کے طفیل سے تھا۔ ان بے زبانوں سے کون پوچھے کہ کس طرح گذری۔ اپنے حال کا اظہار خون کے اشکوں سے کر رہے تھے چپلی کے تسمہ نے انگوٹھے کی گھاٹی کو کاٹا تو دوسری گھاٹی کی باری آئی۔ اس سے خون بہنے لگا تو تیسری کو زخمی کیا۔ اس کا گوشت پھٹ گیا تو چوتھی کو گھائل کیا۔ پھر ہلی کی باری آئی۔ ایڑی کا تسمہ گوشت کاٹ کر ہڈی کے اندر گھسا جا رہا تھا۔ اور تمام زخموں سے خون ٹپک رہا تھا۔ پٹھے کی چپلی کہاں تک ساتھ دیتی۔ اس کے تسمے گھس کر باریک ہو گئے۔ گویا پاؤں کے کاٹنے کیلئے ہتھیار تیز ہو رہے تھے۔ آزار بند نکال کر چپلی کو پاؤں سے باندھا لیکن وہ بھی کب تک برداشت کرتا۔ پھر پائنچوں کی موہریاں پھاڑ کر استعمال کیں۔ وہ بھی تلف ہو گئیں۔ اور پاجامے کی باری آئی۔ میری آبلہ پائی پر ببولیوں کے کانٹے مرہم نہی کا کام کر رہے تھے لیکن مجھ پر محویت کا ایسا عالم طاری تھا۔ کہ یہ تمام تکالیف بے اثر تھیں۔ اور میری رفتار پر کوئی اثر نہ ڈال رہی تھیں۔ البتہ اس وقت پیاس نے بیتاب کر دیا۔

اور ایک دفعہ پھر کل والی حالت کے قریب قریب پہنچا دیا۔ ہر طرف سے "سبحان تیری قدرت" "سبحان تیری قدرت" کے نعرے گونج رہے تھے۔ نگاہ نالے کی تہ کے پتھروں میں دوڑی چلی جا رہی تھی۔ لیکن اب میرا راستہ نالے سے علیحدہ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کی سوچ کے بعد میں نے راستے کو نالے پر ترجیح دی اور نالے کو الوداع کہہ کر راستے کو اختیار کیا۔ دھوپ اور گرمی کی شدت سے بُخارات زمین سے اٹھ رہے تھے۔ اور دُور کے پتھر حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ آخر کار میرے دائیں جانب پہاڑی کے پتھر نمدار معلوم ہوئے! اور ساتھ ہی میری امیدوں کو تازہ کرنے والے زرسل[1] کی ایک لمبی اور سرسبز بلند قطار نظر آئی۔ اور میں جلدی ایک اور شفاف چشمہ کے سر پر کھڑا تھا۔ یہ ایک نالی کی صورت میں پہاڑی کے عین دامن میں بہتا اور تھوڑی دُور جا کر غائب ہو جاتا۔ اس میں پانی بہت کم تھا۔ اور ذائقہ میں بھی شور تھا۔ دل میں قدرتاً خیال پیدا ہوا۔ کہ اللہ نے میری نہ بجھنے والی پیاس کے لئے یہ شور پانی مجھے پلایا ہے کیونکہ میرے حلق کے زخموں کو اس سے تسکین ہوئی۔ اور زبان بھی اتنی جلدی خشک نہ ہو گئی۔ اپنے بدن اور سر سے مٹی کی بلا کو دُور کیا۔ وقت ایک بجنے کے قریب تھا۔ اور سورج عین سر پر تھا۔ ایک طرف پہاڑی اور دوسری طرف زرسل کی بلند پیداوار سورج کی کرنوں کو روک نہیں سکتی تھیں میں گچّا ہو کر تھوڑے سے سایہ میں کچھ دیر کے لئے پڑا رہا۔ کپڑے اتار کر پانی میں پھینک دئے۔ دھوپ

[1] میں نے وہاں تجربہ سے یقینی طور پر معلوم کر لیا تھا۔ کہ جہاں زرسل کا ایک پودا بھی کھڑا ہو۔ وہاں ایسے چشمہ کا ہونا لازمی تھا جس میں بارہ مہینہ پانی رہتا ہو۔ گویا مسافر کے لئے چشمہ کی شناخت کو قدرت نے اس پر جھنڈا لگا دیا ہوتا۔ تاکہ دُور سے نظر آجائے۔

کی سختی کا وقت شاید میں یہیں گذارتا لیکن بالکل سایہ نہ ملا۔ ایک دفعہ جیب سے پھر کل والی گریاں نکالیں لیکن عقلِ حیوانی نے ان کے کھانے کی اجازت نہ دی۔ آدھی کے قریب وہیں گر گئیں لیکن میں نے ان کو بے سُود سمجھ کر پروا نہ کی وضو کر کے نمازِ ظہر ادا کی اور چل دیا۔ نالہ مجھ سے بہت دُور ہو گیا۔ اور میدانی راستے پر چلنے لگا۔ سُورج میری پُشت پر چمکتا تھا۔ پٹھے کا مذکورہ چھاتا میرے سر پر تھا۔ پاجامہ لنگوٹے کی طرح کس رکھا تھا۔ ننگی پنڈلیوں پر دھوپ بہت تیز معلوم ہوتی۔ پاؤں کے زخموں سے مجبور ہو کر چپل کو کئی دفعہ اتارتا اور پھر پہن لیتا۔ کیونکہ زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ کچھ فاصلہ پر پہاڑی نظر آتی۔ اور یہ خیال ہوتا شاید اسی کے پیچھے قرم دریا ہو۔ وہاں پہنچ کر ایک ویسی ہی پہاڑی اور نمودار ہو جاتی۔ گویا منزل اور دُور جا پڑتی۔ اور اس سلسلے سے ایسا محسوس ہوتا کہ منزل مجھ سے آگے آگے بھاگ رہی ہے۔ ؏

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

قریب تین میل کے سفر کے بعد راستہ ایک بڑے بھاری نالے پر پہنچا یہاں راستے کی فراخی بہت بڑھ گئی۔ اور نالے کے بلند ساحلوں کو سلامی کر کے یہ راستہ ایک گیپ وے (Gapway) کی طرح اس کو عبور کرتا ہے۔ اس نالے کے پرلی طرف ایک گاؤں سنسان کھڑا تھا۔ جو پہلے گاؤں کی طرح برباد شدہ چھپروں کے نشان میں نہیں تھا۔ بلکہ پتھروں اور گارے سے بنی ہوئی دیواروں کی فصیل اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی جس میں

ایک دروازہ نالے کی جانب تھا۔ گاؤں کے نیچے نالے کی عمودی گہرائی پندرہ فٹ کے قریب تھی۔ اور گاؤں عین سر پہ کھڑا تھا۔ اس گاؤں کے مقابل نالے کے دوسرے کنارے پر ایک گھاٹی تھی۔ جو نالے کی طرف ایک چشمے کو دامن میں لئے جھکی کھڑی تھی۔ یہ چشمہ بہت بڑا تھا۔ اور اس میں صاف وشفاف پانی لہرا رہا تھا۔ اور گھاٹی کے نیچے سائے میں ہونے کی وجہ سے پانی خوب ٹھنڈا تھا۔ اسی سیماب سے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کودتی پھرتی تھیں۔ اس مستقل گاؤں کی شکل دیکھ کر میں ٹھٹکا اور چھپ کر دیکھتا رہا حتیٰ کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آباد نہیں۔ پھر میں نے بلند آواز سے پکارا۔ کہ اگر کوئی ہے تو نکل آئے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا دھوپ سے میرا بدن تپ رہا تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ میں نے اسے ٹھنڈا کیا اور چشمے میں گھس گیا۔ میرے تمام بدن پر رات کے کانٹوں۔ شاخوں اور پتھروں پر گرنے کے زخم تھے چھوٹی مچھلیوں نے مجھے مالِ غنیمت سمجھا۔ اور زخموں پر آکر منہ لگائے۔ ان کی حرکات مجھے نہایت پیاری معلوم ہوئیں۔ اور میں ان سے کھیلتا رہا۔ میں نے ایک دو مچھلیوں کو پکڑا اور دیکھ کر چھوڑ دیا۔ یہ چشمہ ایسی سایہ کی جگہ تھا۔ کہ یہاں آرام کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن ؏

سایہ و چشمہ بصحرا دمِ عیشے دارد
اگر اندیشۂ منزل نہ بود رہزنِ ما

پاؤ گھنٹے کے بعد میں نکلا جی میں آیا کہ گاؤں میں گھس کر کوئی کھانے کی شے یا پانی کا برتن تلاش کروں لیکن پٹھانوں کی خست سے مجھے قطعی ناامیدی تھی۔ کہ ایک دانہ بھی گرا پڑا ہو۔ علاوہ بریں دھوپ گھبرا رہی تھی۔ اور ایک لمحہ بھی ضائع

کرنا خلافِ مصلحت تھا یہاں راستہ چھوٹی چھوٹی شاخوں میں منقسم ہوگیا۔ اور مجھے راستہ اختیار کرنے میں بہت دشواری پیش آئی۔ یہاں میں نے اپنے حواس کو درست کر کے غور کرنا شروع کیا۔ میرا خیال تھا کہ غالباً یہ نالا وہی ہوگا جس میں علے الصبح میں پہنچا تھا۔ ان راستوں میں سے ایک راستہ تو قبرستان کی طرف جاتا تھا۔ اور باقیماندہ سے میں نے ایک زیادہ مستعمل راستہ اختیار کر لیا جو مشرق کی جانب جاتا تھا۔ کچھ دُور جا کر ایک عمارت نظر آئی جس پر پہلے دُور سے طرح طرح کے گمان گذرتے تھے۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ زیارت ہے۔ اس پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھا۔ اشتہا کی وجہ سے جسم میں نہایت درجے کی کمزوری محسوس ہونے لگی۔ اور یقین ہونے لگا کہ اگر تھوڑی دیر اور بھوکا رہنا پڑا تو طاقتیں جواب دے جائیں گی۔ ہر چند غور کیا لیکن کوئی خوردنی چیز خیال میں نہ آئی۔ مجبوراً مویشیوں کا گوبر جو کہیں کہیں راستے میں خشک پڑا تھا میں نے اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اور اپنے تھیلا دار چھاتہ میں ڈالتا گیا۔ گوبر کو دیکھ کر اور خاص کر کھانے کا خیال کر کے بھوک بہت چمک اٹھی۔ اور انتظار دشوار ہوگیا۔ میں سمجھتا تھا کہ شرعاً اس کا کھانا مجھ پر حلال ہوگیا ہے کیونکہ میں قریب المرگ ہو رہا ہوں۔ میں نے پانی کی تلاش کی اور چار بجے کے قریب راستہ سے دُور مجھے چشمے کے نشان بصورت نرسل نظر آئے۔ جا کر دیکھا کہ اچھا وسیع چشمہ استادہ پانی کا ہے۔ جس کے گرد اور درمیان بلند نرسل کے پودے کھڑے ہیں جس کے باعث پانی کا رنگ سبز نظر آتا ہے۔ اس پانی میں مینڈک بھی اُچھل کود رہے ہیں۔ میں نے جا کر کپڑوں کو اتار دیا۔ اور پاؤں پانی میں ڈال کر بیٹھ گیا۔ آہ اس دشتِ غربت میں اس وقت کیا سماں ہے چاروں طرف

دھوپ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ تکان سے چُور ہو رہا ہوں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے
گویا شدّت سے بخار ہو رہا ہے۔ بھوک سے بےحال۔ اور جنگل بیابان کی نہ ختم
ہونے والی منزل درپیش یکہ و تنہا چشمہ کے کنارے بیٹھا ہوں۔ ؏

دشتِ غربت ہے علالت بھی ہے تنہائی بھی

اور ان سب پہ فزوں بادیہ پیمائی بھی

آہستہ آہستہ میں چشمے میں داخل ہوا۔ مینڈک کو میں نے اس خیال سے پکڑا
کہ کچا چبا جاؤں لیکن پھر چھوڑ دیا۔ کہ شاید اس کی جان بخشی سے ہی اللہ میری
جان بخشی کر دے پھر پکڑا اور پھر چھوڑ دیا۔ ؏

بجان زندہ دلاں سعدیا کہ ملک وجود

نیرزد آنکہ وجود ے زخود بیازاری

آخر میں کنارے کے ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔ تھیلے سے زادِ راہ یعنی گوبر کو نکالا تھوڑا
سا لیکر پانی میں بھگویا اور نکال کر پتھر پہ رکھ دیا۔ خوب نرم ہو گیا۔ تو میں نے ہاتھ
سے توڑا۔ اس کے اندر گیہوں کے دانے نظر پڑے۔ ایک ٹکڑا لے کر مُنہ کی
طرف لایا لیکن طبیعت نے اجازت نہ دی۔ مَیں اٹھ کر ایک بلند پتھر پہ کھڑا ہو گیا۔ اور
زور سے چلّایا۔ کہ میں بھوک سے مجبور ہو کر مردار کھانے لگا ہوں۔ اگر کوئی میری
آواز سنتا ہے۔ تو وہ اس حرام خوری سے مجھے بچائے لیکن یہ ایک مجنونانہ حرکت
تھی جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ واپس آ کر پھر کھانے کی کوشش کی۔ لیکن
ناکام پھر باہر نکل کر چلّایا۔ اسی طرح تین دفعہ کیا۔ چوتھی دفعہ میں نے ہی التجا خدا سے
کی۔ کہ اے میرے مالک میں نے انسانی قوت کو تین بار پکارا لیکن مجھے کوئی مدد

نہیں ملی۔ اب میں تیرے آگے چِلّاتا ہوں۔ کہ اے خدا میرا آخری دم جلد اِن روزی پر ختم کر اور اس حرام خوری سے نجات دلا۔ سچّے دل کی اس التجا سے ایک خاص اثر میرے دل پر ہوا۔ اور مجھے تسکین سی معلوم ہونے لگی۔ میں نے پانی پینے معدے کو پُر کر لیا۔ گوبر کو تھیلے میں سنبھال لیا۔ پھر اللہ پر توکل کر کے یہ کہتا ہوا چل دیا ؎

باغباں تو ہی کسی شاخ پہ ٹھہلا دے مجھے

بے پر و بال ہوں اور طاقت پرواز نہیں

راستہ نالے کے متوازی قریب نصف میل کے فاصلے پر جا رہا تھا۔ دن ڈھلنے لگا۔ اور سُورج کی تیز شعاعیں میری بد قسمتی کی طرح ماند پڑنے لگیں۔ سارے دن ہوا بند رہی تھی۔ اس وقت قدرے اسے بھی میرے نصیبوں کی طرح حرکت ہوئی قریب پانچ میل سفر کے بعد وہی نالا پھر میرے راستے کو قطع کرنے لگا۔ لیکن اس کا پاٹ اتنا چوڑا تھا۔ کہ دو پہاڑیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ قدِ آدم مرزئی راستے کے دونوں جانب کھڑی تھی۔ سُورج کی گرمی کم ہو جانے سے پھر دل کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔ اور میں خیال کرنے لگا کہ انشاء اللہ ایک رات برابر چلنے کا دم رکھتا ہوں میرے دائیں پاؤں کی چپلی بالکل پاش پاش ہو گئی تھی حسنِ اتفاق سے ایک پاؤں چپلی کا پُرانا راستے میں پڑا پایا۔ جو ناکارہ سمجھ کر کوئی پھینک گیا ہو گا لیکن میری چپلیوں سے وہ بدرجہا اچھا تھا۔ اپنی چپلی کو میں نے تھیلے میں ڈالا اور اس کو پہن لیا۔ تھوڑی دُور آگے چل کر مجھے ایک رسی کا ٹکڑا ملا وہ بھی اٹھا کر تھیلے میں داخل کر لیا۔

دھوپ نے اپنی چادر فرشِ زمین سے بالکل لپیٹ لی ہے۔ اور پہاڑیوں کے سروں پر اکٹھی کر کے رکھ دی ہے۔ ایک چکر لگانے سے ناگاہ کیا دیکھتا ہوں۔

کہ ایک بڑا دریا شور و غوغا کرتا ہوا میرے آگے لہریں مار رہا ہے جس کی دوسری جانب ایک گاؤں آباد ہے۔ اور آدمی چل پھر رہے ہیں۔ یہ مجھے پہلے ہی علم تھا۔ کہ توم دریا کی دوسری جانب علاقہ سرکار انگلشیہ ہے لیکن خوشی اور مسرت کی کوئی حد نہ رہی جبکہ میں نے تار کے ستونوں کو پکی سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا۔ مجھے ضرور شادی مرگ ہو جانا چاہیئے تھا لیکن اصل میں میری قوتِ حس مر چکی تھی۔ رنج و خوشی کا گہرا اثر مجھ پر نہیں ہو سکتا تھا۔ زندگی اور موت میں بہت فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ خاص کر جبکہ مجھے ابھی دریا کو عبور کرنا ہے۔

لبِ دریا کھڑے ہو کر میں نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے تھوڑی دیر توقف کیا۔ شاعرانہ تخیل نے جن جن مصیبتوں کے تصور کو الفاظ کا جامہ پہنا کر کاغذی دنیا کو آباد کیا ہوا ہے۔ وہ تمام کیفیتیں قدرت کے خاموش ہاتھ نے اس تھوڑے سے عرصہ میں مجھ پر یکے بعد دیگرے گذاریں۔ آزادی کی مستانہ خواب کا چشم زدن میں اسیری کی بیداری سے مبدل ہو جانا۔ رائفلوں اور خنجروں کے درمیان بے بسی کا طویل سفر۔ زنجیر و سلاسل کی پاؤں میں روح فرسا جھنکار۔ کاٹھ کی تکلیف دہ گھڑیاں پتھروں کے بچھونے پر بازو کا تکیہ۔ انسانی جسم کو گرم لوہے سے داغ دینے کا دلدوز منظر۔ غریب الوطنی میں غلامانہ زندگی اور غلاموں کی طرح قیمت اور فدیہ کا تقرر عزیزوں کی جدائی۔ قتل کی دھمکیاں۔ اور آخر میں بے رحمیوں سے قتل کئے جانے کا فیصلہ۔ زنجیروں کا توڑنا جنگل بیابان اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرنا۔ منزلِ مقصود کا لاپتہ ہونا۔ راستہ کی گم گشتگی۔ شدت کی دھوپ۔ پیاس سے جان بلب ہونا۔ بھوک

---

[1] یہ دریائے توم تھا۔ جو مابین سرکار انگلشیہ و افغانستان کے حدِ فاصل ہے۔

سے گوبر کھانے پر اُتر آنا۔ یہ سب کٹھن منزلیں مجھ پر گذر چکیں۔ راستہ میں دریا حائل ہونے کی کسر باقی تھی۔ وہ آبِ قرم نے پوری کر دی جسکو عبور کرنے کیلئے نہ کشتی ہے نہ ملاح۔

دریا و کوہ در رہ من خستہ و غریب

اے خضر پے خجستہ مدد کن بہمتم

میں نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر پار پہنچنے کی تجاویز پر غور کیا آخر میرے دل میں خیال گذرا۔ کہ جس اللہ نے اتنی ناقابلِ برداشت مصیبتوں سے مجھے رہائی دی ہے۔ اب بھی وہی مالک ہے۔ اگر زندگی باقی ہے۔ تو اس کی عنایت سے پار ہو جاؤں گا۔ اگر اس نے منزلِ مقصود کے اتنا قریب پہنچا کر بلا لیا تو سرِ تسلیم خم ہے۔

سارا دن دھوپ کی تپش میں چلنے کے بعد اس برفاب کی خنکی اور لطافت بھی ایک عجب کشش اور جذب اپنے اندر رکھتی تھی۔ اور ایسے لطیف اور ٹھنڈے پانی میں غرق ہو کر جان دینا بھی اک عیش معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں پانی میں اللہ کا سہارا لے کر کود پڑا۔ ؏

ناخدا در کشتیِ ما گر نباشد گو مباش

ما خدا داریم ما را ناخدا در کار نیست

ابھی پانی میں تھوڑی دُور ہی گیا تھا۔ کہ تہ میں پتھر اس زور سے آئے کہ پاؤں ٹوٹنے لگے۔ روانی اسقدر تیز تھی کہ گھٹنوں سے اُوپر پانی کی گہرائی میں کھڑا رہنا محال تھا۔ میری ٹانگیں بید کی طرح کانپنے لگیں۔ اور سنبھلنا ناممکن ہو گیا یقینی موت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی...... ساحل پر ایک حسرت بھری آخری نظر ڈالی۔ میری ٹوٹی پھوٹی چپلیاں اور گوبر کا زادِ راہ میری آخری نشانی لبِ دریا میرے غرق ہونے کی

جگہ کا پتہ میرے بعد دے رہی ہوں گی ۔

رہ رو تفتہ و در رفتہ بآم غالب
توشۂ برلب جو ماندہ نشانم باقی ست

اسی سوچ میں تھا کہ ایک ایسی لہر آئی جس نے دھڑم سے نیچے گرادیا۔ اور حباب کی طرح پانی بہالے چلا۔ میں تھوڑا تھوڑا تیرنا جانتا تھا۔ ہاتھ پاؤں مار کر سنبھلنے کی کوشش کی لیکن پانی کی تیزروی کے سامنے کوئی پیش نہ گئی ۔ اور غوطے کھانے لگا۔ دریا کے وسط میں ایک " بریتہ " تھا خوش قسمتی سے بہاؤ مجھے اس کی طرف لیگیا بریتے پر پہنچ کر میں نے اپنی پریشان حالی کو پھر مجتمع کیا۔ اس کے دوسری طرف دریا کی شاخ پایاب تھی ۔ اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس سے میں بآسانی گذر گیا پار گذر کر میں نے اللہ کی ایک اور قدرت دیکھی ۔ میں اخیر منزل پر پہنچ گیا۔ جب دریا سے گذر چکا تو پاؤں کے زخم سب تازہ ہو گئے ۔ ان میں ایسا شدید درد محسوس ہوتا تھا۔ کہ میں ہرگز زمین پر رکھ نہیں سکتا تھا عین لب دریا فصلیں ایستادہ تھیں ۔ جن میں پانی کھڑا تھا۔ پاؤں کے تلے یہ زمین ریشم کی طرح معلوم ہوتی ۔ اور بالشت بھر پاؤں نیچے دھس جاتے ۔ انہی فصلوں کو خراب کرتا میں ایک نرم گھاس والی زمین پر پہنچ گیا ۔ بصد مشکل اس قطعہ سبز کو بھی قطع کر کے پکی سڑک پر پہنچا۔ اس زمین کی سختی تو میرے پاؤں ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے تھوڑے سے ہی فاصلے پر چند پٹھان گندم سے بھوسا اڑا کر صاف کر رہے تھے ۔ ہمت کر کے میں ان تک پہنچا۔ میری شکل عجب نظارۂ حسرت و وحشت تھی ۔ ایک پھٹی قمیص گلے میں ٹانگیں ننگی ۔ پاجامہ کا باقی ماندہ حصہ دیوانوں کی طرح ستر ڈھانکنے کے لئے باندھے

ہوئے۔ سر کے بال کچھ حالات کے تقاضا اور کچھ قدرتاً سخت ہونے کی وجہ سے تیروں کی طرح کھڑے تھے حجامت بڑھی ہوئی۔ آنکھیں شدتِ بخار سے سُرخ۔ عقل مفقود اس پر پانی کپڑوں سے ٹپک رہا تھا میں نے پاس پہنچ کر پشتو میں سلام کہی اور نہایت عاجزی سے کہا۔ کہ خدا کے لئے دو لقمے ٹکڑے کے مجھے منگوا دو۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اور کہنے لگے دیوانہ آگیا۔ دیوانہ آگیا میں نے عرض کی میں دیوانہ نہیں ہوں۔ فلک زدہ قسمت برگشتہ تمہارے جیسا انسان ہوں۔ مجھے تھوڑا سا کھانے کے لئے دو تاکہ مجھ میں قوت آئے۔ اور اپنا حال سُنا سکوں۔ اس کہنے پر دو ایک نے قہقہ لگایا۔ اور میری درخواست کو ہنسی میں اُڑا دیا اب انہیں یقین دلاؤں تو کس طرح۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ اپنے قصے سے انہیں جھٹ پٹ آگاہ کر دوں۔ آخر میں بُھس کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چلایا کہ او دیوانے اندھا ہو جائے گا یہاں نہ لیٹ۔ میں نے جواب دیا۔ کہ بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ آنکھوں کو کیا کروں۔ اس شخص کو کچھ خیال آیا میرے پاس آکر بھوسہ سے مجھے اٹھایا۔ ایک غمخوار کی طرح میری جانب دیکھا۔ اور خاص دلچسپی سے میری حرکات کو ملاحظہ کرنے لگا۔

اس وقت سُورج غروب ہو کر میری مصیبت کے آخری دن کو ختم کرنے والا تھا۔ نمازِ عصر قضا ہوتی دیکھ کر میں اس طرف بڑھا جہاں پٹھانوں کے فالتو کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے مَیں نے ایک چادر اٹھالی۔ میری اس حرکت کو انہوں نے دیوانگی پر محمول کر کے مجھ سے چھیننی چاہی۔ میں نے کہا مجھے نماز ادا کر لینے دو پھر واپس کر دوں گا۔ اس پر اس غمخوار نے ان سے کہا۔ کہ صبر کر کے دیکھو

تو سہی یہ کرتا کیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں پاجامہ کا کچھ حصّہ اور ازار بند چیلیوں کی نظر ہو چکا تھا۔ باقی ماندہ لنگوٹ کی طرح باندھ رکھا تھا میں نے چادر تہ بند کی طرح لپیٹی اور وہ لنگوٹ اتارا۔ اس اثنا میں میرا بدن اکڑ گیا۔ اور چلنے میں لڑکھڑانے لگا۔ اس فرشتۂ رحمت نے مجھے تھام لیا۔ اور میں اس کے سہارے ایک بہتے پانی کی طرف بڑھا۔ جہاں میں نے وضو کیا۔ اور نماز ادا کی۔ نماز کو درستگی کے ساتھ ادا ہوتے دیکھ کر میرے غمخوار کو خیال گذرا ہوگا۔ کہ میں یا تو کوئی مجذوب ولی ہوں یا کوئی حقیقی مصیبت زدہ۔ چنانچہ اس نے تعجب اور شفقت کے لہجہ میں پوچھا۔ کہ تم کون ہو۔ اور یہ حالت کیوں ہے۔ اس استفسار پر قدرتاً دل بھر آیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ اب میں علاقہ انگلشیہ میں محفوظ ہوں۔ اپنی رام کہانی کہہ سنانے کے لئے دل بیتاب ہو گیا لیکن فوراً اس بیتابی پر قابو پا لیا اور سوچا کہ ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے

اس لئے میں نے صرف اتنا ہی کہہ کر ٹال دیا کہ میری مصیبت کا قصہ دراز ہے آپ سن کر کیا کریں گے۔ البتہ آپ اگر کوئی سلوک میرے ساتھ روا رکھیں گے۔ تو وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ مجھے اشتہا نے بیتاب کیا ہوا ہے۔ اگر کوئی بچا بچایا روٹی کا ٹکڑا عنایت کر سکیں تو بڑا مشکور ہوں گا۔ اور نیز کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ کہ میں اس گاؤں کا ملّا ہوں۔ اور غالباً اس نیک بخت نے یہ سمجھ کر کہ یہ اپنے حال کی پردہ پوشی رکھنا چاہتا ہے۔ مزید استفسار

نہ کرتے ہوئے مجھے میری حالت پر چھوڑ دیا۔
اس وقت میں نے پکی سڑک پر ایک ہمت بھری نگاہ ڈالی اور اپنی قوتوں کا جائزہ لیا۔ کہ کیا میں اس وقت چل کر کسی نزدیک کے سرکاری قلعہ تک پہنچ سکتا ہوں لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں میرا بدن ایسا اکڑ گیا تھا۔ کہ ہلنے جُلنے سے بالکل رہ گیا۔ میں حیران ہوں کہ یہ حالت منزل پر پہنچ کر کیوں ہوگئی۔ کیوں نہ ایک گھنٹہ پہلے یا پیچھے ہوئی۔ غرضکہ اس ملّا نے ایک اور آدمی کو بلایا۔ اور میرے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر مجھے گاؤں میں لے چلے یہ گاؤں ایک اونچی پہاڑی کے سر پر واقعہ ہے۔ اور شاید اسی لحاظ سے اسے اُچت کہتے ہیں جس کے معنی پشتو میں اونچا کے ہیں۔ پہاڑی کی سلامی پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کے مکانات علیحدہ علیحدہ ایکدوسرے پر دہرے نظر آتے چند کلیوں کے نرگسی جمعیت کے مارے کو پناہ میں لینے کے لئے کُھلے دکھائی دیتے۔ مکانات پٹھانوں کی آبادی میں بمقابلتہً اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ یہ دونوں آدمی آہستہ آہستہ کچھ چلاتے ہوئے اور کچھ اٹھاتے ہوئے مجھے گاؤں میں لے پہنچے۔ راستہ میں ملّا صاحب نے اپنے گھر میں سے کسی کو بلا کر کچھ ہدایت کی اور مجھے گاؤں میں سب سے اونچی جگہ لے گئے۔ یہاں کا نظارہ نہایت دلکش تھا۔ اور مجھے عالمِ وجد میں لے گیا۔ علاوہ گاؤں کی خوشنما طرز کے دُور کے قدرتی نظارے نہایت دلفریب تھے۔ سب سے اونچی جگہ مسجد تھی۔ جس کے متعلق ایک تین فٹ اونچا چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر ریت بچھی ہوئی تھی۔ گاؤں کے نیچے دریائے ژوب لہریں لیتا بہ رہا تھا۔ ارد گرد سبز سبز کناروں اور چھوٹی چھوٹی فصلوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مخملی فرش پر سیماب لوٹ رہا ہے

اس دریا کے دوسرے کنارے وہ خوفناک درّہ صاف صاف نظر آرہا تھا جس کے کھلے ہوئے منہ سے میں ابھی ابھی دریا میں گر گیا۔ مشرق کی جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آپس میں ملتی ہوئی ایک حیرت انگیز سلسلۂ کوہ پیدا کرتی تھیں۔ دریا اور گاؤں کے درمیان پکی سڑک حائل تھی جس کے کنارے پر ٹیلیگراف کے ستون اور تار کی سفید جھلک نہایت دلفریب دکھائی دیتی تھی۔ اس چبوترے پر ایک چارپائی بچھائی گئی۔ اس کے اوپر ایک خوبصورت نمدہ بچھایا گیا جس پر مجھے لٹا دیا گیا۔ ملّا صاحب نے پوچھا کیا کھاؤ گے۔ میں نے اپنے معدہ کی حالت کو مدّنظر رکھتے ہوئے عرض کی کہ اگر کچھ دودھ مل جائے۔ تو میں خوش نصیبی ہوگی چنانچہ ملّا صاحب گئے اور تھوڑی دیر میں ایک پیالہ بکری کے تازہ دودھ کا لے آئے جو میں نے نہایت شکر کر کے پی لیا۔ اور اللہ کی عنایت پر سپاس کرتا ہوا لیٹ گیا۔ ملّا صاحب نے پوچھا اور کیا کھاؤ گے۔ عرض کی اگر چاول مل سکیں۔ تو بڑی نوازش ہوگی۔
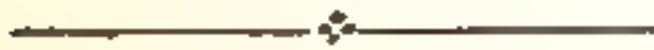
۱۔ لالہ سُندر لال

مجھ سے جُدا ہو کر میرے رفیق پر کیا گذری؟ اس کے جواب سے عہدہ برآ ہونا اگرچہ میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔ پھر بھی لالہ جی کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے کا فرض ادا کرنے میں مقدور اور امکان کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھونگا۔

جب لالہ جی سے رخصت ہو کر میں کھڈ میں روانہ ہو گیا۔ تو وہ کمین گاہ کے باہر میری طرف مُنہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کی ٹکٹکی میری پشت پر لگی ہوئی تھی۔ کھڈ بہت دُور تک سیدھی ہی چلی جاتی تھی۔ میں بھی مڑ مڑ کر حسرت سے ان کی طرف دیکھتا جاتا ایسے حالات میں ہم دونوں کو دوبارہ زندہ ملنے کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی۔ اسلئے ہم ایک طرح پر اس دُنیا میں اسے اپنی آخری مُلاقات سمجھ رہے تھے۔ نیچے تحت الثرٰی سے مجھے لالہ جی آسمان کی بلندی پر عید کے چاند کی طرح نظر آ رہے تھے۔ جب ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تو دونوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ لالہ جی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اُٹھ کر کمین گاہ کے اندر چلے گئے۔ حالات پر غور کرنے لگے۔ کچھ پیاس۔ کچھ تنہائی۔ اور پھر منزل مقصود سے لاعلمی۔ اس پر میرے واپس نہ پہنچنے کے امکان کا خیال کر کے سخت مضطرب

ہوئے۔ بار بار میرے واپسی کے راستے کو دیکھتے۔ آخر دل بھر آیا اور زار زار رونے لگے۔ ایسے نازک موقعوں پر قدرت ہمیشہ ان کی دستگیری کرتی چنانچہ بیخودی کا کلوروفارم سنگھا کر اور شفقت کے ہاتھ سے تھپک اس نے لالہ جی کو تپھروں کے بستر پہ گہری نیند سلادیا۔ لالہ جی کا مقولہ ہے کہ قسامِ ازل نے آدھی نیند ان کے حصہ میں اور باقی آدھی ساری دنیا میں بانٹ دی واقعی کیسا صحیح ہے۔ ایسی خطرناک منزل میں جبکہ خونخوار دشمن رائفلوں سے مسلح تلاش میں پیچھے لگے ہوئے ہوں۔ اور جبکہ قدرت کی عطاکردہ حواس اور قوے کو پوری طاقت کے ساتھ استعمال کرنے کے لئے نہایت چوکنا رہنے کی ضرورت ہو۔ لالہ جی کا اس طرح "گھوڑے بیچ کر سو رہنا" کس قدر تعجب انگیز ہے۔ گویا سب غموں سے سبکدوش ہو کر اپنے محل سرائے میں ریشمی گدیلوں پر استراحت فرما ہیں۔ سچ

براہ خفتن او ہر کہ بنگرد داند

کہ بر قافلہ در کارواں سرائے خفتہ است

ساری رات کا جاگنا، سفر کی تکان۔ اور اس پر لالہ جی کی نیند۔ ایسے غافل سوتے رہے کہ کروٹ تک نہ لی قیمت گھڑی سرہانے کہتی رہی کہ لالہ صاحب تمہارا ساتھی تمہیں چھوڑ کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا جنگل اور پہاڑ کا سفر درپیش ہے راستہ بتانے والا کوئی نہیں۔ آخر کیا کرو گے اور کب تک سوتے رہو گے۔

کارواں رفت و تو در خواب و بیاباں درپیش

کے روی۔ رہ ز کہ پرسی۔ چہ کنی۔ چوں باشی

دن چڑھ گیا۔ دوپہر ہوگئی۔ سورج مغرب کی جانب ڈھلنے لگا۔ آخر قدرت

نے مدہوشی کے کلوروفارم کو ہٹایا۔ اور بیداری کا گلاب ان کے چہرہ پر چھڑکا۔
لالہ جی عالم تنہائی میں سنسان پہاڑوں کے درمیان اٹھے اور اردگرد کو حیرانی کی نظر سے
دیکھنے لگے۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو انہیں معلوم ہوا۔ کہ وہ کہاں
بیٹھے ہیں۔ میرا جانا یاد کر کے میرے نہ آنے کا یقین ہوا۔ اپنی نیند کی مدت کا علم
نہ ہونے کے باعث میری طرف سے پھر بھی کچھ امید کی جھلک باقی تھی لیکن جب
درختوں کے سایوں کی طرف اور سورج کی گردش کی جانب توجہ کی تو حیران
ہوئے۔ اور میری طرف سے مایوس ہو گئے۔ ان کو میری جدائی کا سخت صدمہ
ہوا۔ اور سمجھے کہ اس کو ضرور کوئی حادثہ پیش آگیا ہوگا۔ پیاس بڑی شدت سے
محسوس ہونے لگی۔ اور پانی نہ ملنے کا خیال کر کے طبیعت اور بھی گھبرا گئی۔ آخر
تنگ آ کر انہوں نے ارادہ کیا۔ کہ چلو میں پیشاب کر کے اسی سے کام و دہن
کو تر کریں لیکن بدن کا تو لہو بھی خشک ہو رہا تھا۔ پیشاب کہاں سے آتا سخت
مایوس ہوتے۔ اور رُدھے پر میشر کہتے ہوئے جدھر سے اُترے تھے۔ اُدھر کو
چڑھنے لگے۔ صبح جس جگہ راستہ پر سے ہرنی کے خرام نے ہمیں ہٹایا تھا وہیں
سے راستہ کو جا پکڑا۔ اور اسی پر ہی چلنے لگے۔ شدت پیاس سے جو حالت
ان کی ہو رہی ہوگی۔ اس کا اندازہ میں اپنی حالت کی یاد سے لگا سکتا ہوں۔ ان
کا راستہ چکر کھاتا ہوا جنوب کی طرف ہو گیا۔ اور ایک کھڈ میں اترنے لگا۔
چار بجے کے قریب لالہ صاحب اچانک ایک چشمہ کے سر پہ پہنچ گئے۔ جس کا
پانی قدرے گرم تھا۔ لالہ جی پیاس سے جاں بلب ہو رہے تھے اس چشمہ حیات
کو پا کر جسقدر خوشی ان کو ہوئی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سیر ہو کر پانی پیا۔ تھوڑی

دیر توقف کیا اور ہرے رام کا جاپ کرتے ہوئے صحرا کی پہنائیوں میں امید و یاس کی پیہم کشمکش دامن قلب میں لیئے ہوئے چلدئے۔ راستہ اب پھر اُوپر کو چڑھنے لگا۔ اور ایک گھنٹہ کی چڑھائی کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں پر سے آگے پیچھے سب نشیب ہی نظر آتا۔ لالہ جی اس امر سے بے نیاز تھے۔ کہ ان کو کدھر جانا ہے اور وہ جا کدھر رہے ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ آخر راستہ کسی آبادی تک انہیں لے ہی پہنچیگا۔ جہاں پر پیاس بھوک اور سفر کی کلفتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور باقی توکل بر تقدیر یا قسمت یا نصیب۔ اس لئے لالہ جی نے سمتوں کی الجھن میں پڑنے کی بجائے راستہ کو اختیار کیئے رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اور اسی پر کھڈ میں اترنے لگے۔ یہ راستہ اصل میں کیتو نالا کے متوازی عین جنوب کو وادئے کیتند کے وزیر لوگوں کی بستیوں کی طرف جا رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک لالہ جی اسی کھڈ میں نیچے کی طرف اترتے رہے۔ جہاں ایک اور چشمہ انہیں ملا۔ اور اس سے بھی اپنی نہ بجھنے والی آتش تشنگی پر پانی ڈالا۔ سورج اس وقت مغرب کی طرف گھاٹیوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اور راستہ جنوب کیجانب کھڈ کے کنارے جو کہ اب نالا کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ تقریباً ہموار سطح پر جانے لگا۔ دو میل کا سفر طے کر کے ایک اور چشمہ ملا۔ یہاں سے بھی پانی پیا۔ تھوڑی دور آگے پیل کر ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں میں چمکتا ہوا ایک گاؤں نظر آیا۔ لالہ صاحب جھجکے اور تجسس کے لئے آڑ لیتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ جستجو سے انہیں یقین ہو گیا کہ گاؤں غیر آباد ہے۔ اس لئے بے خطر وہاں چلے گئے۔ گاؤں کے باہر توت اور بیری کے گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا

جس کے نیچے نہایت شیریں اور ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ قدرت کی لاانتہا رحمتوں کی یاد دلاتا تھا۔

غریب الوطنی تنہائی۔ اور تکان اس پر کڑکتی دھوپ میں سفر کی کلفت کے بعد شام غربت میں ایسے شیریں اور ٹھنڈے چشمہ کا سبز درختوں کے نیچے دستیاب ہونا۔ اپنے اندر ایک جذب رکھتا تھا۔ لالہ جی نے اسی کنارے ڈیرہ ڈال دیا۔ پانی کی لطافت کے مزے لینے لگے تھوڑی دیر آرام کیا لیکن دل کی بیتابی سے آرام کہاں نصیب۔ آخر اٹھے اور اسی راستہ پر ہولئے یہ راستہ اب کھنڈ سے علیحدہ ہو کر مغرب کی جانب پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ لالہ جی نے پہاڑی کی طرف نظر ڈالی تو وہ سدِ سکندری کی طرح سامنے کھڑی نظر آئی۔ اتنا دن کی طرف چلتے رہنے۔ اور چشمہ پر آرام کرنے کی وجہ سے ان کی حالت ایسی ہو چکی تھی۔ کہ اسقدر بلندی پر چڑھنا انہیں محال نظر آیا۔ اپنے کیسۂ ہمت کو ٹٹولا۔ تو اس میں اتنی طاقت نہ تھی جسے خرچ کر کے وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ جاتے۔ لہذا ارادہ کیا کہ رات یہیں بسر کرو۔ تڑکے اس کو سر کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ پہاڑی کے دامن میں کمرِ ہمت کھول کر شب باشی کے لئے ایک پتھر پر آرام سے بیٹھ گئے۔

قاعدہ ہے کہ اس طرح ہمت شکستہ ہو کر دلجمعی سے بیٹھنے کے تھوڑی دیر میں طاقتیں مجموع ہو جاتی ہیں۔ اور آرام کرنے پر قدرت حاصل ہونیکے خیال سے سفر کی تکلیف وہ مجبوری کا احساس کم ہو کر انسان کی ہمتیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی لالہ صاحب سے پیش آیا۔ اور تھوڑی دیر میں ہی ان کی

طاقتوں نے سفر جاری رکھنے پر آمادہ کیا۔ اور وہ پرمیشر کا آسرا لیکر پہاڑی کے سینہ پر ہمت کے پاؤں سے چڑھنے لگے۔ ہمت مرداں مددِ خدا۔ ایک گھنٹہ کی پیہم لڑکھڑا دینے والی چڑھائی کے بعد وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ اور قدرت نے ایک عجیب نظارہ انکے روبرو پیش کیا۔

چوٹی پر پہنچ کر سب سے پہلے بھیڑوں کے ممیانے اور کتوں کی عف عف کی صدا ان کے کان میں پڑی۔ چونک کر دیکھا تو سامنے پہاڑی کے دامن میں آگ جلتی دکھائی دی۔ جیسے کسی گاؤں میں کھانا پکانے کے لئے چولھے تپ رہے ہوں۔ آہ یہ کیسا سماں تھا۔ ناظرین کو بھی غالباً گذشتہ شب کا نظارہ یاد آگیا ہوگا۔ جب ہم دونوں رفیقوں نے پہلی پہاڑی کے سر سے فراریوں کے گاؤں کا ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ اور وہ جذبات بھی دل میں تازہ ہو گئے ہوں گے۔ جن سے مجبور ہو کر ہم دونوں کو فراریوں کے قدموں پر واپس جا گرنیکا خیال پیدا ہوا پس اس نظارہ کی مشابہت سے ویسے ہی جذبات کا طلاطم ان کے دل میں اٹھنا ایک قدرتی امر تھا۔ رات کی مہیب تاریکیوں میں پیاس اور بھوک کے ظاہرا نہ ختم ہونے والے سفر کے مقابلہ میں آبادی کی چہل پہل غذا کی فراوانی آبِ شیریں کے چشمے۔ اور سب سے بڑھ کر انسانی ہمدردی حاصل کر لینے کا امکان ایک زبردست کشش اپنے اندر رکھتا تھا چنانچہ اس کشش اور اس جذب کی طاقت سے کشاں کشاں لالہ صاحب اس بستی کی جانب رواں ہو گئے اور سمجھنے لگے کہ شاید قوم پہنچ گئے۔

رات کے نو بجے کے قریب وادے کیتو کی ایک بستی میں پٹھان لوگ

حسب العادت چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول تھے کہ یکایک ان کے کتے چلا چلا کر کسی پر حملہ آور ہونے لگے۔ دو تین پٹھان دوڑ کر وارد کی مدد کو آئے۔ دیکھا تو ایک غیر مسلح فقیر اکڑوں ہو کر اپنی چادر پھیلا پھیلا کر کتوں کو پرے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے پٹھانوں نے کتوں کو ہٹایا اور پوچھا تم کون ہو نو وارد نے جواب میں مُنہ کھول دیا۔ اور بغیر کوئی لفظ نکالے پٹھانوں کی طرف عالم یاس میں دیکھنے لگا۔ اس کے اس انداز سے پٹھان حیران ہوئے۔ اور سوال کو دُہرایا اب کے اس نو وارد نے جُھک کر ایک بچہ کو جو کہ پاس ہی کھڑا تھا۔ اٹھا کر گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے پٹھانوں کا استعجاب اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے درشتی سے پوچھا۔ کہ تم بتاتے کیوں نہیں کون ہو؟ اس دفعہ نو وارد نے ان کی طرف دیکھنے کی بجائے آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور آہستہ سے گنگناتے ہوئے جواب دیا "میں ٹھیکیدار ہوں"۔

ہم دونوں کو اس علاقہ میں بچہ بچہ جانتا تھا۔ پٹھانوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا تم سُندر لال ہو؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لالہ صاحب کا دل دھڑک رہا تھا۔ ابھی ایک لمحہ میں فیصلہ ہونے والا ہے کہ آیا لالہ صاحب کے لئے بیکسی کی موت انتظار کر رہی ہے یا ان کی مصیبت کی زندگی فوراً عیش و تنعم میں تبدیل ہونے والی ہے۔ لالہ صاحب نے جواب دیا۔ "ہاں" اور اس ہاں کے اثر کو معلوم کرنے کے لئے پٹھانوں کے چہروں کا بیقراری سے مطالعہ کرنے لگے۔

یہ سُنتے ہی پٹھان باغ باغ ہو گئے لیکن کیا یہ خوشی دوست سے ملنے کی ہے یا شکار مل جانے کی؟ پٹھانوں نے زور سے نلو رام کو آواز دی۔ کیا یہ قید کا

ساتھی تلورام ہوگا نہیں ایک اور ہندو لالہ صاحب کے سامنے آموجود ہوا۔ اور دونوں حیرانگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ آخر تلورام نے مہر سکوت کو توڑا۔

تلورام "کیا سندر لال"؟

لالہ صاحب "کیا تلورام"؟

تلورام "ہاں"

یہ کہتے ہی جھٹ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے۔ لالہ صاحب زار زار رونے لگے۔ اور تلورام انہیں تسلی دینے لگا۔ اس نے کہا آپ کوئی فکر نہ کریں یہی سمجھیں کہ اپنے گھر پہنچ گئے۔ تمہارے تلورام کا والد بھی اسی گاؤں میں موجود ہے۔ اور میں بھی اتفاقیہ یہاں آیا ہوا ہوں۔ چنانچہ اس نے آواز دی اور ایک اور ہندو آموجود ہوا جس کا تعارف تلورام نے لالہ جی سے کرایا۔

یہ تلورام عیدک کا ایک باشندہ اور لالہ جی کا پرانا دوست تھا۔ اسے مل کر لالہ جی کو بیحد خوشی ہوئی۔ اور وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے پٹھانوں میں بھی ان کی آمد سے خوشی کی برقی لہر سارے گاؤں میں پھر گئی۔ یہ گاؤں لوآنہ ملک کے عمزاد بھائی کا تھا جو لوآنہ کے نقش قدم پر ہی سرکار انگلشیہ کا بڑا خیرخواہ تھا۔ غرض لالہ صاحب کے بھاگنے کا سفر جس منظر سے شروع ہوا۔ اسی منظر پر اس کا خاتمہ ہوا۔ اور جو عظیم انقلاب ان کی گرفتاری کے وقت درپیش آیا تھا۔ اسی عظمت سے آج کا انقلاب ان کی رہائی کے وقت درپیش ہے طالع کی فیروز مندی ان کو ایسے گاؤں میں لے آئی جہاں دو ہندو دوست پہلے ہی سے بطور رفیق

موجود ہیں۔ اور گاؤں کا مالک بھی ان کی آمد کو اپنی خوش قسمتی کا موجب سمجھ رہا ہے۔
اگرچہ لالہ صاحب سارے گاؤں کے مہمان تھے لیکن پھر بھی جس ہمدردی اور جان نثاری سے حردو ہندوؤں نے ان کی خاطرداری کی وہ لالہ صاحب کے لئے ایک خاص سامان مسرت رکھتی تھی۔ اس عیش و عشرت کے لمحات میں لالہ جی کو اپنا رفیق یاد آیا۔ اور انہوں نے پٹھانوں سے میری گم گشتگی کا حال بیان کیا۔ اور جہاں تک ان کی یادداشت کام کر سکتی میرے جدا ہونے کے مقام کا پتہ دیا پٹھانوں نے بارہ مسلح آدمی کا جتھہ نکالا جو ساری رات پہاڑوں میں تلاش کرتے رہے لیکن قفس سے اڑے ہوئے پرندہ کا پتہ نہ ملا۔ ع

چوں مُرغ پرّد از قفس دیگر نبیند لیشد رکس

صبح ناکام واپس لوٹے۔
صبح اٹھ کر لالہ صاحب کے میزبانوں نے اپنا حق خدمت ادا کرنا شروع کر دیا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ کل ہی خوائے تلو رام کا روپیہ اسی گاؤں سے لے کر واپس گیا تھا۔ اور آج ایک اور فراری لالہ جی کی موجودگی میں سود اسلحہ لینے کو آیا۔ یہ فراری اس گاؤں کا باشندہ تھا۔ جو گرفتاری کے دن افغانستان کی حد میں داخل ہوتے ہی ہمیں ملا تھا۔ فراری کا نام سن کر ہی لالہ جی بہت گھبرائے لیکن گاؤں والوں نے تسلی دی۔ غرض آج کا دن خوب خوشیاں منانے میں گذر گیا۔
عصر کے وقت میراں شاہ جانے کے لئے تیاری ہونے لگی۔ لوآنا ملک اور دیگر سرکردہ پٹھان گاؤں کے باہر محفل جمائے بیٹھے تھے۔ ناگاہ سامنے پہاڑ پر ایک مسلح لشکر سیلاب کی طرح گاؤں کی طرف اترتا دکھائی دیا۔ لالہ جی کے اوسان

خطا ہو گئے۔سمجھے کہ فراریوں نے دھاوا بول دیا۔ملک کی بیوی نے شور مچایا۔
وزیر لوگ بھی جھٹ رائیفلیں سنبھالے دوڑ کر جمع ہو گئے۔اور آنے والوں کو
للکارا۔جنہوں نے جواب دیا کہ ہوش کرو۔پاگل کیوں ہو گئے ہو۔غور سے دیکھ
کر گاؤں والوں نے پہچان لیا۔کہ انہی کی قوم کے لوگ تھے۔جو خوست سے
واپس آرہے تھے۔ان کی تعداد تخمیناً تین سو تھی۔پہاڑ سے اتر کر ان آدمیوں
نے کھڈ کا رُخ کیا۔اور مغرب کیوقت کھڈ میں ہی رات بسر کرنے کیلئے ڈیرے
ڈال دئے۔

ادھر گاؤں میں نمازِ مغرب ادا کرنے کے بعد لالہ جی کو ایک سمند گھوڑی
پر سوار کیا گیا۔لوانہ ملک۔اس کا عمزاد بھائی اور چند کسان وزیر بطور بدرقہ ساتھ
تیار ہوئے۔لالہ جی نے اپنے میزبانوں سے رخصت لی۔اور یہ چھوٹا سا گروہ بھی
تھوڑی دیر میں اسی لشکر سے جا ملا۔اور وہیں ان کے پہلو بہ پہلو ڈیرہ ڈالدیا۔
گھوڑی اتفاق سے چھٹ کر بھاگ گئی۔اور لوانہ ملک نے آدمی بھیج کر دوسری
گھوڑی منگوالی۔

گھنٹہ کے قریب لالہ جی بمعہ اپنے ہمراہیوں کے اس جگہ پر پڑے رہے
اور رات کے دس بجے انہوں نے لشکر کو وہیں چھوڑ عیدک کی جانب کوچ کیا۔
یہ راستہ لوانہ ملک کی اپنی وزیر قوم کے درمیان سے گذرتا۔اس لئے کوئی خطرہ نہ
تھا۔سفر بخیر وخوبی طے ہو گیا۔عیدک پہنچ کر ڈاک کا ٹانگہ تیار تھا۔اس میں سوار ہو
کر میراں شاہ کو روانہ ہو گئے۔اس ٹانگے کے لئے بھی پکٹوں کا بندوبست ہوتا ہے
لیکن پھر بھی لالہ صاحب سہمے ہوئے تھے۔کہ پھر کوئی واقعہ پیش نہ آجائے۔

میراں شاہ پہنچ کر لالہ جی کے دوستوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ انکے لئے محفلیں گرم ہوئیں۔ اور ان کی گذشتہ مصیبتوں کی تلافی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ڈاکٹر آیا رام صاحب لالہ جی کے ہم پیالہ وہم نوالہ دوست خاصکر شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے عملی طور پر لالہ جی کی سچی خیر خواہی کا ثبوت دیا ان کی بے حد دلداری اور خاطر مدارت کی۔ چنانچہ بہت دنوں تک لالہ جی میراں شاہ ہی مقیم رہے۔

میراں شاہ پہنچنے پر پولیٹیکل ایجنٹ صاحب و پولیٹیکل تحصیلدار صاحبان نے ان کے بیانات قلمبند کئے۔ اس وقت ایک ناگوار مکالمہ ان کے اور لالہ جی کے درمیان ہوا جس کا ذکر مجھے بھی ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

لالہ جی کچھ مدت آرام کرنے کے بعد اپنے وطن لوں میانی پہنچے۔ اور اپنی بوڑھی والدہ کو زندہ سلامت مل کر ان کے سینہ کو ٹھنڈک پہنچائی۔

۲۔ افغان کیمپ

اب پھر میں اپنے قصے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ملا صاحب کے چلے جانے کے بعد شدت بخار سے مجھ پر بیہوشی طاری ہو گئی۔ کچھ رات گذرے ملا صاحب پھر تشریف لائے۔ اور مجھے ہلا جلا کر اٹھایا۔ ان کے ہمراہ ایک طشتری میں پکے ہوئے چاول تھے۔ اور چاولوں کے درمیان ایک گڑھا سا بنا کر تازہ خوشبودار گھی ڈالا ہوا تھا۔ ایسی شدت کی بھوک کے بعد جس نے گوبر کھانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ ایسی پاکیزہ غذا کا میسر آنا ایک سرور پیدا کر رہا تھا۔ لیکن میں نے خواہشات پر ضبط

کیا اور نصف چاول گھی میں تر کر کے کھاتے۔ ملا صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے پوچھا کچھ اور ضرورت ہے؟ عرض کی کہ بدن کا بند بند درد کر رہا ہے۔ اگر کوئی لڑکا مجھے دبا دے تو اللہ جزا دے گا۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو حکم دیا۔ اور وہ بیٹھ کر مجھے دبانے لگا۔ مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔ ساری رات نیم بیہوشی اور نیم بیداری کی حالت میں اسی مصیبت کے سفر کو پہاڑوں اور جنگلوں کی تپش کے درمیان طے کرتا رہا۔ اس شدت کی پیاس میں "پانی پانی" پکارتا۔ اور آنکھ کھل جاتی اور ارد گرد کی خاموشی دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ اسی طرح صبح ہو گئی جب خوب دن چڑھ آیا تو میں نے قوت ارادی کو مجتمع کیا۔ غفلت و بیہوشی کافور ہو گئی۔ اور میں اپنے جسم میں تو نہیں لیکن اپنے ارادوں میں وہی ہمت محسوس کرنے لگا۔ دھوپ نے بلندیوں کو منور کر رکھا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی قرم دریا کی مرطوب ہوا میں آزادی کا پہلا دن مجھ پر دنیا کی تمام برکتوں کے ساتھ آیا۔ اور میں اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ میرے درپیش یہ سوال تھا کہ آیا میں گاؤں کے لوگوں پر اظہارِ حال کروں یا نہ کروں۔ اور کروں تو کس صورت میں اور کس حد تک۔ میں نے اپنی جسمانی حالت کو جانچا تو بدن بالکل اکڑا ہوا پایا۔ جو لکڑی کے تختہ کی مانند چارپائی پر پڑا تھا۔ اگر میں چل سکتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں کسی کا رہینِ منت ہوتا۔ اندریں حالات گاؤں میں دیوانہ یا مجذوب بن کر پڑا رہنا بھی خدشہ سے خالی نہ تھا۔ میرے بھاگ جانے کی خبر خدا جانے کب پہنچ جائے۔ اور واقعات کیا صورت اختیار کریں۔ لہذا میں نے اظہارِ حال پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ اتنے میں ایک آدمی مسجد میں آیا۔ میں نے اس سے پانی پلانے کی درخواست کی۔ اس نے ایک کوزہ بھر کر

اس کی ٹونٹی میرے منہ سے لگائی۔ اور میں نے سیر ہو کر پیا۔ میں اپنے خیالات میں
محو تھا۔ دو آدمی میرے پاس سے ہو کر گذرے میں نے ان کو آواز دی اور کہا ذرا
اُوپر چبوترہ پر آؤ۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا کہ یہ کل والا دیوانہ ہے
پھر دونوں ہنس کر چلدئیے۔ میں بھی اپنی حالت پر مسکرایا۔ اتنے میں ایک شخص نے
بلند آواز سے کل والی بھوسہ اڑانے کی جگہ سے کسی کو نام لیکر پکارا۔ اس کے
مخاطب نے مسجد کے قریب سے ہی جواب دیا۔ کہ آرہا ہوں۔ اتفاق سے اس
کا راستہ مسجد کے قریب پڑتا تھا۔ گذرنے لگا تو میں نے اس کا نام لیکر اس کو
بلایا۔ وہ ششدر رہ گیا۔ کہ یہ وحشی اس کا آشنا کیسے نکلا۔ اندر آیا تو حیران ہو کر
پوچھنے لگا۔ کہ مجھے اس کا نام کیسے معلوم ہوا میں نے مذاحیہ کہا کہ تم بھول گئے ہو
ہم دونوں تو اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ وہ بھی ہنس پڑا میرے پاس بیٹھ گیا میں نے
نہایت مختصر الفاظ میں اپنے گرفتار ہو جانے اور بھاگ آنے کا تذکرہ کر کے اپنا
تعارف کرایا۔ پھر کیا تھا۔ لوگ پروانوں کی طرح مجھ پر گرے۔ میری پہلی آرزو یہ تھی۔ کہ
میرے بدن کو دبایا جائے۔ انہوں نے زمین پر لٹا کر میرے سارے بدن کو خوب
دبایا۔ ملا صاحب بھی تشریف لے آئے۔ میں نے پوچھا کوئی سرکاری ملازم گاؤں
میں ہے۔ جواب ملا نہیں۔ البتہ دو میل کے فاصلے پر ایک پٹواری رہتا ہے۔
عرض کی کہ ان کو خبر کرو۔ میرے نئے دوست نے جواب دیا۔ کہ پولیٹکل ایجنٹ یہاں
سے پانچ میل کے فاصلے پر بمقام علی زئی مقیم ہیں۔ اور ہم ابھی اپنے مواجب لینے
کے لئے ان کے پاس جانے والے ہیں۔ میں نے التجا کی کہ جس طرح ہو سکے
مجھے ساتھ لے چلو۔ وہ ہنسے اور کہنے لگے اپنی ہمت دیکھو میں نے جوش میں کہا

ابھی بیس میل بلا تکان چل سکتا ہوں۔ لیکن کیا کوئی گھوڑی اس گاؤں میں نہیں ؟ بولے نہیں۔ میں نے کہا کل دریا کے پرلے کنارہ سے ایک سیاہ پوش جوان کو گھوڑی پر سوار دیکھا تھا۔ ایک نے کہا وہ سڑک کا جمعدار تھا۔ آج پھر کام پر چلا گیا دوسرے نے کہا کہ وہ گھوڑی ساتھ نہیں لے گیا۔ اصل میں ان کی مرضی تھی۔ کہ وہ جا کر پولیٹکل ایجنٹ کو اطلاع دیں۔ اور اپنی خیر خواہی کا اظہار کریں۔ اور میں چاہتا تھا۔ کہ کسی کو یہ شک بھی نہ ہو کہ میں کسی کی مدد سے پہنچا میری ضد پر انہوں نے گھوڑی کا انتظام کیا۔ کھانے کے لئے مجھ سے پوچھا میں نے چاء کی درخواست کی تھوڑی دیر میں چاء تیار کر لی گئی۔ تنور کی پکی ہوئی لذیذ روٹیاں لے آئے۔ اور ایک لوہے کے تیچے میں گھی گرم کر کے میرے آگے رکھا گیا۔ ساتھ مصری تھی۔ اس روٹی نے جو لذت پیدا کی وہ کبھی کسی اعلیٰ سے اعلیٰ پکے ہوئے کھانے میں نہیں ہو سکتی۔ مدت سے گھی چھوٹا ہوا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا لیکن پھر بھی معدہ پُری نہ کی میرا مہربان دوست میرے لئے دو عدد بادرنگ لے آیا میں نے ایک کھایا اس کی شکل مجھے ایسی مبارک نظر آئی۔ اور ایسا مزہ دیا۔ کہ اب تک اور شاید ساری عمر تک یہی حال رہے گا۔ کہ بادرنگ کی شکل دیکھ کر دل باغ باغ ہو جائے اور وہی وقت سامنے آ کر خواہ مخواہ کھانے کو جی چاہے۔ میں چاء کا بڑا عادی تھا۔ مدت دراز کے بعد نصیب ہوئی۔ غرض آج صبح کے سارے کھانے نے وہ فرحت بخشی کہ شاید ساری عمر کے کھانوں کی لذت یکجا کرنے سے بھی زیادہ ہو اس کے بعد میرے پاؤں کا فکر کیا گیا۔ سوج کر کُپا بنے ہوئے تھے۔ گھی گرم کر کے مالش کی گئی۔ اور کپڑا اوپر لپیٹ دیا گیا۔ سر کے لئے کسی کی پگڑی اور پہننے کے لئے کسی کا

پاجامہ مل گیا گھوڑی لے آئے لیکن زین نہ تھی۔ چادروں کی زین اور رکابیں بنا کر مجھے پانچ چھ آدمیوں نے اس پر اٹھا کر بٹھا دیا۔ اور لے چلے پیچھے پیچھے سڑک پر اور بھی بہت سے آدمی صاحب کے لئے جا رہے تھے۔ لب دریا سفر نہایت مزے سے گذرا۔

علی زئی پہنچے تو ایک پر لطف واقعہ پیش آیا میرا ورود ایک جلوس کی صورت میں ہوا گھوڑی پر عجب ہیئت کذائی میں سوار۔ چاروں طرف پٹھان والنٹیر حلقہ باندھے اور عقب میں مواجب خواہ پٹھانوں کا طول و طویل مسلح لشکر۔ غرض ایک ایسے جلوس کی شان تھی جس پر آج بھی کئی لیڈر رشک کریں۔ قلعہ والوں نے یہ حال دیکھا تو سمجھے کوئی پٹھانوں کا بڑا مذہبی مجاہد اس عزو شان سے لایا جا رہا ہے۔ نائب پولیٹکل حاکم کو خبر دی گئی۔ وہ فوراً استقبال کو باہر آئے۔ اس وقت پٹھان لوگ مجھے گھوڑی سے اتارنے کے لئے میرے گرد جمع ہو رہے تھے۔ صاحب موصوف نے بڑی عقیدت سے نیاز کا ہاتھ میری طرف مصافحہ کے لئے بڑھایا۔ اور ایک ارادت میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے میری جانب دیکھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو ہم دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کی طرف حیرانگی سے دیکھتے رہے۔ آخر بڑے تعجب سے انہوں نے کہا محمدؐ اکرم؟ میں نے عرض کی۔ جی ہاں وہی برگشتہ قسمت۔ ہمارا مصافحہ فوراً معانقہ سے بدل گیا۔ اور پولیٹکل نقاب اتار کر وہ نہایت خلوص سے بغلگیر ہوئے۔ پشاور میں ہمارا آپس میں تعارف ہوا تھا اور پھر مہمند فیلڈ فورس میں ہم اکٹھے رہے تھے۔

پٹھانوں کی وحشی اور قزاق اقوام کی جہاں میں نے اتنی مذمت کی ہے۔

وہاں واقعات مجبور کرتے ہیں کہ ان کے مہذب اور شائستہ فرقہ کے حسن اخلاق۔ مہمان نوازی۔ اور بے غرضانہ ہمدردی کی توصیف کروں۔ میں علی زئی کیا پہنچا۔ گویا بہشت بریں میرے استقبال کو آیا۔ خان محمد یوسف خان صاحب نائب حاکم نے ایسے حسن سلوک سے میری دلجوئی اور مدارات کی جس کی مثال کم نظر آتی ہے مجھے آرام سے بٹھا کر وہ ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ اور معاً اپنے ہمراہ صاحب پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر فریزر اور ڈاکٹر میجر.......... آر۔ اے۔ ایم۔ سی کو ہمراہ لے آئے۔ میں نے تعظیم کے لئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ صاحب پولیٹیکل ایجنٹ نے دریافت کیا۔ کہ کس طرح خلاصی ہوئی۔ میں نے عرض کی زنجیریں توڑ کر میری خستگئی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ برٹش اخلاق نے ان کو اجازت نہ دی۔ کہ میری رام کہانی کی تفصیل پر میرے آرام کو قربان کریں میرے حالات کو نہایت اختصار سے سننے پر انہوں نے اکتفا کیا۔ ان کے چہرہ سے پایا جاتا تھا۔ کہ سچی انسانی ہمدردی کے جذبہ سے وہ بہت متاثر ہو رہے ہیں۔ اور ان کی دلجوئی میں کسی قسم کے پولیٹیکل تصنع کی بو نہیں آرہی تھی۔ اور ان کی شرافت طبع سے میں بہت متاثر ہوا۔

میں نے لالہ سندر لال کا حال بتایا۔ اور کہا کہ ان کی حالت ایسی تھی کہ اب تک اگر کہیں پہنچ نہیں چکے تو ان کا زندہ ملنا غیر اغلب ہے۔ صاحب موصوف نے فوراً محکمانہ طور پر میری رہائی اور لالہ سندر لال کی گم شدگی کے تار متعلقہ محکموں میں بھیجکر مختلف جگہوں سے ان کی تلاش کے لئے فوری چھٹیوں کا بندوبست کیا۔ میں نے والد صاحب قبلہ کو فوراً بذریعہ تار خوشخبری دینا چاہی تاکہ وہ کہیں میری ہدایات پر عمل پیرا ہو کر فراریوں کی ملاقات کو روانہ نہ ہو جائیں۔ لیکن میرے تار کو روک رکھا

گیا۔ جب تک محکمانہ پیغامات کا تبادلہ نہ ہو لیا۔

مختصر حالات سُن لینے کے بعد صاحب موصوف نے مجھے ڈاکٹر صاحب کے چارج میں چھوڑا۔ اور میری خبر گیری کی تاکید کر کے آپ تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے پاؤں کے زخموں کا معائنہ کیا۔ ان کو دھلوایا۔ اور بڑی پھرتی سے مرہم پٹی کی۔ ٹانگیں اور پاؤں بہت سُوج رہے تھے۔ ان کے نیچے دو تین لپٹے ہوئے بستر رکھوا کر پاؤں اوپر کو اٹھوا دئیے۔ اور خواب آور دوا مجھے پلائی۔ قلعہ علی زئی کے ہسپتال کے انچارج ایک صاحب ڈاکٹر کاظم علی تھے۔ ان کو میری تیمارداری کے لئے بڑی تاکید کی۔ اور میجر صاحب بھی مجھے تسلی دیکر رخصت ہوئے۔ جس دلسوزی کے ساتھ ڈاکٹر کاظم علی صاحب نے اپنی مسافر نوازی کا ثبوت دیا۔ میرے پاس شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں۔ زخموں کی تیمارداری دوا سے اور میرے دل کی تشفی اپنے محبت بھرے شیریں کلام سے کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ ڈاکٹر صاحب کا تصوف میں ڈوبا ہوا پُر سوز کلام برمحل اشعار کی دلکش آمیزش سے دل پر ایک حقیقی اثر پیدا کرتا۔ خداوند کریم ان کو جزائے خیر دے۔ اور مسافر نوازی کی توفیق مزید عنایت فرمائے۔

خان محمد یوسف خان صاحب نے آسانی مہیا کرنے اور مجھے آرام پہنچانے میں بیحد تکلف سے کام لیا۔ اور خود تکالیف برداشت کر کے مجھے راحت میں رکھا اس طرح وزیریوں کے سلوک سے جو تعصب پٹھانوں کی نسبت بہ حیثیت قوم میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسے دھو ڈالا۔

میں اپنے اقربا تک پہنچنے کے لئے بے قرار تھا۔ اس لئے دوسرے روز

ہی صاحب پولیٹیکل ایجنٹ سے درخواست کی۔ کہ مجھے اپنی لاش کو وطن عزیز تک پہنچانے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے ہنس کر فرمایا۔ کہ اتنی بے صبری نہ کرو یہ لاش خود ہی چلنے کے قابل ہو جائے گی۔ اور وطن جانے سے پہلے تو تمہیں ابھی کرم کمشن کے روبرو افغانستان کے افسروں کی موجودگی میں خراچی جاکر بیان دینا ہے۔ ان کا یہ ارشاد مجھے قید کے حکم کے مترادف محسوس ہونے لگا میں نے اپنی بیتابی کا ذکر ڈاکٹر کاظم علی صاحب سے کیا۔ انہوں نے ہنس کر فرمایا۔ ؎

اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

چارپائی پہ سے اٹھنے کی طاقت نہیں۔ پاؤں زخمی ہو رہے ہیں۔ اور وطن کی تیاری ہو رہی ہے۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش سُن کر چپ ہو رہا۔ پانچ روز تک خان صاحب کی مہمان نوازی اور ڈاکٹر صاحب کی دلداری کا وہ حال رہا۔ کہ میرا اضطراب مجھے زیادہ محسوس نہ ہوا۔ پانچویں روز میں نے اپنے معالج پر بدلائل ثابت کر دیا کہ میں ٹانگے میں بیٹھنے کے لائق ہو گیا ہوں۔ آخر میرے بیحد اصرار نے خان صاحب موصوف کو مجبور کر دیا۔ کہ مجھے اسی حالت میں پاراچنار لے چلیں چنانچہ بذریعہ ڈاک ٹانگہ ہم پاراچنار کو روانہ ہو گئے۔

ہمارا راستہ دریائے کرم کے کنارے ایک نہایت سبز و شاداب وادی کے درمیان سے گذرتا جس کی تازگی اور لطافت آب و ہوا کی ہمسری کشمیر جنت نشان کا خطہ بھی نہیں کر سکتا لیکن میری ٹکٹکی سارا راستہ دریا کے اس پار ان بلند پہاڑوں کی طرف لگی رہی جن کے مہیب کھنڈروں اور دروں میں واپسی کیوقت سرگرداں پھرتا رہا۔ نیلگوں آسمان کے پس منظر کے سامنے سبز بلند پہاڑوں کا

نظارہ ایک ناقابل بیان جادو کی کشش اپنے اندر رکھتا۔ اور دل میں ایک ناقابل ضبط ولولہ پیدا ہوتا۔ کہ دوڑ کر انہی پہاڑوں کی پہنائیوں میں گم ہو جاؤں۔ اور تلاش منزل کی گم گشتگیوں میں ہی بقیہ عمر صرف کر دوں۔ ناظرین اس جذب کی خلاف توقع نوعیت سے حیران ہوتے ہوں گے لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے۔ کہ آج اس مصیبت کے ستائیس سال بعد بھی پہاڑی منظر ایک خود فراموشی کے عالم میں لیجا کر ایک جادو بھری کشش اور جذب سے مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور آرزو پیدا ہوتی ہے۔ کہ اسی وادی روز کی سی بے سر و سامانی اور یاس و امید کے جذبات میں محو ہو کر ساری عمر سرگشتگی میں گذار دوں۔ حالانکہ قدرتاً نفرت و خوف کا جذبہ پیدا ہونا زیادہ قرین فہم تھا۔

ہم سورج غروب ہونے سے پہلے پاراچنار پہنچ گئے۔ اور وہاں کے ایک سکھ رئیس کے ہاں قیام کیا۔ شہر پاراچنار ایک نہایت سبز و شاداب اور سرد جگہ کوہ سفید کے عین دامن میں واقعہ ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس کی برف میں ملبوس چوٹیاں خوست میں مشرق کی جانب نظر آتیں۔ اور میں فراریوں سے دریافت کرنیکی کوشش کرتا۔ کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ اور وہ پتہ دینا نہ چاہتے۔

وادئے کرم دو حصوں میں منقسم ہے۔ لوئر کرم اور اپر کرم۔ موخر الذکر حصہ تک پہنچنے کے لئے لوئر کرم کے دشوار گذار پہاڑوں سے ایک تنگ سڑک کے ذریعہ گذرنا پڑتا ہے۔ جو ریلوے سٹیشن ٹل سے شروع ہو کر پاراچنار تک چلی گئی ہے علاقہ غیر اور وادئے تیراہ کے قرب کی وجہ سے اکثر موقعوں پر لوئر کرم کی حدود میں راستہ بہت خطرناک ہے۔ اور مار دھاڑ کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ البتہ اپر کرم میں داخل

ہوتے ہی امن و امان کا دور آجاتا ہے فصلیں اور باغات دریا کے کنارے
لہراتے چلے جاتے ہیں۔ اور لوگ بڑے مرفع الحال اور برٹش گورنمنٹ کے
خیرخواہ ہیں۔ پاراچنار پہنچنے سے پہلے ہی دریا سڑک سے علیحدگی اختیار کر کے
افغانستان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہاں پر افغانستان
کی سرحد سے نکل کر سڑک کو آملتا ہے۔

رات پاراچنار بسر کر کے دوسرے روز ظہر کے وقت گھوڑوں پر سوار
ہو کر خرلاچی کو روانہ ہوئے۔ اور غروب سے پہلے پہلے دس میل کا سفر طے کر
کے ہم منزل پر پہنچ گئے۔ قرم ملشن کی وجہ سے یہاں خوب چہل پہل تھی۔ اور جنگل میں
منگل بنا ہوا تھا۔ قلعہ خرلاچی افغانستان کی سرحد پر برٹش گورنمنٹ کا آخری مقام
ہے۔ اور دونوں سلطنتوں کی حدود یہاں پر بالکل مل ہوتی ہیں۔ اور کوئی غیر علاقہ
حائل نہیں ہے۔ گذشتہ سال ۱۹۰۹ء دسمبر میں اسی قلعہ کی توپوں سے مقابل والے
افغانی قلعہ پر گولہ باری کی اطلاع آئی تھی۔ اور واقعات بڑی سرعت سے ایسی صورت
اختیار کر گئے تھے۔ کہ مبصرین کے خیال میں جنگ افغانستان لابدی نظر آ رہی تھی۔

مسٹر ڈانلڈ۔ جو بعد میں سر ڈانلڈ بالقابہ ہو کر صوبہ سرحد کے چیف کمشنر ہوئے
اس وقت قرم ملشن کے افسر اعلیٰ تھے۔ انہوں نے میری رہائی پر مجھے مبارکباد
دی۔ اور ایک مخصوص نیم استفہامیہ لہجہ میں فرمایا۔ کہ فراری لوگ غالباً امیر صاحب
کے حکم سے تمہیں آکر چھوڑ گئے ہوں گے۔ کیونکہ ہم نے بڑے شد و مد سے
تمہاری رہائی کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ اور بڑا دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ میں نے مختصراً
واقعات بیان کر کے ان کے اس خیال کی تردید کی جسے سنکر صاحب موصوف

چیں بہ جبیں ہو گئے۔ اور میری جانب سے اعراض کر کے اپنے پرسنل اسسٹنٹ صاحب کو میرے بیانات قلمبند کرنے کا حکم دیا جس کو وہ بجا لاتے اس وقت مجھے ایک صاحب نے ناصحانہ انداز میں فرمایا۔ کہ اگر تم اپنی رہائی پولیٹیکل دباؤ کا نتیجہ ہی بیان کرو تو تمہارا کیا ہرج ہے۔ میں نے عرض کی ؏

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

خرلاچی اگرچہ پاراچنار سے دس میل کے فاصلہ پر ہی ہے لیکن ہوا میں ویسی خنکی یہاں نہیں۔ خان محمد یوسف خان صاحب کی عنایات نے یہاں بھی کام کیا اور کیمپ میں رات بسر کرنے کی بجائے خرلاچی کے ایک رئیس مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ اور افغانی مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ پچھلے برس کے مذکورہ صدر سرحدی تنازعہ کے دوران میں انہی رئیس صاحب کے ہاں سر روس کیپل صوبہ کے چیف کمشنر مقیم ہو کر اسی برج میں ٹھہرے تھے جس میں مجھے جگہ ملی۔ صبح خان محمد یوسف خان معہ نائب حاکم اپر توم جناب بہرام خانصاحب تشریف لائے۔

صبح کا ناشتہ قلعہ میں کر کے مرد و نائب حاکمان مسٹر ڈانڈ کے ہمرکاب کمشن کے جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ جگہ خرلاچی سے کچھ فاصلہ پر سرحدِ افغانستان کے اندر واقع تھی۔ اور ایک بڑے عالیشان شامیانہ کے سایہ میں کمشن کے جلوس ہوتے۔ انکے تھوڑی دیر بعد میں بھی سوار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ چونکہ یہاں پر دونوں سلطنتوں کی سرحدیں بالکل ملحق ہیں۔ اسلئے جانبین کی رعایا کے مابین بعض ایسے تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے سلجھے

کرنے کے لئے محکمانہ خط و کتابت کا سلسلہ بہت طویل ہو جاتا ہے۔ اور اس طویل مہلت میں مزید تنازعات پیدا ہو کر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان معاملات کا فیصلہ بالمشافہ گفتگو کے ذریعہ کرنے کے لئے یہ کمشن مقرر کیا گیا ہے۔ جب میں پہنچا تو ایک بڑے شامیانہ کے نیچے میزوں کی ایک لمبی قطار دیکھی جس کے ایک طرف افغان حکام اور دوسری جانب مسٹر ڈانلڈ اور ان کے ایک اسسٹنٹ برٹش افسر اور دیگر سرکاری حکام بیٹھے ہوئے تھے اور آپس میں بحث مباحثہ جاری تھا۔ اتنے میں دور سے چند سوار آتے نظر آئے۔ اور معلوم ہوا کہ سردار عبد الوہاب خان صاحب جو کہ شاہی خاندان کے ممبر اور افغان کمشن کے صدر تھے تشریف لا رہے ہیں۔ جب وہ نزدیک آئے تو سب حاضرین ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سردار صاحب عمر رسیدہ سفید ریش اور فربہ اندام بزرگ تھے۔ اور ان کی حرکات و سکنات نہایت سنجیدہ اور باوقار معلوم ہوتی تھیں۔ دھوپ کے بچاؤ کے لئے وہ سر پر سولا ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔ جو ان کی وضع قطع کے لحاظ سے بہت بدزیب معلوم دیتی تھی گھوڑے سے اتر کر ہیٹ انہوں نے اتار دی اور افغانی سیاہ ٹوپی رائج الوقت زیب سر کر کے میز کے سرے پر کرسیٔ صدارت پر متمکن ہو گئے! اور باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی۔

کسی تنازعہ کی تفصیلی کارروائی کے ذکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ افغان سرداروں کے طرز اور مسٹر ڈانلڈ کے رویہ میں جو اختلاف میں نے دیکھا وہ آج تک اسی طرح میرے دل پر نقش ہے۔ سردار صاحب موصوف بحث میں کوئی حصہ نہ

لیتے تھے۔ اور ایک وقار کا مجسمہ بنے خاموشی سے کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ ایک دُبلے پتلے تراشیدہ نوکدار داڑھی کے مالک برگیڈیر جنرل تشریف فرما تھے۔ ان کی بلند سیٹی کی سی آواز مجھے مدآمیر کا لہجہ یاد دلا رہی تھی۔ اور ان کی عقابی نظریں۔ اور اعضا کی بے تابانہ حرکات تیزیٔ طبع کا پتہ دے رہی تھیں۔ ان کا غصہ میں بھرا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے جذبات کو ضبط میں رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور انکا چہرہ برابر انکے جذبات کا ترجمان بنا ہوا تھا۔ اور بغیر کسی تصنّع کے وہ انہی جذبات سے لبریز نگاہ ہر طرف ڈال رہے تھے۔

برخلاف اس کے مسٹر ڈائلڈ اپنی وضع اور رویہ سے اپنی پختہ کاری۔ اپنے جذبات پر پُورے قابو اور اپنی قوم کی مخصوص صفت adaptability[1] کا ثبوت دے رہے تھے۔ ان کا چہرہ جب افغان افسروں کی جانب ہوتا۔ تو اس پر پُرتَبسّم کر لینے والا تملق آمیز تبسم پایا جاتا۔ جب ان کا رُخ برٹش افسر کی طرف ہوتا تو اس پر سے دوستانہ جذبات کا اظہار ہوتا۔ اور جب وہ نائب حاکمان کو مخاطب کرتے تو ان کے چہرہ سے حکمرانوں کا سا جلال اور رُعب ٹپک رہا ہوتا۔ اور لہجہ میں سراسر تحکم کا انداز آجاتا۔ اور پھر افغانوں کی طرف پھرتے ہی وہی تبسم اور وہی تملق و محبت کا لہجہ ہوتا۔ چہرہ پر ان فوری تبدیلیوں کو پیدا کر لینے کی یہ قدرت دیکھ کر میرا دل عش عش کرتا رہ گیا۔ لیکن ان کے اس رویہ سے برگیڈیر جنرل کے لب ولہجہ میں کوئی چنداں فرق نہ پڑتا! اور وہ اپنے اسی لب ولہجہ میں گفتگو کرتے رہے

---

[1] ہر حالت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا۔

چند مناقشات پر مباحثہ کے بعد میرا معاملہ پیش کیا گیا بزدار عبد الوہاب خان صاحب کے داہنے ہاتھ مجھے کھڑا کیا گیا۔ اور شکستہ سی فارسی میں اپنی دردناک داستان کو میں نے مجملاً بیان کیا۔ میری حالت زار کو سن کر سب افغان سرداروں نے سر نیچے ڈالے ہوئے تھے۔ اور ان کے چہروں پر بے حد متاثر ہونے کے آثار نمایاں تھے۔ اور سب پر ایک سکتہ کا عالم معلوم ہوتا تھا۔ اختتام پر مسٹر ڈانلڈ صاحب نے افغان حکام کو مخاطب کر کے کہا۔ کہ آپ اس کا خوست میں مقید ہونا نہیں مانتے تھے۔ یہ آپ کو نقشہ بنا کر ایسے نشانات دیگا کہ آپ انکار نہ کرسکیں گے چنانچہ میں نے خوست میں فراریوں کے گاؤں کا مقام اور اردگرد کے علاقہ کا نقشہ جیسا کہ اس کتاب کے صفحہ مقابل پر ہے بنایا۔ اس پر امیر صاحب کا سرحدی قلعہ۔ اس کے پاس والے گاؤں کے مقام۔ بندی کلی موضع کیٹکی۔ اور کیتونالا سب دکھائے۔ اپنے گاؤں میں سرحدی قلعہ کے کمانڈنگ افسر میجر صاحب کی آمد۔ اور ان کا حلیہ۔ امام دین۔ اور خاصہ داروں کی گفتگو۔ ملا پوئندا کا پیام اور فراریوں کا جانا۔ گلاجان اور لالہ پیر کی تشریف آوری۔ قیدیوں اور فراریوں کے نام یہ سب ایسی حقیقتیں تھیں جن کو جھٹلانا ممکن نہ تھا۔ آخر افغانی حکام نے اقرار کیا۔ کہ ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ ان کافروں نے واقعی خوست میں ہی اسے قید رکھا ہوا تھا۔ اس پر مسٹر ڈانلڈ صاحب نے ایک فاتحانہ انداز میں فرمایا کہ بعض حالات ایسے بھی ہیں جو مجلس عام میں بیان کرنے کے لائق نہیں آپ اسے اپنے کیمپ میں لیجائیے۔ اور فراغت سے سنیئے ہیں حاکم اعلے کے اس غیر متوقع ارشاد سے حیران رہ گیا۔ اور عرض کیا کہ کوئی امر ایسا نہیں ہے

جو یہاں بیان نہیں ہو سکتا۔ ع

ببانگ چنگ بگوئیم آں حکائت ہا
کہ از نہفتن شاں دیگ سینہ مے زد جوش

اور میں نے ہنسی کے لہجہ میں احتجاج کیا۔ کہ بڑا افسوس ہے آپ مجھے دوبارہ ان پٹھانوں کے حوالہ کر رہے ہیں جن کے آہنی پنجہ سے میں اسقدر مصیبتیں جھیل کر اور جان پر کھیل کر رہا ہُوا ہوں۔ میری اس مذاق کا پہلو لیئے ہوئے بیباکانہ کلام پر سب ہنس پڑے۔ اور بریگیڈیر میجر صاحب نے مذامت کے لہجہ میں فرمایا۔ کہ تم کافروں کے پنجے میں گرفتار تھے۔ اور ہم مسلمان ہیں۔ تمہاری مہمان نوازی ایسے طور پر کریں گے کہ تمام گذشتہ تکالیف کی تلافی کر دیں گے۔ غرض میں نے منظور کیا۔ اور میرے اس معاملہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔ ایک افغان سوار کا گھوڑا لیکر مجھے دیا گیا۔ اور سردار صاحب کی سرکردگی میں ہم افغان کیمپ کی جانب روانہ ہو گئے۔ قریباً ایک سو مسلح سوار تھے جو بغیر کسی ترتیب یا نظام جلوس میں جا رہے تھے۔ اور سرکار انگلشیہ کے قواعد داں رسالہ کے نظم و نسق سے کوئی نسبت نہ رکھتے۔ پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ہم افغانی کیمپ میں داخل ہوئے۔

یہ کیمپ دو حصص پر منقسم تھا۔ ایک طرف تو فوجی عہدہ دار اور سوار چلے گئے۔ اور دوسری جانب سردار عبد الوہاب خان اور دیگر افسران۔ وسط میں ایک بڑا شامیانہ نصب تھا۔ جس کے جنوب میں دو شاندار خیمے کھڑے تھے۔ ایک میں سردار صاحب موصوف تشریف لے گئے۔ اور دوسرے میں بریگیڈیر جنرل صاحب

ان کے ملحقہ ڈاکٹر صاحب کا خیمہ تھا۔ یہ صاحب پنجاب کے باشندہ تھے۔ اس لئے میری رہائش کا انتظام ان کے خیمہ میں کیا گیا۔ کچھ حب الوطنی کا تقاضا کچھ میری موجودہ حالت کا لحاظ۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خلقی سے پیش آئے۔ میں نے عرض کی کہ ڈاکٹر صاحب آپ سب سے بڑی خدمت جو میری کر سکتے ہیں وہ یہ ہے۔ کہ کسی طرح میرے زبردستی کے میزبانوں سے میری خلاصی کرا دیں میرا دل چاہتا ہے۔ کہ اُڑ کر وطن پہنچوں۔ اور آج رات یہاں بسر کرنا مجھے ایک طویل قید معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی مہمان نوازیوں کا لاانتہا شکریہ۔ مگر آپ مجھے فوراً رخصت دلا دیں۔ ان دفتری کارروائیوں سے میں بہت بیزار ہو رہا ہوں۔ اور ایک ایک لمحہ مجھ پر گراں گذر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے میرے حقیقی اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے بادلِ ناخواستہ میری خواہش پوری کرنے میں مدد کی۔ اور مجھے اسی وقت جرنیل صاحب کے خیمہ میں لے گئے۔ جرنیل صاحب میری اس طرح کی واپسی پر راضی نہ ہوتے تھے لیکن میری تمنا کچھ ایسی ہی تھی کہ وہ بھی مجبور ہو گئے۔ سردار صاحب نماز ظہر ادا کر رہے تھے جب فراغت پا چکے تو جرنیل صاحب اپنے ہمراہ مجھے ان کے پاس لے گئے۔ انہوں نے ارشاد کیا۔ کہ رات پاراچنار تو جا نہیں سکتے۔ پھر خرلاچی گیا۔ اور یہ جگہ کیا۔ میں نے عرض کی کہ خرلاچی کیمپ کی نسبت آپ کی عنایات سے فیضیاب ہونا میرے لئے باعث سعادت ہے لیکن میں آپ سے رخصت ہو کر سیدھا پاراچنار ہی جاؤں گا۔ اور میری ایک رات اضطراب کی کم ہو جائے گی۔ انہوں نے فرمایا۔ ہم مراسم مہمان نوازی ادا کرنا اور تمہیں خلعت دیکر باعزت رخصت کرنا چاہتے ہیں

تمہارا اس طرح چلے جانا ہمارے لیئے باعثِ ننگ ہوگا۔ میں نے عرض کی کہ صاحب! خدا پاک نے مجھے قناعت کا خلعت دے رکھا ہے۔ اور میں کسی اور سروپا کی خواہش نہیں رکھتا۔ ہاں اگر آپ نے اپنی کرم گستری سے مجھے ضرور مستفیض فرمانا ہی ہے۔ تو مہربانی کر کے میرے ان قیدی بھائیوں کی دستگیری کر کے مخلصی دلائیں۔ جو ابھی تک ان قزاقوں کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ اور یہی آپ کا سروپا ہوگا۔ سردار صاحب نے نہایت مؤثر الفاظ میں سچے دل سے ان مظلوموں کے چھڑانے کا وعدہ کیا۔ اور ساتھ ہی میری فوری رخصت ہونے کی درخواست کو بھی منظور فرمایا۔ میں نے کسی قسم کا انعام لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر میری زبانی وہاں کے حالات کو سُنا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فراریوں کے اور قیدیوں کے نام اور جائے سکونت نوٹ کر لئے۔ اور میرے بیانات کو قلمبند کر لیا۔ میں نے وقت کی تنگی کے لحاظ سے بالکل اختصار سے کام لیا۔ سردار صاحب نے مجھے بڑی تسکین دی۔ ٹھہرنے پر پھر اصرار کیا۔ اور آخر بڑی معذرت کے الفاظ پر دو سواروں کی حفاظت میں مجھے رخصت کیا۔

غروب سے پہلے میں برٹش کیمپ میں پہنچ گیا۔ کمشن کے حاکم اعلےٰ مسٹر ڈانلڈ کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ انہوں نے رسمی طور پر پھر میری سلامتی پر مجھے مبارک دی۔ لیکن ان کا لہجہ اور انداز سرد مہری کا تھا۔ میں نے رخصت چاہی۔ آپ نے اجازت دی۔ اور ایک سوار حفاظت کے لئے میرے ہمراہ جانے کا حکم دیا۔ ان کے پرسنل اسسٹنٹ صاحب نے میرے اخراجات

کے لئے کچھ عرض کیا۔ آپ اس وقت آرام کرسی پر تشریف فرما تھے آپ نے سر اوپر اٹھا کر ایک لمحہ کے تفکر کے بعد فرمایا کہ ہاں ہاں اسے دس روپے دیدو۔

آں جناب کے مراحم خسروانہ کے اس اعلان سے جو دکھ اسوقت میرے زخم خوردہ دل کو پہنچایا۔ اس کا اظہار الفاظ نہیں کر سکتے۔ آج ستائیس سال کے بعد بھی اس واقعہ کی یاد ویسا ہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر رنج دل کو پہنچاتی ہے اس میں شک نہیں کہ انگریز sentimental یعنی جذباتی قوم نہیں مسٹر ڈانلڈ اس وقت میری اس مصیبت سے دل میں متاثر ہوئے یا نہ! اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے لیکن ان کے ظاہرا سلوک اور عمل سے عیاں تھا کہ غریب رعایا کے ایک فرد کی مصیبت سے متاثر ہونے والے جذبات کی کمزوری سے ان کی پختہ کار فطرت بالاتر ہے۔ چنانچہ ایک ایسے مصیبت زدہ غلام پر جس نے محض اپنے فرائض منصبی کو وفاداری سے ادا کرنے کی پاداش اس طرح بھگتی ہو۔ گورنمنٹ عالیہ کی چند سنہری سکوں کو ضائع ہونے سے بال بال بچا لیا لیکن کیا انہوں نے سودا سستا کیا؟ اس کا جواب گورنمنٹ کے وہ اعلےٰ ترین اراکین جن کے ترازوئے فکر اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ کو عموماً تاجرانہ وزنوں سے تولنے کے عادی ہیں۔ خدا جانے کیا دیں۔ لیکن میری رائے ناقص میں راعی اور رعیت کا تعلق ہمدردی اور وفاداری کا ہوتا ہے۔ اگر راعی سے ہمدردی مفقود ہے تو رعیت سے وفاطلبی وہم باطل ہے ۱۹۱۰ء کا اوسط حکمران دماغ زیادہ تر اس نظریہ کا قائل تھا کہ ہندوستانیوں کو طاقت کے بل پر وفاداری کے راستہ پر چلایا جا سکتا ہے۔ اور ہمدردی جیسی نایاب قیمت پر ان کی جان نثاری

خرید نا قیمت کا ضائع کرنا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ایسے خیالات کے مالک افسروں کی ہمتوں کا ہی یہ نتیجہ ہے۔ کہ آج ہندوستان کی موت کی نیند سوئی ہوئی لاش میں حرکت سی نظر آرہی ہے۔ میرے واقعہ کی حیثیت گو ایک قطرہ کے برابر ہے۔ لیکن ؏

قطرہ قطرہ بہم شود دریا

یہی قطرات بہم مل مل کر آج ایک طوفان عظیم پیدا ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ پر ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ جب تک دلوں پر حکومت نہ ہو جسموں پر حکومت قائم رکھنا مشکل ہے۔ پس میری رائے میں مسٹر ڈانلڈ کا یہ سودا انہی سودوں میں شمار ہوتا ہے۔ جو سستے سمجھ کر کئے جاتے ہیں لیکن نتائج کے لحاظ سے بڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ مجھ سے اکثر برٹش اعلےٰ افسروں نے اس قصے کو سنا۔ وہ بھی جب اس حصے کو سنتے تو ان کی پیشانیوں پر بھی ناپسندیدگی کے بل نظر آنے لگتے۔

غرض میں نے صاحب موصوف کے عطیہ کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ میں اپنے سفر کے اخراجات کا خود بندوبست کر سکتا ہوں اس پر آں جناب نے اپنے عطیہ کو مضاعف کر کے مزید فیاضی کا ثبوت دیا میں نے پھر بھی بمصداق عطائے تو بہ لقائے تو لینے سے انکار کیا لیکن پرسنل اسسٹنٹ صاحب نے جن کو میری خودداری کی نسبت صاحب موصوف کی خوشنودی زیادہ مطلوب تھی مجھے لینے پر مجبور کیا۔ اور مجھے اس فیاضی سے متمتع ہونا ہی پڑا۔

غالباً ناظرین کا دماغ بھی مجھے افغان کیمپ میں بھیجے جانے کا مقصد یا اس کے جواز کی چیستان کو حل نہیں کر سکا ہوگا۔ اور سچ پوچھئے تو آج تک کوئی

جواب شافی میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ میری رہائی کی خبر سُن کر ہر دو گورنمنٹوں کے پولیٹیکل محکموں نے ایک متفقہ رپورٹ اس طرح مرتب کی ہو کہ ایں جانب نے میری رہائی کا مطالبہ بے حد زور شور سے کیا! اور آنجانب نے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے میری بیحد تلاش کی! اور آخر ایک نامعلوم گوشہ میں چند بے نام ونشان مفروروں کے پوشیدہ مسکنوں سے مجھے جا نکالا اور انہیں حکم دیا کہ اس غریب پر اتنا ظلم کیوں بپا کر رکھا ہے "جاؤ اسے جا کر پہاڑوں میں چھوڑ آؤ"۔ چنانچہ اس طرح میری رہائی واقع ہوئی! اور بمصداق "من ترا حاجی بگویم۔ تو مرا قاضی بگو"۔ دونوں محکموں کے عمال کی دستار فخر میں ایک طُرّۂ امتیاز اور بڑھ گیا۔ ناظرین اس کارروائی کو میرے تخیل کی ایک ناقابلِ قبول ایجاد سمجھتے ہوں گے۔ لیکن میری اس پرواز کی بنا ایک خط پر ہے۔ جو اس کمشن کے ذمہ دار افسر نے میری نسبت اپنے ایک عزیز کو لکھا۔ میں ناظرین کے تفننِ طبع کے لئے اسے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(ترجمہ از انگریزی)

کیمپ خرلاچی　　　　　　　　　　　　　وادئ کرم

میرے برادر عزیز ....

محمد اکرم کو قزاقوں نے پہاڑوں میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اور وہ علی زئی کرم میں آگیا ہے لیکن وہ راستہ میں بیمار ہو گیا تھا جب افغان سرداروں کے سپاہی قزاقوں کے ہاں گئے۔ تو انہوں نے سپاہیوں سے التجا کی کہ ذرا آپ انتظار کیجئے۔ تا کہ ہم اس کو پہاڑوں میں جا کر چھوڑ آئیں۔ میں نے افغان سردار کی خدمت میں خاص درخواست

محمد اکرم سب اور سیٹھ ٹوچی کے بارہ میں کی تھی۔ اور اس[1] نے فوراً سپاہی روانہ کر دئیے تھے۔ نیز میں نے مسٹر ڈانلڈ سے محکمانہ طور پر لکھنے کے لئے بھی درخواست کی تھی۔ اور میں نے آپ کو لکھا تھا کہ نتیجہ جلدی آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ اس کو بغیر کسی فدیہ لئے رہا کیا گیا ہے۔

کوئی اور خدمت؟

(آپ کا مخلص)

حیرت[2] ہے کہ ان صاحب نے میرے قیام کراچی کے دوران میں مجھ سے ذکر تک نہ کیا کہ میری رہائی انکی جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ حالانکہ میں کافی وقت ان کے پاس موجود رہا۔ اور میرے بیان سُن کر بھی انہوں نے میری غلط فہمی کو دُور نہ کیا کہ دراصل مجھے سپاہیوں کے حکم سے پہاڑوں میں لیجا کر اس طرح چھوڑ دیا گیا تھا جس طرح کوئی خدا ترس بنیا جنگل میں جا کر پنجرے کا مُنہ کھول کے چوہے کو بھگا دیتا ہے۔

ناظرین میرے تخیل کا مذاق اڑانے سے پہلے اس مضمون کو بغور مطالعہ فرمائیں۔ کسی مشفق کی عنایات کا شکریہ ادا نہ کرنا سخت کفرانِ نعمت ہے۔ اس معزز شخصیت نے میری رہائی کے لئے بے حد کوشش کی ہو گی۔ اگرچہ اسکا ماحصل میرے قتل کے احکام پر منتج ہوا لیکن کرم فرمائے موصوف کی ان نوازشات کا شکریہ کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے بھی میں اظہار حق پر مجبور ہوں میں اس

---

[1] ذرا اس تحریر کو صفحہ ۲۰۲ کے خط کے حقیقت افروز مضمون سے مقابلہ کر کے تفاوت کا اندازہ فرمائیے۔

[2] میرے پاس دو اور خطوط بھی اسی مضمون کے ہیں۔ جن کو بوجہ طوالت تحریر نہیں کیا جاتا۔

خطا پر کسی جارح کی تنقید بے سود سمجھتا ہوں۔ اس میں بیان کردہ واقعات کی لغویت خود نفس مضمون سے ہی آشکارا ہے۔ اور ناظرین کو مزید تفسیر کی ضرورت نہیں۔
اب اگر ایسی رپورٹ کا مرتب ہونا امکان رکھتا ہے تو پھر افغان کیمپ میں بھیجے جانے کا عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے یعنی "دیکھئے سردار صاحب آپ نے کیا رپورٹ کی تھی۔ اور یہ کم بخت کیا کہہ رہا ہے۔ ذرا آپ بھی لیجا کر اس سے اپنی تسلی کر لیں اور سوچیں"۔

بس یہی ایک حل ہے۔ جو میری ناقص سمجھ میں آسکتا ہے۔

میں اس موقع پر ناظرین کی ایک اور جستجویانہ خلش بھی دور کر دینا چاہتا ہوں یعنی گورنمنٹ نے مجھے کیا صلہ دیا۔ میں نے اپنے حقیقی نقصانات کی تفصیل میری رہائی کے متعلق جد و جہد کرنے میں ۱۶۰۰ کی زیر باری۔ اور مصیبتوں کے متعلق کچھ معاوضے کا مطالبہ کیا تھا لیکن گورنمنٹ نے اپنی فیاضی کا ثبوت مسٹر ڈانلڈ کی سخاوت سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر دیا۔ اور ایک طویل مدت کے بعد جواب آیا کہ گورنمنٹ تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔ میں ان دنوں اپنی مصیبت کے واقعات سے اسقدر متاثر ہو چکا تھا کہ دنیا کو ترک کر دینے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے مطالبہ پر دوبارہ زور دینے کی بجائے ملازمت سے استعفے دے دیا۔ اور ایسا بندوبست کیا۔ کہ استعفے منظور ہونے تک کسی کو میرے اس فعل کا علم تک نہ ہوا۔ جب منظور ہو گیا تو میرے والدین اور بھائیوں کو میرے فقیرانہ زندگی بسر کرنے کے ارادے کا علم ہوا۔ اور گھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن آخر جناب والدہ مکرمہ کے سُرخ اشکوں اور ناقابلِ دید اضطراب

کے سامنے مجھے پیپر ڈالتے ہی بنی۔ اور منظور شدہ استعفے میں نے واپس لیکر اپنی گردن کو آٹھ نو سال مزید ملازمت کے جوئے تلے رکھا۔

مجھے افسوس ہے کہ ہماری گورنمنٹ اپنی نسبت تنقید سُن کر صحیح طور پر متاثر ہونے کی بجائے ایسا رویہ اختیار کرتی ہے جس سے رعایا کے دل میں نظامِ حکومت کی اجنبیت کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ گورنمنٹ کا یہ ادّعا کہ وہ حقوق و حقائق کو پہچان کر مناسب اقدام پر خود آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور جدوجہد کو بے سود مجھتی ہے۔ کہاں تک درست ہے میں نے اپنے واقعات گورنمنٹ کے سامنے پیش کر دئے۔ مگر افسرانِ بالادست سے مل کر اپنے مطالبہ کو منوانے کے لئے کوئی کوشش نہ کی۔ اور کسی قسم کے خوشامدانہ یا کسی نامناسب ذریعہ کا استعمال گناہ مجھا۔ اس لئے مجھے ٹکا سا جواب مل گیا۔ ہاں اگر میں یہ سب کچھ کرتا۔ اور اپنے مطالبہ کے لئے لڑتا جھگڑتا۔ تو ضرور کامیاب ہوتا لیکن اس وقت میری قلبی کیفیت ایسی تھی کہ میں نے "بدر دِ سر نمے ارزد" کہہ کر چھوڑ دیا۔

قارئین کو میں پھر خرلاچی لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک سوار بطور بدرقہ مل گیا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ اگرچہ اس وقت کا سفر خالی از خطرہ نہ تھا لیکن میں روانہ ہو گیا۔ راستہ میں ایک نالا کے کنارہ پر دُور سے دو رائفلیں نظر آئیں جو وہیں چھپ گئیں۔ میں نے سوار کو چوکنا کیا۔ اس نے بھی رائفل میں کارتوس بھر لئے۔ اور ایڑی دے کر گھوڑے کو سرپٹ کر دیا۔ ان دو آدمیوں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا پاراچنار سے دو میل ادھر ہمیں خان محمد یوسف خان صاحب اور نائب حاکم اپر قرم چند

سواروں کے ساتھ جاتے ہوئے مل گئے۔ اور ہم اکٹھے خوش و خرم کافی رات گذرے پاراچنار پہنچے۔

دوسرے روز میں نے واپسی کی تیاری کی۔ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کا شکریہ ادا کرنا جنہوں نے علی زئی میں میرے ساتھ اتنا مہربانی کا سلوک کیا تھا میرا فرض تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے سارے حالات پوچھے میں نے نکشن کے حاکم اعلٰے کا نیم استفہامیہ فقرہ۔ کہ مجھے انہوں نے چھڑایا ہوگا۔ میرا انکار۔ سردار عبدالوہاب خان کا کیمپ۔ دس جمع دس روپے انعام سب کچھ بیان کئے۔ ان کے جوابات سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کے دل میں بھی وہی جذبات موجزن ہو رہے تھے۔ جو میرے دل میں۔ میں ان کے حسن سلوک اور گہری دلی ہمدردی سے بہت متاثر ہوا۔ جو دل گرفتگی مجھے خرلاچی پیدا ہوئی تھی۔ صاحب موصوف کی شیریں کلامی اور غمخواری نے گویا اسکی معذرت کر دی میرے سفر کے خرچ کیلئے انہوں نے کچھ مرحمت فرمایا۔ اور مجھے رخصت کیا۔

دوسرے روز میں پاراچنار سے بذریعہ تانگہ وطن کو روانہ ہو گیا۔ راستہ میں اُچت گاؤں ٹھہر کر مُلا صاحب کو ملا اور ان کا مقدور کے مطابق شکریہ ادا کیا۔ اور ٹل سے ریل پر سوار ہو کر کوہاٹ پہنچا۔ اس سے آگے کا حال جناب قبلہ گاہی نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔

۳۔ خونے کا انجام

بعض انسانوں خاصکر خونخوار درندوں کے شکاریوں کی زندگیوں میں ان

کے دلیرانہ اقدام کی وجہ سے چند ایسے Tense moments یعنی "پُرخطر لمحات" آجاتے ہیں جن کی یاد سے صرف انہی کے بدن پر رونگٹے کھڑے نہیں ہوجاتے بلکہ سُننے والوں پر بھی سر سے پاؤں تک کپکپی آجاتی ہے۔ ایسے لمحات میں ان کی حیات و ممات کا فوری فیصلہ ہونے والا ہوتا ہے۔ اور تاثرات کے لحاظ سے ان چند لحظوں کی طوالت برسوں کی مدت کے برابر ہوتی ہے۔

بھاگنے والی رات چند لمحات ہم پر بھی اسی نوعیت کے گذرے جو موت و حیات کے فیصلہ سے بھی کہیں زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ بلکہ موت انکے بد نتیجہ کے سامنے ایک مبارک واقعہ سمجھی جاتی۔ آج ستائیس سال کی مدت طویل کے بعد بھی ان لمحات کی یاد سے بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ خوست کی پہاڑیوں کے درمیان خونخوار قزاقوں کے مسکنوں میں دو قیدی ایک سنسان رات کی تاریکی میں بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت خاموشی سے اپنی زنجیریں ایک پاؤں سے کھول کر دوسری پنڈلی کے گرد لپیٹ لی ہیں۔ ایک قیدی چارپائی سے لٹک کر نیچے آتا ہے۔ اور دونوں قیدی نہایت احتیاط اور موت کی سی خاموشی کے ساتھ کروٹیں لیتے ہوئے روانہ ہونے لگتے ہیں۔ چاروں طرف موذیوں کی چارپائیاں بچھی ہیں۔ اور ہر طرف خونخوار کتے آزاد پھر رہے ہیں۔ یہ سارا منظر سامنے آکر میرا تخیل خون نے کو جگا دیتا ہے۔ وہ چارپائی سے دونوں قیدیوں کو پہلو بہ پہلو اس حالت میں دیکھ کر بجلی کی تیزی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ اور قیدیوں پر ہاتھ ڈال کر کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھتا ہے "بابو کہاں جاتا ہے؟" اس آواز کے ساتھ ہی ایلادار

اور دیگر فراری آن کی آن میں اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور ان دو قیدیوں کی زندگی کا ایک نیا اور آخری دور شروع ہو جاتا ہے۔ میرا تخیل ان تمام ایسی ایذاؤں عذابوں اور تکلیفوں کو ایک ایک کر کے ان موذیوں کے ہاتھوں ان قیدیوں پر گذارتا ہے۔ جن کی ایجاد ایک خونخواری اور قزاقی میں پلا ہوا دماغ نہایت انتقامانہ جوش میں کر سکتا ہے۔ مظلوم چاہتے ہیں۔ کہ کسی طرح ان کی زندگی کا یکلخت خاتمہ ہو جائے۔ اور موذی ان کی موت کو التوا میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ انتقام کی پیاس کو پوری طرح بجھا سکیں۔

غرض ان چند لمحات کا تصور جبکہ ہم دونوں زنجیریں کھولے پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتے ہوئے چلنے لگے تھے۔ میرے خون میں سنسنی پیدا کرتا ہے۔ اور میرے یہ جذبات آخری دم تک ایسے ہی رہیں گے۔ ان جذبات کے ساتھ ہی ایک خوشگوار سی یاد بھی وابستہ ہے جس کا سلسلہ اس لمحہ سے شروع ہوتا ہے۔ جب ہم بھاگ کر کیتونا لے کو عبور کر کے پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ میرا تخیل اس منظر کو اس طرح میرے سامنے پیش کرتا ہے۔ کہ خوتے نے حسب العادت نیم بیدار ہوا۔ اور نیم وا آنکھوں سے قیدیوں کی جگہ پر نظر ڈالی۔ قفس کو خالی دیکھ کر اس کے ہوش و حواس میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ چارپائی سے کود کر کھڑا ہو گیا۔ شور مچاتے ہوئے ایلادار کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ سارے گاؤں سے "قیدی بھاگ گئے" کی آوازیں آنے لگیں۔ لکڑیوں کی مشعلیں روشن کی گئیں۔ اور ہر ایک نے پہلے اپنے اپنے چھپر کا کونہ کونہ تلاش کیا۔ کہ شاید قاروں کا خزانہ اس کے اندر ہی مدفون ہو۔ شب بھر کی کارروائیوں سے

درگزر کر کے ہم صبح کے واقعات کو لیتے ہیں۔ مفروروں کی دستیابی سے ناامید ہو کر انہوں نے باقی قیدیوں کو جمع کیا۔ اور دل کھول کر ان پر ظلم توڑے۔ اور ان کی پیشانیوں[1] پر روپے سے غلامی کے داغ لگائے۔

وسیم گل اور مغلم غیر حاضر تھے۔ علاقہ میں ہماری رہائی کی خبر پھیل گئی۔ وہ دیوانہ وار گاؤں میں بھاگے ہوئے آئے۔ اور جب تک ہمارے سلامتی سے پہنچ جانے کی تصدیق نہ ہوئی وہ بھی دوسروں کے ہمراہ تلاش میں سرگرداں رہے آخر ہماری سلامتی کی خبر نے ان کی تگ و دو کا خاتمہ کیا۔ اور وہ ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر سوچنے لگے۔ کہ ہمارے بھاگنے کے امکان کس طرح پیدا ہوئے قدرتاً پہلا سوال یہ تھا کہ زنجیریں کس طرح کھولی گئیں۔ ان کا بغیر اوزار کھلنا محال تھا۔ وسیم گل نے اپنے چھپر سے زنبور کا ملنا بیان کیا۔ زنبور اٹرنگے کی تھی اٹرنگے نے خوتنے کی والدہ کا مانگ کر لے جانا بیان کیا۔ خوتنے نے اس کا منگوانا اقبال کیا۔ اور چیلی کی مرمت کا واقعہ بیان کیا۔ وسیم گل نے کہا "ہوں! تم اوزار قیدیوں کے سپرد کر کے چھپر میں اکیلا چھوڑ کر آپ آرام کو چلے گئے کیوں نہ ہو تم نے ضرور ہم سے دغابازی کی ہے۔ اور اپنا الو سیدھا کیا ہے۔ اگر یہ نہ بھی ہو تو بھی تمہاری غفلت اس درجہ کی ہے جو جان بوجھ کر چھوڑ دینے کے ہم پلہ ہے باقی رہا یہ سوال کہ ان کو قتل کر دینے کا حکم آیا تھا۔ سو یہ واقعہ ہماری غیر حاضری کا ہے۔ ہم دونوں شاید قیدیوں کو کسی اور جگہ منتقل کر دیتے۔ اور قتل پر راضی نہ ہوتے۔ بہرحال خوتنے! یہ ساری ذمہ واری تم پر عاید ہوتی ہے۔ تم کہاں کے

[1] یہ معلومات لالہ جی نے لکھی چند قیدی سے ہم پہنچائیں جو ہمارے بعد رہا ہوا۔

نواب تھے۔ کہ چیلیوں کو مرمت کرانے کے لئے اوزار مہیا کر کے خود سو نے چلے گئے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔"

گاؤں میں جرگے ہوئے۔ خوتے نے کے طرفداروں کی بھی وسیم گل کے دلائل کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ آخر وسیم گل منظم اور ان کے دو ایک ہمراز فراری علیحدہ سرگوشیوں میں مشغول ہوئے۔ انہوں نے نتیجہ یہی نکالا۔ کہ ہو نہ ہو خوتے نے ہمراہیوں سے دغا کی ہے۔ اور کم از کم اوزار کا مہیا کر کے اکیلے بیٹھنے کا موقع دینا ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔ وسیم گل اور منظم کی آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔ ان کی سب آرزوؤں کا خون ہو چکا تھا انہوں نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اور مشورہ پختہ ہو گیا۔

دو تین روز کا وقفہ ڈال کر ایک صبح منظم نے رائفل میں کارتوس بھر لئے اور غصہ سے آنکھیں لال کئے خوتے نے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ کہ "دوس! یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ رات کو تم نیک نامے پر بدنیت سے دست درازی کرنے لگے تھے؟" "میں ابھی تمہیں کیفرِ کردار کو پہنچاتا ہوں۔"

خوتے نے اس کی آنکھوں سے مطلب تاڑ گیا۔ رائفل کو حفاظت میں اٹھانے کا موقعہ نہیں تھا حیرانگی میں صفائی کے لئے منہ کھولنا چاہا۔ اور پیشتر اس کے کہ کوئی لفظ نکالے یا کوئی اس کی مدد کو پہنچے گولیاں اس کے دل اور سینہ کے پار تھیں۔ اس کی والدہ چلائی۔ اور اس کا بھائی رائفل سنبھالے ہوئے دوڑتا آیا۔ لیکن بندوبست کے مطابق دو فراریوں نے بڑھ کر بندوق اس سے چھین لی۔ اور کہا صبر کرو۔ ایک تو قتل ہو گیا۔ اب اس کا بدلہ لینے سے پہلے

ہمیں دریافتِ حال کر لینے دو۔ عملدار بے بس ہو گیا۔ اور اس طرح خونے کے قتل سے انتقام کے ایک ایسے پودے کی جڑ لگی جو مدتِ مدید تک اپنا ثمر قتل در قتل کے سلسلہ میں دیتا رہے گا۔

لالہ جی میراں شاہ میں ابھی رنگ رلیوں میں ہی مشغول تھے کہ لوانہ ملک خونے کے قتل ہو جانے کی خبر پولیٹیکل محکمہ کو پہنچانے کے لئے آیا۔ لالہ جی سے بھی ملا۔ اور ان کے دوست خونے کے انجام کا واقعہ انہیں سنایا۔

مجھے خونے کی والدہ اور بھائی سے بے حد ہمدردی ہے۔ اور اس جوان مرگ کے ایسے حسرتناک انجام پر میرا دل افسوس کے آنسو بہاتا ہے۔ ؎

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۴۔ قبلہ والد صاحب کے قلم سے

رُباعی

رنجے کہ رسد بہ بندہ محزوں گردد ۔۔۔ در محنت و درد دل پُر از خون گردد

گر لطفِ خدا نہ دستگیرش باشد ۔۔۔ کے کشتیٔ او ز ورطہ بیروں گردد

مَیں غلام غوث محمد اکرم کے والد نے اس مصیبت سے جو حصّہ لیا وہ بیان کرتا ہوں۔ میرے فرزند محمد اکرم کے گرفتار ہو جانے کی خبر مجھے ملک[1] عبدالرحیم ٹیلیگراف ڈیپارٹمنٹ نے بنوں سے ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کی فجر کو بذریعہ تار دی۔ یہ سعادت مند میرے ایک خالص دوست مولوی عبدالعزیز صاحب کے خلف الرشید

[1] خانصاحب ملک عبدالرحیم خان سب ڈویژنل افسر ٹیلیگراف صوبہ سرحد۔

ہیں۔ عام انسانی ہمدردی کے سوا ان کو میرے ساتھ خاص اخلاص ہے میں
یہ خبر سب سے پنہاں رکھکر تاروں کے ذریعے ان سے دریافت کرتا رہا کہ اس
میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اندیشہ تھا کہ اگر یہ خبر گھر والوں پر کھل گئی تو انکا برا حال
ہو جائے گا خصوصاً محمدؐ اکرم کی والدہ تو غش کر مر جائے گی۔ مگر یہ خبر پوشیدہ نہ رہ سکی
چرچا ہو کر میرے گھر میں بھی پہنچ گئی۔ پھر تو گھر کے چھوٹے بڑے کا یہ حال تھا جیسے
روئی کو آگ لگا دی گئی۔ جس رات محمدؐ اکرم کو گرفتاری کی حالت میں باغی قزاق سختی
کے ساتھ ہمراہ لے جا رہے تھے۔ رات کو مجھے بہت اضطراب لاحق ہوا۔ ایسا
کہ میں ذرا بھی ایک پہلو پر آرام نہیں کر سکتا تھا۔ اس بے چینی میں کبھی لیٹ جاتا
اور کبھی اٹھ بیٹھتا۔ اور کبھی باہر گلی میں نکل کر چلتا پھرتا۔ ہر چند سوچتا اس بیقراری کا
باعث معلوم نہ ہوتا۔ آخر خیال کر لیا کہ یہ کسی قریب آنے والی مصیبت کا پیش خیمہ
ہے۔ اور مجھے ابھی کسی سخت جان شکن تکلیف کا سامنا کرنا پڑیگا۔ چنانچہ ایسا ہی
ہوا۔ میری اس رات کی حالت گھر والوں کو بھی معلوم تھی۔ محمدؐ اکرم کے بڑے بھائی
محمدؐ صالح ایم۔ اے نے جو بہاولپور کے کالج میں پروفیسر تھے۔ یہ خبر سنکر مجھے
تار دیا۔ کہ میں بنوں جاتا ہوں۔ آپ بہاولپور آ جائیں۔ اور میرے گھر والوں کو لیجائیں
اور ایسا گھبرایا۔ کہ تار دیتے ہی براہ گوجرانوالہ بنوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور مجھے
بہاولپور جانے سے منع نہ کیا۔ میں بہاولپور پہنچ گیا اور وہ گوجرانوالے آ گیا۔ میں
نے بہاولپور سے اسی دن دوسری ریل میں گوجرانوالے واپس آکر محمدؐ صالح کو بنوں
روانہ کر دیا۔ یکم مئی سنہ ۱۹۱۰ء محمدؐ صالح بنوں کی طرف رخصت ہوا۔ اور وہاں اکثر احباب و

حُکام سے مل کر ہر طرح کی تدبیریں کرتا رہا۔ اور بیس دن کے بعد اپنی رخصت کے ختم ہو جانے کے باعث وہ مجبوری واپس آ گیا۔ پھر میں ۲۶ رصد رکو بنوں چلا گیا۔ جاتے وقت ضروری سمجھا کہ کچھ روپے ہمراہ لیجاؤں۔ میرے اس ارادہ کے ظاہر کرنے پر اقارب اور احباب اور پڑوسیوں نے خواہ وہ غریب ہی تھے۔ امداد کرنا واجب سمجھ کر جو کچھ کسی کے پاس موجود تھا۔ خواہ زیور یا نقد حسبِ استطاعت لا حاضر کیا۔ چنانچہ اُسی وقت ایک کافی رقم جمع ہو گئی۔ یہ رقم اور جو کچھ مجھ سے میسر ہو سکتا تھا۔ نوٹوں میں تبدیل کر کے ہمراہ لے گیا۔ میرا کوئی حقیقی بھائی اور بہن نہیں ہے مگر عوام کی محبت اور اخلاص اور جانفشانی نے میری یہ کسر پوری کر دی ہے۔ اس مقام پر میں خدا کی توفیق بخشی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے میری طرزِ عمل میں یہ تاثیر عنایت فرمائی۔ کہ اقارب چھوڑ اجانب بھی ہر طرح کی امداد پر دوڑ پڑے۔ شام کے قریب نئے بنوں پہنچ کر میں نہیں جانتا تھا کہ کس کے مکان پہ اتروں کیونکہ نہ میں کسی کا مکان جانتا تھا۔ اور نہ کسی سے واقف تھا۔ وہاں ایک بڑھئی جو ہمارے شہر کا باشندہ تھا۔ اتفاقاً مجھے مل گیا۔ اور میں اس کے ذریعے بابو غلام رسول صاحب سب اورسیئر کے مقام پہ جا پہنچا۔ شناختِ حال پہ بابو صاحب نے میری بڑی خاطر کی۔ ان کی مجلس میں پانچ چھ اور اصحاب بھی موجود تھے۔ جو اکثر ذی عزت اور عہدہ دار تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد سات آٹھ اور صاحب میرے ملنے کے لئے وہاں آ گئے۔ یہ سب اصحاب سرکاری ملازمت میں بڑے بڑے عہدہ دار تھے اور غائبانہ میرے دوست تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ایک کھلے صحن میں لے گئے جہاں ان کے گھر وہیں اردگرد تھے۔ اس صحن کو وہ اکثر فراغت کے اوقات میں

آراستہ رکھتے تھے۔ اور رات کو وہیں سوتے تھے۔ ان میں سے سید الہ داد شاہ صاحب اور سیٹھ کی بیٹھک میرے خاص رہنے کے لئے تجویز کی گئی۔ جہاں میری تمام ضروریات کا سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہ سید صاحب بڑے بامروت آدمی ہیں۔ اور انسانی ہمدردی ان میں کامل ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے میں تو اس وقت ایک مصیبت زدہ آدمی تھا۔ اور بالکل خاموشی کے عالم میں اپنی حالت میں مستغرق رہتا تھا۔ وہ اصحاب باری باری میری ضیافت کرتے۔ اور میری خاطر دس بارہ اور اصحاب کو بھی مدعو فرماتے اور بزم صحبت گرم کر کے ظرافت اور خوش طبعی سے میری دلجوئی کرتے۔ مگر ؎

سبجنجلے کہ بسنگِ قضا شکستندش
کجا بموم و سریشم درست میگردد

ان نیک دل اصحاب کا شکریہ مجھ پر فرض ہے۔ یہ سب میرے ہم وطن پنجابی بھائی تھے۔ میرے جانے سے دوسرے دن معز اللہ خان صاحب نے مجھے بُلا بھیجا۔ یہ صاحب قوم کے افغان پرانے بنوں کے رہنے والے رئیس ہیں بڑے بڑے عہدوں پر رہے ہیں۔ اور اس وقت پنشن پا چکے ہیں۔ کچھ عرصہ یہ گوجرانوالے میں رہے ہیں۔ مگر مجھ سے ان کی ظاہر جان پہچان نہ تھی میں ان کے پاس چلا گیا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے پیش آئے۔ اور یہ خواہش کی کہ میں انہی کے ہاں رہوں۔ میں نے بھی پسند کیا۔ کیونکہ ان کے رہنے سہنے کا مکان ایک باغیچہ نما احاطہ بنوں کے باہر تھا۔ جس میں نہریں جاری تھیں۔ اور خود ان کی طرز تمدن دیہاتیوں کی سی تھی۔ جس کو میری آزادی پسند طبیعت چاہتی تھی۔ اس کے سوا معز اللہ خان صاحب بڑی دستگاہ والے آدمی تھے۔ جن کی بہت رسائی کیا حکام

تک اور کیا اپنی قوم میں تھی۔ اور میری کام رسانی کے لئے یہ بہت موزوں شخص تھے۔ ساتھ ہی یہ خیال تھا۔ کہ نئے بنوں کے جن اصحاب نے غائبانہ دوستی اور ہمدردی کو ملحوظ رکھ کر ایسی مروت اور مہربانی کا سلوک کیا ہے۔ ان سے ایک ہی دفعہ جدائی کر لینی نامناسب ہے۔ خیر ایک ہفتہ یا ڈیڑھ نئے بنوں میں رہا پھر بھی میری اکثر بود و باش معز اللہ خاں صاحب کے پاس رہی۔ اور وہ محمد اکرم کی رہائی کے لئے ہر طرح کی تدبیریں کرتے رہے۔ تدابیر کی تفصیل لاطائل ہے۔ کیونکہ بعض تدبیروں میں کچھ کچھ راز بھی ہے۔ اتفاقاً سید الہ داد شاہ صاحب دو ماہ کی رخصت لیکر گھر چلے گئے۔ اور میں ایک ہفتہ کے بعد بالاستقلال معز اللہ خان صاحب کے پاس ہی جا رہا۔ یہ خان صاحب پانچ حقیقی بھائی ہیں۔ اور ان کی نجابت اور دور اندیشی کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ باوصف الگ الگ ماؤں کے پانچ بدن اور ایک جان ہیں۔ مہمان نوازی تو ان کا موروثی شیوہ ہے۔ معز اللہ خان صاحب نے میری مہم میں بڑی کوشش کی اپنی دانائی اور تجربہ کاری اور رسائی کے باعث ایسی ایسی تدابیر کا عمل کیا جن سے ان کی باخبری میرے ذہن نشین ہو گئی۔ مگر باوجود ان کوششوں اور تدابیر کے ابھی تک کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ ملک عبد الرحیم صاحب کے بدل جانے کے بعد ایک اور صاحب نوعمر جوان عثمان غنی بنوں میں تار ماسٹر ہو کر آئے۔ اس فرشتہ سیرت نے بھی میرے ساتھ بڑا سلوک کیا۔ خدا جزائے خیر دے۔ محمد اکرم کے چند خطوط میرے نام آئے۔ افسوس میرے احباب نے میری نظر سے گذرنے نہ دیئے۔ صرف دو ہی خط مجھے ملے جن کی نقل کتاب کے پہلے صفحوں پر آچکی ہے

بعض خط اخبارات میں درج ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔ نے بھی دو خط محمدؐ اکرم کو
ارسال کئے۔ مگر ایک خط اس کو ملا اور دوسرا خط اور ایک مصری کا کوزہ جو اس
کو رسل کیا تھا۔ واپس آگیا۔ کیونکہ ایزد تعالیٰ نے محمدؐ اکرم کو پہلے ہی رہا کر دیا تھا
اسی اثنا میں مَیں اکثر اصحاب ذی اقتدار با اختیار کی خدمت میں التجا لے گیا۔ مگر
کسی نے ہامی نہ بھری۔ اس وقت میں ایک برگشتہ بخت تھا۔ نہ کوئی تدبیر کارگر
ہوتی۔ اور نہ کوئی صاحب اقتدار اس میں کافی توجہ مبذول فرماتا۔ میرے روبرو ناکامی
کا ایسا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہ مقصد کی صورت نظر آنی غیر ممکن معلوم ہوتی تھی۔

میرا پہلا خط تو کسی پہلے باب میں درج ہو چکا ہے۔ دوسرا خط جو محمدؐ اکرم
کو نہ پہنچا اور واپس آگیا یہ ہے۔

دوسرا خط

لبِ خشک مظلوم را گو بخند
کہ دندانِ ظالم بخواہند کند

عزیزِ من! جس دن سے یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی پہلے محمد صالح اور اب میں بنوں میں
رہے۔ اور تمام جائز تدابیر کے عمل میں لانے میں دریغ نہیں ہوا روپے کو ناچیز سمجھا
مگر خدا کی مرضی ہے کہ ابھی تک ناکامی رہی۔ وجہ یہ ہے۔ کہ مطالبہ کا بوجھ ہماری ہمت
سے بہت بڑھ کر ہے۔ اور ابھی تک ہلکا نہیں ہوا۔ اگر اپنے آپ کو اور تمام احباب کو
بھی مفلس بنا دیا جائے تو بھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ تم خود کوشش کر کے دریافت
کرو کہ کہاں تک فیصلہ ہو سکتا ہے۔ مگر پکا وعدہ نہ کرو۔ اور خدا کی عنایت پر بھروسہ
رکھو جب تمہاری تکلیف کی مدت پوری ہو جائے گی خود بخود راستہ نکل آئیگا اور امید

ہے کہ جلدی سختی معاف ہو جائیگی تمہیں اس خط کے سوا ایک اور خط بھی ملیگا خطوط
کے کاغذ اور پنسل اس کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ اور اب ایک کوزہ مصری کا مرسل کرتا
ہوں۔ تمہاری والدہ اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا تو بھیج نہ سکتی تھی۔ تمہارے کھانے
کے لئے اس نے مصری ارسال کر دی ہے۔ اس کی اور میری یاد پر کھالو اور مصائب
پر صبر کرو۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ تمہارے صرف دو خط مجھے ملے پہلا مرقومہ ۲۰ اپریل
۱۹۱۰ء اور دوسرا مسطورہ ۱۷ مئی ۱۹۱۰ء ۲۶ صفر کو ملا میرے پیارے فرزند جو تکلیفیں
تمہارے جسم پر گذرتی ہیں۔ کیا ہم سب غفلت سے بھول گئے ہیں۔ ہرگز نہیں ہم ایک
جلتی آگ میں ہیں۔ مگر کیا علاج جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے جب تک بھوگ نہ لوگے
چھٹکارا نہ ہوگا۔ بہرحال صبر کرنا بہتر ہے۔ جو تدابیر تم نے اپنے خط میں لکھی تھیں کہ
اس اس آدمی کے ذریعے سے تم تدبیر کرو اور مجھ سے بھی ملو یہ تمام فضول معلوم ہوئیں اور
میں تم سے مل بھی نہیں سکتا۔ اور میرے ملنے سے تمہارا نقصان بھی بہت ہے۔ بہرحال تم
صرف اللہ پر بھروسہ رکھو وہی اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ ہے۔ جب چاہے گا رحم کریگا۔ والدعا
۳ جون ۱۹۱۰ء راقم مصائب زدہ غلام غوث خستہ دل تمہارا باپ، از بنوں۔

اگرچہ کامیابی کا راستہ ہر طرف سے مسدود نظر آتا۔ نہ کوئی تدبیر کارگر ہوتی تھی
اور نہ بارہ ہزار روپیہ دینے کی مجھے استطاعت تھی۔ جو قزاقوں کا مطالبہ تھا پھر
بھی میں دل سے ناامید نہ تھا۔ اور خدا کی مدد پر بڑا وثوق تھا اصل یہ ہے کہ خدائے
عزیز و رحیم سے مجھے ایک راز ہے کہ جب میں ہر قسم کی تدابیر و امداد سے ناامید
ہو کر اسی کے فضل کا بھروسہ کرتا ہوں تو وہ ضرور مجھے کامیاب کر دیتا ہے۔ اور
کامیابی بھی کیسی جس کا گمان بھی نہ ہو سو آخر ایسا ہی ہوا ۱۰ جون ۱۹۱۰ء چار بجے شام کے

قریب ہیں سنئے بنوں میں ایک دوست کے مکان پر اکیلا بیٹھا ہوا موجودہ ڈاک میں آئے ہوئے تین خطوط کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ تینوں خط مختلف مقامات سے میرے فرزندوں نے ارسال کئے تھے۔ ان تینوں[1] میں محمد اکرم کی تکالیف اور گھر کی تباہی اور مردمانِ خانہ کی آوارگی کی کیفیت درج تھی۔ یہ خط اپنے آگے رکھ کر دیکھ رہا تھا اور اپنے بختِ بد اور زمانے کی ناسازگاری پر رو رہا تھا اور مجھے سامنے نظر آتا تھا کہ قہرِ الٰہی کا سیلاب طوفان کی طرح اُمنڈتا آ رہا ہے۔ جو مال۔ جان۔ عزت جمعیت سب کچھ بہا لیجائیگا۔ کہ یکایک تار کا ایک چپڑاسی اندر آگیا۔ اور اس نے محمد اکرم کے رہا ہو کر بخیریت آجانیکی مبارکباد دی۔ اس غیر ممکن خبر کا ناگہانی مِل جانا اچنبا معلوم ہوا۔ اور میں نے تمسخر پر حمل کیا۔ اور چپڑاسی کو جو میرا پہلے سے واقف ہو گیا تھا ڈانٹا اس نے خدا کی قسم یاد کر کے کہا کہ میں جھوٹ نہیں کہتا ہوں۔ اور محمد اکرم کا تار میرے آگے ڈال دیا۔ اس انگریزی تار کے نیچے اُردو میں ترجمہ بھی لکھا ہوا تھا جو میرے دوست عثمان غنی میری سہولت کے لئے لکھ بھیجتے تھے تار کا مضمون یہ تھا کہ میں قید سے بھاگ کر بخیریت قصبہ علی زئی میں پہنچ گیا ہوں۔ اور آپ خوست جانے کا قصد نہ کریں۔ گرفتار ہو جائیں گے میرے خط سے جو بھیجتا ہوں مفصل حال معلوم ہو جائیگا۔ چاہیئے تھا کہ اس نوید کے ملنے سے مجھ میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو کر شادی مرگ ہو جاؤں مگر میں نے اپنے آپکو ضبط میں رکھا۔ اس واقعہ میں دو بڑے تغیر قابل عبرت ہیں۔ اور ان سے محض خدا کی قدرت ظاہر ہوتی ہے جسکے مقابل انسان ناچیز اور بے بس ہے۔ اوّل محمد اکرم کا ایک آن میں اس آزادی اور

---

[1] ان خطوط میں محمد اکرم کے اس خط کا مضمون تھا جو اس نے بنوں میں اپنے احباب کو لکھا تھا۔ اور اس کا حالِ زار جو اس خط میں تحریر تھا۔ ایک انگریزی اخبار میں شائع ہو کر میرے فرزندوں تک پہنچ گیا۔

عزّت کی زندگی سے گرفتاری کی ذلت میں پڑ جانا۔ ابھی تو فاخرہ لباس پہنے نوکری
کی حکومت میں ٹانگے پر سوار جا رہا ہے۔ ساتھ بستر ہے جیب میں روپے ہیں
اور ابھی نہایت ذلت کے ساتھ ٹانگے سے نیچے گرا کر ہاتھ پاؤں باندھ لئے گئے
ہیں۔ اسباب اور نقد لوٹ کر دشمنوں کے قبضے میں آچکا ہے۔ اور بے بسی کی
حالت میں خوست کی طرف جا رہا ہے۔ نہ کھانا کھایا ہے۔ نہ آرام کیا ہے بلکہ
بولنے کی اجازت نہیں یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ۔ دوم میرا اس ناامیدی اور
بدبختی کی حالت میں ہونا۔ اور پھر اچانک محمد اکرم کی رہائی کی خبر کا آجانا میں اسیوقت
سجدۂ شکر بجا لایا۔ اور چپراسی کو ہمراہ لیکر پورانہ بنوں میں معز اللہ خانصاحب کے
پاس چلا گیا۔ ہر دو بنوں میں دو میل کا فاصلہ ہے۔ اور میں نے یہی پسند کیا کہ
معز اللہ خان صاحب جو میری کامیابی میں تدبیریں کرتے رہے۔ انکی یہ حالت تصنع
کی نہ تھی۔ بلکہ ان کو سچے طور پر اہتمام تھا۔ اور محمد اکرم کا ان کو اتنا ہی رنج تھا جتنا مجھے
اور باوصف باوقار ہونے کے ان کو اس مصیبت کا اتنا احساس تھا کہ محمد اکرم کی
حالت یاد کر کے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ انکی بڑی کوشش تھی کہ
محمد اکرم رہا بھی ہو جاتے اور مالی نقصان بھی کم ہو۔ جب میں نے معز اللہ خانصاحب
کو جا کر یہ مژدہ سنایا۔ تو وہ خوشی میں بے اختیار ہو کر بیہوش ہو گئے۔ اور دیوانہ وار مجھے
اپنی آغوش میں اٹھا کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اس سچی ہمدردی پر خدا انکو جزائے خیر
دے۔ اس نمونہ کے آدمی اس قحط الرجال میں اب کم نظر آتے ہیں۔ غرض
معز اللہ خان صاحب نے بطور انعام چپراسی کی خدمت کی اور میں نے بھی۔ اور
اسیوقت معز اللہ خان صاحب مجھے اپنے ٹانگے پر سوار کر کے چھاونی کے تار گھر میں

چلے گئے۔ اور جہاں جہاں ضروری سمجھا اس نعمتِ غیر مترصدہ کے حصول کے تار دیئے اور پھر نئے بنوں میں جا کر تمام احباب کو یہ مژدہ سُنایا سب نے مبارکبادیں دیں۔ حتیٰ کہ اندر سے اکثر مستورات نے خوشی ظاہر کر کے مبینیں پہنچائیں۔ اَلحَمدُ لِلّٰہِ عَلیٰ کُلِّ حَالٍ۔ ان مصیبت کے ایام میں اکثر اقارب و احباب کے خطوط استخبار کے لئے آتے تھے اور مَیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں لکھتا تھا صرف ایک فہرست میں ان کے اسمائے گرامی لکھ دیتا تھا۔ دُوسرے دن صبح ہی وُہ فہرست آگے رکھ کر سب کو اس مژدہ کے خطوط لکھ دئے۔ تاکہ جیسے وہ میری مصیبت میں شریک رہے ہیں۔ اس خرمی میں بھی شامل ہو جائیں۔ اس موقع پر میں ارباب بصیرت و معنی بین کی ضیافتِ طبع کے لئے چند سطور لکھتا ہوں۔ گو ظاہر بین اس پر سے سرسری گذر جائیں۔ مجھے خدا پرست صاحب دلوں سے بڑی ارادت ہے خواہ وہ زندہ ہیں یا ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں اس بنا پر مَیں اکثر اولیاء اللہ کی درگاہ میں گرا رہا ہوں۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش صاحب کے مزار پر بیٹھ کر ان کی قبولیت اور تقرب کو ذریعہ قرار دیکر اپنی کامیابی کیلئے خدا کے آگے سربسجدہ ہو کر بڑے خشوع و خضوع سے دُعا کرتا رہا ہوں! اور نیز میر حسن شاہ صاحب کشمیری سید اندرابی قادری جو ہمارے خاندان کے پیر ہیں اس رُوح فرسا مصیبت کے وقت میں یہیں موجود تھے اس رنج میں دن رات بڑی زاری و نیاز سے جناب باری کے آگے سربسجدہ ہو کر کشائش کار کی التجائیں کرتے رہے۔ آنحضرت اس شغل میں ایسے محو اور بے خبر ہو گئے۔ کہ زندگی کی کسی ضرورت کا انہیں احساس نہ رہا تھا۔ آخر خدا اپنے مقبولوں کی دعائیں رد نہیں کرتا یہی باعث ہے کہ ہمیں بغیر اصابت

کسی تدبیر یا امداد کسی ذی اختیار یا نقصان مال کے یہ کامل کامیابی نصیب ہوئی

مردانِ خدا خدا نباشند

لیکن زخدا جدا نباشند

میں دُعا کرتا ہوں ایزد توانا میرے تمام احباب کو اسی عقیدہ کی توفیق دے

پُورانہ بنوں کے تمام یار آشناؤں نے بھی آکر میا کے دادا کی معزاللہ خان صاحب نے اپنے اُوپر لازم سمجھ کر ارادہ کر لیا کہ جب محمدؐ اکرم بنوں میں بخیریت پہنچ جائے تو ایک بڑا جلسہ کریں۔ اور راگ و رنگ کی محفل ترتیب دیں۔ مگر اسوقت اردگرد کے علاقہ میں لٹیروں کی غارت و شورش نے ایک بڑی بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ ایسی حالتمیں محمدؐ اکرم کا بنوں میں آنا میں نے نامناسب جانا۔ خاصکر ایسی صورت میں کہ محمدؐ اکرم قزاقوں کی قید سے بھاگ کر نکل آیا تھا۔ اور ان کی بارہ ہزار روپے کی رقم ماری گئی۔ اور انہوں نے اپنے ایک ساتھی خوشلے[1] نامی کو اس جُرم پر قتل کر ڈالا کہ محمدؐ اکرم اس کی حفاظت سے بھاگ گیا ہے۔ پس محمدؐ اکرم کی جان کا خطرہ معلوم ہوا۔ کہ مُبادا فرصت پا کر قزاق اس کو ہلاک کر دیں۔ میں نے ان سب اُمور کو سوچ کر معزاللہ خان صاحب سے استصواب کیا کہ محمدؐ اکرم بنوں میں نہ آئے۔ خانصاحب نے بھی میری اس رائے کو پسند کر کے اتفاق کیا۔ پھر ہر چند تمام لوگ خواہش کرتے رہے۔ کہ محمدؐ اکرم بنوں میں آئے۔ ہم سب اس بہادر کو دیکھ لیں۔ مگر معزاللہ خان صاحب اصل مطلب کو پنہاں رکھ کر معقول باتوں سے انکو جتاتے کہ محمدؐ اکرم کا کوہاٹ کے علاقے سے واپس ہو کر بنوں میں فی الحال آنا مناسب

---

[1] محمد اکرم کے چلے آنیکے بعد ایک اور قیدی فدیہ دیکر رہا ہوا۔ اور آکر اس نے بیان کیا کہ خوشلے کو دوسرے قزاقوں نے اس جرم پہ بندوق کا نشانہ بنا دیا کہ اس کی حفاظت سے محمد اکرم بھاگ گیا۔ اور اس میں اس کی غفلت پائی گئی۔

نہیں۔اپنی والدہ اور اقارب سے ملکر پھر آئیگا۔اس وقت میں نے اپنے دلمیں ٹھان
لیا تھا۔کہ محمد اکرم کو کبھی بنوں میں نہ آنے دونگا خواہ ملازمت سے اس کو استعفیٰ دینا
پڑے۔اسلیے میں نے اسکا تمام اسباب جو مختلف جگہوں میں پریشان پڑا تھا جمع
کیا۔اور جس کسی سے اسکا لین دین تھا سب چکا دیا۔اور اسکا تمام اسباب بوریوں
میں بند کر کے ایک ایجنسی کے ذریعے گوجرانوالے میں ارسال کر دیا۔اور خود
روانگی کیلئے تیار ہو بیٹھا۔محمد اکرم کے والد ہونیکے باعث مجھے اپنی جان کا بھی ڈر
تھا۔علی زئی جہاں پہنچ کر محمد اکرم نے مجھے تار دیا تھا۔ضلع کوہاٹ میں ہے۔وہاں
سے اور خرلاچی سے متواتر اسکے خطوط آتے رہے۔مگر میرا کوئی خط اس کو نہ پہنچ سکتا
تھا کیونکہ ان دنوں وہ ایک جگہ مقیم نہ رہا۔اسکے خطوط سے یہ معلوم ہو گیا کہ ۱۵ جون ۱۹۱۰ء
یا اسکے بعد وہ کوہاٹ سے بنوں واپس آئیگا۔اتفاقاً عزیز القدر محمد عالم بی۔اے[1] میرے
ایک عزیز بھائی کے فرزند کوہاٹ کے سکول میں سکنڈ ماسٹر تھے میں نے انکو لکھا کہ محمد اکرم
کے وہاں آنے کی خبر رکھیں۔اور جب وہ آئے مجھے تار دیدیں اور چونکہ محمد اکرم
قزاقوں کی قید سے بھاگ نکلا ہے ضرور ننگا اور بے سروسامان ہوگا۔اسکو جتنے روپوں
کی ضرورت ہو دیدیں۔اور کپڑے بھی بنوا دیں۔چنانچہ سولھویں جون ۱۹۱۰ء کو جب
محمد اکرم کوہاٹ پہنچا تو محمد عالم صاحب نے مجھے بذریعہ تار اطلاع دیدی میں نے تار دیکر اسکو
وہیں روک رکھا۔اور ایک مفصل خط لکھکر ہدایت کی۔کہ بعض وجوہ سے تمہارا ادھر آنا
مناسب نہیں تم وہیں ٹھہرے رہو میں خود وہاں آتا ہوں۔معز اللہ خان صاحب نے
محمد اکرم کے آنے پر جو جلسہ تجویز کر رکھا تھا۔اس کے نہ آنے کی صورت میں یہ جلسہ
میں نے اپنے اوپر لازم کر لیا۔اور اپنے مافی الضمیر سے معز اللہ خان صاحب کو مطلع کیا

۱؎ مولوی محمد عالم صاحب بی۔اے پرسنل اسسٹنٹ ڈی پی۔آئی صوبہ سرحد۔

ابتدا میں وہ مانع آئے لیکن انکو سمجھایا۔ کہ اب میں ان لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں اگر بلا ملاقات چلا جاؤں۔ تو ایک گونہ بیوفائی ہے۔ اور اگر سب احباب کیا افغان کیا پنجابی کی ملاقات کروں۔ تو دونوں بنوں میں ہر ایک صاحب کے ڈیرے پر جاکر رخصت لینا ہرج میں داخل ہے۔ اور یہ حرکت بھی سفاہت پر دلالت کرتی ہے اسلئے مناسب معلوم ہوا۔ کہ ایک جلسہ کر کے احباب کو مدعو کیا جائے۔ اور اسی جلسہ میں ان سے رخصت لیجاوے۔ اس امر کو عزاللہ خان صاحب نے بھی پسند کیا اور دعوت کا سامان تیار کر دیا۔ اور احباب کی اسی مجلس میں اپنا بنوں میں بیبر و سامان مصیبت کے حال میں وارد ہونا۔ اور احباب کا حسن سلوک اور اسوقت کامیابی کے ساتھ ان سے رخصت ہونا تقریر کر کے انکا شکریہ ادا کیا۔ اور سب سے مصافحہ اور معانقہ کر کے رخصت ہوا۔ اگرچہ اسوقت راستہ بہت خطرناک تھا پھر بھی توکلت علی اللہ لکھو نکاری ڈاک کے تانگے پر سوار ہو کر ۲۰ جون ۱۹۱۰ء کی صبح کو کوہاٹ جا پہنچا۔ اور محمد اکرم کو دیکھا ایک محض ہڈیوں کا جسم بے گوشت ہے۔ خون کا نشان نہیں پاؤں متورم اور مجروح ہیں۔ غرضکہ صرف رمق جان باقی ہے۔ اسکو گلے لگایا تو رقت پیدا ہو گئی۔ ریل کا وقت قریب تھا۔ تانگہ منگوا کر اسی وقت ریل کے سٹیشن پر چلے گئے۔ اور گیارہ بجے دن کے کیمبل پور اتر پڑے۔ محمد اکرم وہاں سے اپنے بھائی محمد صالح سے ملنے کیلئے بہاولپور چلا گیا۔ اور میں ایک دن کیمبل پور رہ کر ۲۱ جون ۱۹۱۰ء کی شام کو گھر آ گیا۔ شہر کے خاص و عام مبارکباد دینے کو آ گئے۔ اور گھر میں ایک خاص طرح کی خوشی پیدا ہو گئی۔ ہر ایک یہی کہتا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی عنایت سے محمد اکرم کو دوبارہ تمہارے گھر پیدا کیا ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد محمد اکرم بھی بہاولپور سے گھر آ گیا۔ اور شہر کے

احباب بلکہ عوام جوق جوق آنے لگے۔ اور محمدؐ اکرم کی کہانی سننے کے مشتاق ہوئے
چونکہ اس لمبی داستان کا بار بار سُنانا ہرج سے خالی نہ تھا۔ اسلئے احباب سے ایک
خاص تاریخ پر واقع سُنانے کا وعدہ کیا۔ تاریخ موعود پہ دوستوں کی ضیافت کا
سامان کر کے ان کو مدعو کیا۔ چنانچہ خاص الخاص احباب ڈیڑھ سو کے قریب جمع
ہو گئے کھانا کھلانیکے بعد محمدؐ اکرم نے مجلس میں اپنی درد آمیز کہانی اور مخلصی پانے
کی تدبیر سُنائی۔ سب احباب متاثر ہو گئے۔ اور اس کے صبر اور بہادری پر شاباش
اور تعجب کیا۔ اور اس موقع پر حسب استطاعت مساکین و مستحقین پر خیرات تقسیم
کی گئی۔ محمدؐ اکرم پاؤں کی جراحت کے باعث کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ دو ماہ کے بعد
اس قابل ہو گیا کہ اپنے پاؤں سے چلے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت ؛

واضح رہے کہ جب میں بنوں کی طرف روانہ ہوا تھا۔ تو اپنے جی میں مقرر کر لیا
تھا کہ اگر محمدؐ اکرم میرے ساتھ زندہ گھر آ گیا۔ تو میں بھی واپس آؤں گا۔ ورنہ میری گور
بھی کہیں اسی سرزمین میں ہو گی۔ اور یہ امر گھر والوں کو بھی جتا دیا۔ اور جاتے وقت
اپنی تمام کتابیں اور اسباب اچھی طرح ٹھکانے رکھ گیا تھا۔ کہ میرے وارثوں
کو اس کے لینے میں سہولت ہو۔ اور شہر پہ آخری نظر حسرت سے کر کے رخصت
ہوا تھا۔ شکر ہے خدا نے یہ دن بھی دکھایا۔ کہ میں جمعیت سے اپنے گھر اور شہر
والوں سے آ ملا ہوں۔ مگر ابھی تک اپنے آپ کو سنبھالتا ہوں۔ اور بار بار آنکھیں
ملتا ہوں۔ اور غور کر کے دل میں کہتا ہوں۔ ع

اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب
جان من از فیض جاناں ہست اکنوں کامیاب

(تحریر منود، محمد صالح خوشنویس لاہور)

رہائی سے ایک ماہ بعد

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

کتاب کو ختم کرنے سے پہلے میں ان "مذہبی دیوانوں" کے اخلاق کے چند ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن کے بغیر ان "رسوائے عالم" ڈاکوؤں کی تصویر نامکمل رہ جائے گی۔

مندرجہ ذیل سطور میں میں نے اپنے بہترین معلومات اور تجربہ کی بنا پر سرحدی پٹھان کے نقطۂ نظر کو واضح اور اس کے خیالات کی پوری ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی صاحب ان خیالات کو میرا ذاتی نظریہ تصور نہ فرمائیں میں تو صرف حقِ ترجمانی ادا کرنے کا قصوروار ہوں۔

سرحدِ آزاد کا پٹھان اپنے وطن کی آزادی کو جان و مال سے بھی زیادہ

عزیز رکھتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے اس کے سخت تریں دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔ دنیا میں جو طاقت اس عزیز تریں متاع کو اس سے چھیننا چاہتی ہے۔ وہ اس کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور نبرد آزما ہو کر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

اس کے ذاتی تجربہ اور اس کی ذہنیت نے "فرنگی"۔ ملازم فرنگی خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان۔ اور "مقبوضہ علاقہ کے ہندو" کو اپنی اس آزادی کا دشمن سمجھ رکھا ہے۔ اور اس لئے وہ ان تینوں کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اور انہیں نقصان پہنچانا اپنے لئے مذہباً و اخلاقاً جائز خیال کرتا ہے۔ اس اجمال کو مَیں ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرونگا۔ تاکہ اس "بے زبان" کا نظریہ صحیح طور پر ناظرین کے سامنے آجائے۔ کیونکہ بیرونی دنیا تک اپنے خیالات کو پہنچانے کے لئے کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں۔

آزاد پٹھان اپنے باپ دادا سے سنتا اور دیکھتا چلا آرہا ہے۔ کہ کس طرح انگریزی فتوحات کا سیلاب اس کے اردگرد کے علاقہ میں اس کے بھائی بندوں کی گردنوں میں طوقِ غلامی پہناتا چلا آرہا ہے۔ یہ سیلاب اس کے دروازے تک پہنچ چکا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ عنقریب اس کے متاعِ آزادی کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ وہ اپنے علاقہ کے اندر پختہ سڑکوں کے جال۔ توپوں اور مشین گنوں سے آراستہ قلعوں کی تعمیریں۔ رسل و رسائل کے مستحکم انتظامات کی موجودگی۔ ہوائی جہازوں کی پرواز ٹینکوں اور مسلح کاروں کی نقل و حرکت کو اپنے وطن کی آزادی کے جگر میں

گھُپا ہوا خنجر خیال کرتا ہے۔ اور اس خنجر کو نکال دینے کے لئے ہر وقت جدوجہد میں مشغول رہتا ہے۔

ارد گرد کے مقبوضہ علاقے کے حالات و واقعات کا وہ تاریخ کے صفحات کی طرح بنظرِ امعان مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ اور جو سبق اسے حاصل ہوتا ہے۔ وہی اسکی روزمرہ زندگی کے افعال۔ اور قومی بقاء کے لئے جدوجہد میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ ماہرین علم نفسیات[۱] خوب جانتے ہیں کہ غیر شعوری[۲] طور پر اس کی اپنی زندگی کے مقاصد کی تعیین اور اس کے قومی اخلاق کی تعمیر میں یہ واقعات کس درجہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

انگریزوں کو وہ باعزت دشمن سمجھتا ہے۔ کالے کوسوں کی مسافت سے آکر اتنی بڑی سلطنت کو ایسی خوش اسلوبی سے سنبھالے رکھنا اس کے دل کو انگریز کی عزت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ شہنشاہیت کی جوع الارض سے بھی ناواقف نہیں ہے۔ انگریزوں کے اپنی طاقت کے بل اس کے ملک کو فتح کرنے پر وہ ان کو معذور سمجھتا ہے۔ اور اپنی جان و مال سے اپنے وطن کی حفاظت کرنا وہ اپنا فرض جانتا ہے۔ لیکن سرکارِ انگلشیہ کے ہندوستانی ملازموں اور مقبوضہ علاقے کے ہندوؤں کو وہ نہایت حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے متعلق اس کا نظریہ ذیل کے حقائق اور واقعات سے غیر شعوری طور پر قائم ہوتا ہے۔ جو اس کے تحت الشعور[۳] پر اثر انداز ہوتے

[۱] Psychologist [۲] Unconsciously

[۳] Subconscious

ہیں۔

اپنے علاقے کے ہندوؤں کی جان ومال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور اس کے علاقے میں ہندوؤں کو مختلف اقوام میں آمد ورفت اور خرید وفروخت کی وہ آزادی حاصل ہے۔ جو کبھی اسے اپنے لئے خواب میں بھی میسر نہ آئی ہو۔ ہندو پر آنچ آنے سے پہلے وہ اپنی جان قربان[1] کر دے گا۔ اور یہ سب کچھ وہ باوجود اس علم کے کرتا ہے۔ کہ اس کے اپنے علاقہ کا ہندو ابن الوقت اور بے وفا ہے۔ وہ یہ کیونکر جانتا ہے؟ اس کا ذکر ابھی آگے آئے گا۔

آزاد پٹھان مقبوضہ علاقے کے اپنے بھائی بندوں کی محکومی پر ان سے بیحد ہمدردی رکھتا ہے۔ اگرچہ ان کو ع

پھر بھی ننگ زندگی آسودہ خواری رہا

دیکھ کر وہ ان کے اخلاق کی پستی۔ اور شجاعت کے تنزل پر کڑھتا ہے۔ اور ان کو محکومی پر مطمئن دیکھ کر ان کو حقیر سمجھتا ہے۔

---

[1] جیسا کہ کسی پہلے باب میں ذکر آچکا ہے۔ خوازے ایک خاص مقصد سے تلورام کے گرفتار کرنے کی جو ذلیل حرکت کر بیٹھا تھا۔ اس سے اس کی زندگی تلخ ہو رہی تھی۔ اور تو اور اس کی اپنی بیوی اس کو ایسے دلخراش طعنے دیتی تھی کہ وہ غیرت سے اپنی بیوی کو قتل کر دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ وہ اسے غیر مبہم الفاظ میں کہتی کہ تم نے تلورام کو گرفتار نہیں کیا۔ بلکہ اپنی بیوی کو دوسروں کے حوالے کر دیا ہوا ہے۔ اس طعنے پر خوازے نے کئی دفعہ اپنی بیوی کو گولی سے اڑا دینا چاہا۔ اس واقعہ سے ہی وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ پٹھانوں کے سلوک پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ایک اور امر ایسا ہے جس کی طرف سے خواہ کتنی چشم پوشی کر کے اس کا اعتراف نہ کیا جائے لیکن یہ حقیقت نفس الامری ہے کہ مقبوضہ علاقہ کا پٹھان اپنے دل کی گہرائیوں میں اپنے آزاد بھائی کے متاعِ آزادی پر فخر کرتا ہے۔ اور اس متاع کی حفاظت کے لئے اس کی جد وجہد سے گہری ہمدردی رکھتا ہے۔ اس کے عوض آزاد پٹھان بھی اپنے محکوم بھائی کی مجبوریوں کو جانتا ہوا دل میں یقین رکھتا ہے کہ گو عملی اظہار سے وہ معذور ہے لیکن اس کا محکوم بھائی اس سے سچی ہمدردی دل میں چھپائے ہوئے ہے۔ ع

دل را بدل رہیست دریں گنبد سپہر
از کینہ سوئے کینہ و از مہر سوئے مہر

لیکن اس مقبوضہ علاقے کے ہندوؤں کا حال وہ بالکل مختلف دیکھتا ہے۔ یہ ہندو بھائی دو فرقوں پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہاں کے اصلی باشندے جو کسی وقت اس علاقے میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو آج کل آزاد علاقے کے ہندوؤں کی ہے ان ہندو بھائیوں نے انگریزی قبضہ کے فوراً بعد سلطنت برطانیہ کی برکات سے متمتع ہونا شروع کر دیا تعلیم حاصل کی اعلےٰ ملازمتوں پر فائز ہوئے۔ تجارت کو فروغ دیا۔ اور نئی تہذیب کے ان سب لوازمات سے مستفید ہوئے۔ جو ہماری سرکارِ والا تبار کی فتوحات کے عقب میں سفر کرتے ہیں۔ ریل گاڑیاں پختہ سڑکیں ہسپتال۔ موٹر کاریں اور عیش و آرام کے سامان مہیا ہوئے۔ ان ہندو بھائیوں کی قومی اور پولیٹکل

بہبودی اسی میں مضمر ہے۔ کہ وہ سرحدی علاقہ میں سرکارِ انگلشیہ کا ساتھ دیں اور پٹھان کے دوبارہ غلبہ حاصل کرنے کے وہم باطل کے خلاف صدا بلند کریں۔ اور گورنمنٹ کی جارحانہ کارروائیوں میں عملی طور پر حصہ لیں۔ قدرتاً ان ہندوؤں کو آزاد سرحد کا مفتوح ہونا اپنی تجارت کے فروغ اور دیگر کئی پولیٹیکل لحاظ سے فائدہ مند معلوم ہوتا ہے۔ اور ان میں اکثر سرحدی پٹھان کی آزادی چھینے جانے پر بغلیں بجاتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔ آزاد پٹھان ہندوؤں کی اس ذہنیت کو ابن الوقتی اور بے وفائی پر محمول کرتا ہے۔ اور ہندوؤں کا گذشتہ تعلقات کو طاقِ نسیان پر رکھ کر پٹھانوں کی آزادی کا اس طرح دشمن بن جانا بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ اور وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے اپنے علاقہ کا ہندو بھی وقت بدلنے پر ویسا ہی ابن الوقت اور بے وفا ثابت ہوگا۔

دوسرا فرقہ ہندوؤں کا وہ ہے۔ جو تجارت اور جلبِ منفعت کی کشش سے ان علاقوں میں جا پہنچا ہے۔ اس فرقے کے مقتضیات تو اصلی باشندوں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر آزاد پٹھان کے لئے ضرررساں ہیں جو کسی تشریح کے محتاج نہیں۔

مزید برآں آزاد پٹھان دیکھتا ہے کہ اس کی آزادی سلب کرنے کے لئے جو جنگ ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر ہندو افواج ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ گویا مقبوضہ علاقہ کے ہندو کو وہ اپنی آزادی کے لئے ایک خطرناک حربہ سمجھتا ہے۔ اور اس کو جانی و مالی نقصان پہنچانا اپنا فرض خیال

کرتا ہے۔

ایسا ہی سرکاری ملازمین سے خواہ وہ ہندو ہوں خواہ مسلمان وہ بجید کینہ رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سرکارِ انگلشیہ جو تجاویز اس کو مفتوح کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کرتی ہے۔ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ مزدور بطور مہلک ہتھیاروں کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو صرف دنیاوی طمع کے لئے اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف اس کی محبوب ترین چیز اس سے چھیننے کے لئے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ ان کی جان کا بھی سخت ترین دشمن ہے اور مقبوضہ علاقہ کے ہندو اور سرکاری ملازمین کو وہ قریباً ایک ہی زمرہ میں شمار کرتا ہے۔

آزاد پٹھان اپنے علاقہ میں قوت لایموت حاصل کرنے سے قاصر ہے اور فطرتاً بہادر ہونے کی وجہ سے وہ کسی ایسے adventure یا پُرخطر مہم کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں اس کی بہادری کی آزمائش بھی ہو اور اسے خزانہ بھی مل جائے۔ عموماً ایک ہی مہم اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یعنی مقبوضہ علاقہ میں سر بکف جائے۔ اور کسی مالدار ساہوکار کا گھر بار لوٹ لائے۔ یا کسی متمول ہندو یا کسی سرکاری ملازم کو شکار کر لائے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو عمر عیش سے بسر کرے گا۔ اور اگر مارا گیا۔ تو شہید کہلائے گا۔

مندرجہ بالا تمام تصریحات کو زیر نظر رکھتے ہوئے خیال فرمائیے کہ جب یہ مذہبی دیوانہ شہادت کے نشہ میں سرشار۔ مال غنیمت کے حصول کی آرزو اپنے دامنِ آز میں سنبھالے گھر بار چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کو وداعی الوداع کہکر

اپنے گاؤں سے نکلتا ہے۔ تو اس کے دلی جذبات کیا ہوتے ہوں گے۔
اس کے وطن کے ملاؤں نے ایسی ڈاکہ زنی کے فعل کے لئے نہ صرف مذہبی جواز ہی پیش کر رکھا ہے۔ بلکہ اسے جہاد کا لقب دے کر اس کو اس کام پر ابھارا ہوا ہے۔ اس طرح وہ ڈاکہ کو ایک کارِ شنیع سمجھ کر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف عمل پیرا نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے کارِ ثواب جانکر کرتا ہے! اس لئے عام ڈاکوؤں اور چوروں کی ذہنیت سے اس کی قلبی کیفیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص اصول کے ماتحت سر بکف آتا ہے۔ اور ڈاکہ میں بھی خاص اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے انتقامی جذبہ پر ایک خاص حد تک ضبط رکھتا ہے۔ ہندوؤں کی جانب سے جو کینہ اس کے دل میں ہے۔ اس کی مفصل تشریح اوپر آ چکی ہے۔ اور اگرچہ عام طور پر معمولی سی بات پر قتل کر دینا اس کی عادت میں داخل ہے۔ لیکن پھر بھی جب وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مقبوضہ علاقہ کے کسی مقرر کردہ ہندو کے مکان پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ تو وہ سوائے سخت مجبوری کے انسانی خون سے اپنا ہاتھ رنگنے سے بڑی پرہیز کرتا ہے۔ وہ عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ عصمت پر حملہ نہیں کرتا۔ اور بطور یرغمال جب کسی کو پکڑ کر لے جانا چاہتا ہے تو جوان کو بوڑھے پر ترجیح دیتا ہے۔ اور عورت کو صرف اسی صورت میں لے جائے گا جب کسی ایسی ہی نوعیت کے واقع کا اس نے انتقام لینا ہو۔ غرض ڈاکہ زنی کے وقت اگر اس کا مقصد حاصل ہونے میں کوئی مزاحم نہ ہو۔ تو وہ بھی کسی سے تعرض نہیں کرتا۔

لیکن اس وقت ان تمہیدی تصریحات کے بعد جس خاص پہلو پر میں روشنی ڈالنا چاہتا ہوں وہ اس "مذہبی دیوانے" کی "مذہبی رواداری" ہے۔ جو ہم نے اس کی قید میں رہ کر دیکھی۔ جو ایذائیں اور عذاب وہ اپنے قیدیوں کو دیتے ہیں۔ ہمارے قصہ سے اس کا عشر عشیر بھی واضح نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم خاص حالات کی بنا پر جن کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ ان کی شفا کا نہ تو جہات سے محفوظ رہے۔ اور جب ہمارا دَوران "نوازشات" کا شروع ہونے لگا۔ تو اس قادرِ مطلق نے اس سے چند گھنٹے پہلے ہماری رہائی کا ساز و سامان کر دیا۔ ؎

کام تھے عشق میں بہت سے میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

لیکن ایامِ گرفتاری میں جو مذہبی آزادی قیدیوں کو انہوں نے دے رکھی تھی وہ ظاہراً ان کے خصائل و عادات سے بہت متضاد معلوم ہوتی ہے۔ میرے علاوہ اس گاؤں میں چھ دیگر قیدی تھے۔ جو سب کے سب ہندو تھے۔ فراریوں نے ان کو مذہبی رسوم کے مطابق عبادت کرنے کی پوری اجازت دی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے ان کے طریقۂ عبادت کی قولاً یا فعلاً کبھی تحقیر نہ کی۔ ان قیدیوں کی چوٹیاں، تھیں، جنؤ تھے کبھی کسی فراری نے استہزاءً ان کو چھوا تک نہیں۔ کبھی کوئی چیز خلافِ مذہب کھانے کو یا پینے کو نہیں دی نہ ہی کوئی ایسی چیز کھانے کو دی جسے وہ خود گندہ یا پلید سمجھتے ہوں۔
ناظرین کو یاد ہو گا کہ ہمارے ہمسایہ گاؤں کیٹلے میں ایک برہمن کو پکڑ لائے

تھے جس نے مسلمانوں کے ہاتھ کا پکا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کچھ دن چنے بھون کر چباتا رہا۔ اس کے گرفتار کنندوں میں سے جب گلاجان ہمارے ہاں مجھ سے خط لکھوانے کے لئے آیا۔ تو اس کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ متردد تھے۔ کہ کسی طرح اس برہمن کے حسبِ منشاء کھانے کا بندوبست ہو جائے۔ اگر وہ چاہتے تو زبردستی اسے سب کچھ کھلا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جب افغانستان کا ہندو وہاں پہنچا تو اس سے انہوں نے اس کے کھانے کا بندوبست کیا۔

ہمارے گاؤں کے ایک قیدی نے غالباً امتحاناً فراریوں پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن ان "مذہبی دیوانوں" نے اس کو صاف جواب دیا۔ کہ تمہارا یہاں مسلمان ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اگر تم ایسا ارادہ رکھتے ہو تو آزاد ہو کر اپنے وطن میں جا کر مسلمان ہونا۔

غرض ان کے طرزِ عمل سے کبھی یہ ممکن ہی معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ قیدیوں کی مذہبی توہین و تخفیف کر کے ان کی دل آزاری پر اتر آئیں گے یا انکا انتقام کبھی یہ رنگ بھی اختیار کر لے گا۔ کہ وہ کسی قیدی کا مذہب بگاڑنے یا تبدیل کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔

مَیں نے پوری کوشش کی ہے۔ کہ حالات کے بیان کرنے میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے دور رہوں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ مَیں کس حد تک اس میں کامیاب رہا۔ اپنی طرف سے تو مَیں نے اپنے "قاتلوں" سے بھی پورا انصاف کیا ہے۔ اور ان کی تصویر کو مکمل کرنے میں ان کے روشن پہلوؤں

کو تعصب کی تاریکی میں دبنے نہیں دیا۔ پھر بھی انسان خطاکار ہے۔ اگر دقیقہ رس ناظرین کو کوئی ایسی جھلک نظر آئے تو ان کی کرم گستری سے خطاپوشی کی توقع رکھتا ہوں ؎

تو نیز ار بدی بینی ام در سخن
بخلق جہاں آفریں کار کن

اکرم

پنجابی کے وہ اشعار جو لالہ سندر لال دردناک لہجہ میں وہاں گایا کرتے تھے۔

ل۔ لکھاں کروڑاں نی شاہ ویکھے
تے نہیں کوئی راہ مسافراں ادھار دیندا
اَگّے پھرنے جنہاں دے کوچ ڈیرے
نہیں انہاں دے تھاں کوئی اعتبار دیندا
بھور بلبلاں گلاں دے سنگ نی ناچ کردے
تے نہیں ریتیاں دے منہ تے کوئی پیار دیندا
گوہرا سبھے سلوک نی جیوندیاں دے
تے مویاں گیاں نوں سب کوئی وسار دیندا